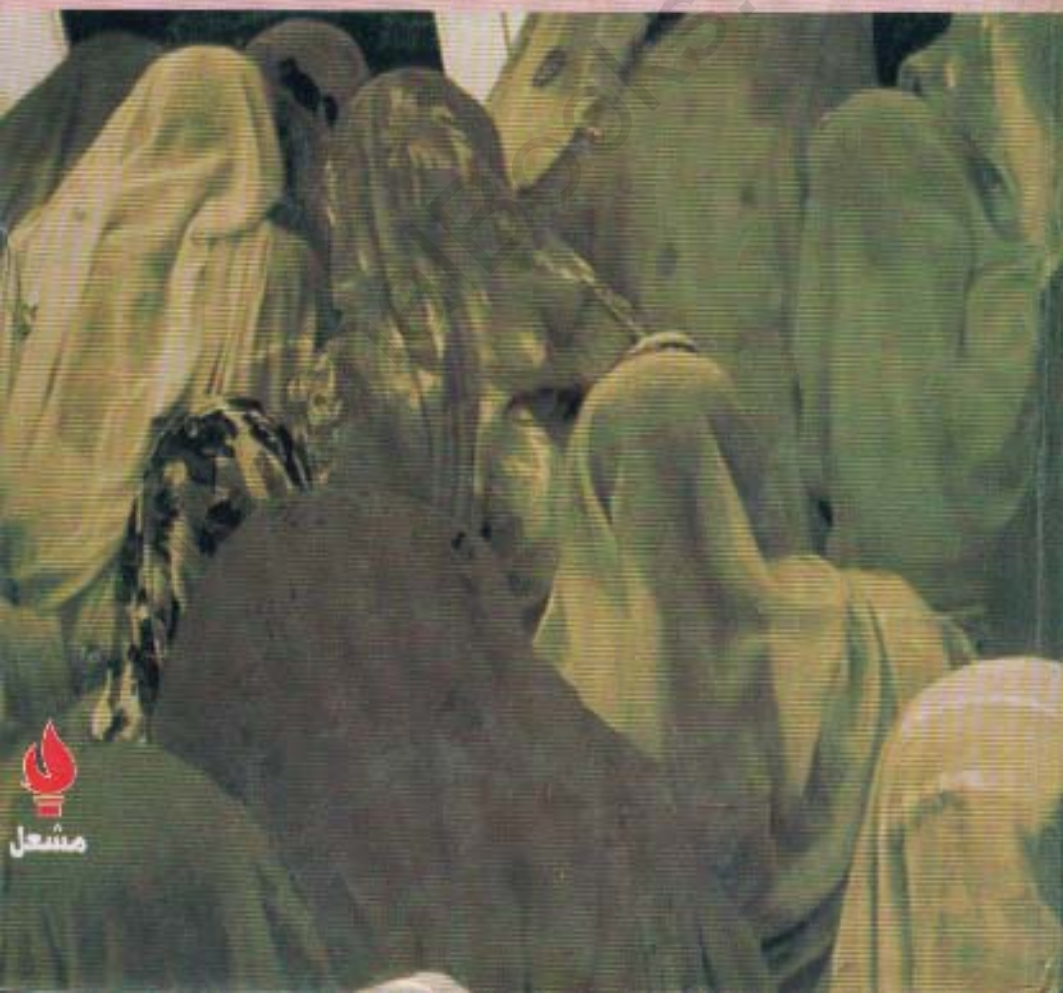
THE OTHER SIDE OF SILENCE

آوازیں جو سنائی نہیں دیتیں

آزادی کے وقت بچھڑ جانے والی عورتوں کی کہانیاں

اروشی بٹالیہ ترجمہ: محمد وسیم



مشعل

میری والدہ سوبھدرا
اور میرے والد جوگندر کی یاد میں!
جنھوں نے مجھے تقسیم کے بارے میں بہت کچھ سکھایا

میرے ماموں 'رانا ماما' کے نام
جن کا ایک ایک دِن عذاب میں گزرا

اور میری نانی دیاونتی، یا عائشہ، کے نام
جس کی زندگی اور موت کو تقسیم نے ایک نئی شکل دے دی

MashalBooks.com

MashalBooks.com

ترتیب

آغاز	7
خون	31
حقائق	69
عورتیں	107
غیرت	173
بچے	241
کم اہم لوگ	285
یادیں	329

MashalBooks.com

MashalBooks.com

1
آغاز

MashalBooks.com

MashalBooks.com

برصغیر کی سیاسی تقسیم تاریخ میں بڑے پیمانے پر انسانوں کی اکھاڑ پچھاڑ کا باعث بن گئی۔ اس سے پہلے کبھی اتنی بڑی تعداد میں لوگ ایسی تیزی سے اپنے گھروں اور ملکوں سے بے دخل نہیں ہوئے تھے۔ چند ماہ کے اندر تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ افراد نئے کٹے پھٹے بھارت اور نوزائدہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں کے درمیان آئے گئے۔ ان مہاجرین کے ایک بڑے حصے یعنی ایک کروڑ سے زائد افراد نے اس مغربی سرحد کو پار کیا جس نے تاریخی صوبہ پنجاب کو تقسیم کیا۔ مسلمان مغرب کی جانب پاکستان کو جا رہے تھے جب کہ ہندوؤں اور سکھوں نے مشرق میں بھارت کا رُخ کیا۔ قتل عام بعض اوقات ان قافلوں کے ساتھ ساتھ رہتا اور کبھی ان کے سفر میں تیزی کا باعث بن جاتا۔ کئی افراد بھوک اور وبائی امراض کا شکار ہو گئے، مرنے والوں کی تعداد (برطانوی اعداد و شمار کے مطابق) 2 لاکھ یا (بعد ازاں بھارتی اندازے کے مطابق) 20 لاکھ بتائی جاتی ہے۔ تاہم 10 لاکھ ہلاکتوں کو ایک بڑے طبقے میں تسلیم کیا جاتا ہے، اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، بڑی تعداد میں وحشت و بربریت کے مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ ایک اندازے کے مطابق مخالف مذہب سے تعلق رکھنے والی 75 ہزار عورتوں کو اغوا کر کے زیادتی کی گئی۔ (کچھ واقعات میں ہم مذہب خواتین بھی نشانہ بنیں) ہزاروں خاندان تقسیم ہوئے، گھر تباہ ہو گئے، فصلیں گلنے سڑنے کے لیے چھوڑنا پڑ گئیں، گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ بار بار انتباہ کے باوجود پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں کی نئی حکومتیں اس افراتفری سے نمٹنے کے لیے تیار نہ ہو سکیں۔ وہ اس بات کا اندازہ نہ لگا سکیں کہ جو سرحدیں کھینچی گئی ہیں ان کی بُنیاد مذہبی شناخت کی عددی گنتی پر رکھی گئی ہے۔ لاتعداد ہندو، لاتعداد مسلمانوں کے مقابلے پر تھے—— لوگوں کو ان مقامات کی طرف فرار ہونے پر مجبور کیا گیا جو اُن کے نزدیک ''محفوظ'' تھے، جہاں وہ اپنی قسم کے لوگوں کے گھیرے میں آ گئے۔ لوگوں نے بسوں، کاروں اور ٹرینوں میں

سفر کیا لیکن اکثریت پیدل ہی قافلوں کی صورت میں چلتی رہی، ان کا سفر درجنوں میل پر محیط تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان قافلوں میں سب سے بڑا قافلہ 4 لاکھ افراد پر مشتمل تھا۔ یہ مہاجرین مغربی پنجاب سے مشرق کی جانب بھارت کو سفر کر رہے تھے۔ اس عظیم قافلے کو کسی مقام سے گزرنے میں 8 دِن لگ جاتے۔

یہ تو تقسیم کی عمومی باتیں ہیں اور تاریخ کی کتابوں میں عوامی سطح پر موجود ہیں، لیکن خاص چھپے ہوئے واقعات کا کھوج لگانا مشکل کام ہے۔ ایسی باتیں ان ذاتی نوعیت کی داستانوں سے معلوم ہوتی ہیں جو بھارت اور پاکستان کے کئی گھرانوں میں سنائی جاتی ہیں۔ میں اپنی نسل کے کئی پنجابیوں کی طرح ان کہانیوں کے درمیان پلی بڑھی۔ میرا تعلق بھی تقسیم کے وقت شرنارتھی بننے والے ایک خاندان سے ہے۔ تقسیم کی یادیں، اس وقت کی وحشت اور بربریت پیچھے مڑ کر دیکھیں تو بسا اوقات ماضی ایک دیومالا سا لگتا ہے جب ہندو، مسلمان اور سکھ امن و بھائی چارے سے مل جل کر رہتے تھے۔ یہ کہانیاں بھی میرے ساتھ ساتھ ہیں، میرے ماں باپ لاہور سے آئے۔ وہ شہر جس سے اس کے باسی محبت کرتے اور اس کے بارے میں جذباتی ہوتے ہیں، جو پاکستانی سرحد کے محض 20 میل اندر واقع ہے۔ میری ماں اپنے دو مرتبہ کے خطرناک سفر کے بارے میں بتاتی ہے جب وہ لاہور سے اپنے چھوٹے بھائیوں اور بہن کو بھارت لے کر آئیں۔ میرے والد کو ابھی تک لاہور سے بھاگتے وقت گولوں اور بندوقوں کی آوازیں یاد ہیں۔ میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ یہ کہانیاں سنتی اور ہمیں بمشکل ان پر یقین آتا۔ ہم متوسط طبقے کے ہندوستانی تھے اور ہم نے سکون اور خوش حالی کے اس دَور میں پرورش پائی جب رواداری اور ''سیکولرازم'' معاشرے میں حاوی تھے۔ لوٹ مار، تشدد، جلاؤ گھیراؤ، زیادتی، قتل کی یہ داستانیں مختلف واقعات میں سامنے آئیں جن کی میرے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں تھی۔

پھر اکتوبر 1984ء میں وزیراعظم اندرا گاندھی کو ان کے اپنے محافظوں نے ہلاک کر دیا۔ دونوں سکھ تھے۔ اس واقعہ کے بعد اگلے کئی روز تک پورے ہندوستان میں انتقام اور تشدد کی وبا پھوٹ پڑی۔ بدمستی میں سکھوں پر حملے کیے گئے۔ کئی گھر جلا دیے گئے اور ہزاروں افراد مار ڈالے گئے۔ صرف دہلی کے مضافات میں 3 ہزار سکھ موت کا

شکار ہوئے۔ ان میں سے اکثر کو مٹی کا تیل چھڑک کر زندہ جلا دیا گیا۔ یہ لوگ نہایت ہَول ناک موت مرے۔ جلی ہوئی لاشوں کے نشانات زمین پر نمایاں تھے۔ اندرا گاندھی کے بیٹے راجیو گاندھی ملک کے نئے سربراہ بنے اور حکومت اس نئی صورت حال سے لاتعلق نظر آئی۔ تاہم کئی شہری تنظیمیں امدادی کاموں کے لیے آگے آئیں تاکہ متاثرین کو خوراک اور چھت فراہم کی جا سکے۔ میں بھی ان سینکڑوں امدادی کارکنوں میں شامل تھی۔ ہر روز ہم خوراک اور کمبل تقسیم کرتے، مرنے والوں اور لاپتہ افراد کی فہرستیں تیار کرتے اور تلافی کے کلیم بھرنے میں مدد فراہم کرتے۔ اس وقت ہم ان افراد کی کہانیاں بھی سنتے جو مصائب کا شکار ہوئے۔ اکثر معمر افراد جو 1947ء میں شرنارتھی کی حیثیت سے دہلی آئے، یاد کرتے کہ انھیں پہلے بھی ایسی ہی دہشت کی کیفیت سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ کہتے، ''ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہمارے ساتھ یہ سب کچھ اپنے ہی ملک میں ہو سکتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تقسیم ایک بار پھر ہوئی ہو۔''

دریائے جمنا کے اُس پار، جہاں میں رہتی تھی وہاں سے محض چند میل دور بالکل عام سے پُرامن لوگوں نے صرف اس لیے اپنے ہمسایوں کو گھروں سے نکالا اور قتل کر دیا کہ ان کا مذہب مختلف تھا۔ تقسیم کے وقت کی کہانیاں اب بہت دُور کی بات معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ ایک ہی ملک، ایک ہی قصبے، ایک ہی گاؤں کے لوگوں کو اب بھی مذہبی اختلاف کی سیاست کے لحاظ سے تقسیم کیا جا سکتا تھا اور ایک مرتبہ تقسیم ہو گئی تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ دہشت ناک سلوک کے واقعات تو رونما ہوں گے ہی۔ دو سال بعد برطانوی ٹیلی ویژن چینل کے لیے تقسیم ہند پر فلم کی تیاری کے دوران میں مَیں نے زندہ بچنے والے لوگوں سے کہانیاں جمع کرنا شروع کر دیں۔ ان میں سے بیشتر بہت ہَول ناک اور اسی نوعیت کی تھیں جو میں نے اپنے بچپن میں دوسرے یا تیسرے واسطے سے سنی تھیں۔ مجھے ان پر یقین نہیں آتا تھا۔ عورتوں نے زیادتی اور تبدیلی مذہب سے بچنے کے لیے کنویں میں کود کر جانیں دے دیں۔ باپ نے اپنے ہاتھ سے بچوں کا سر قلم کر دیا تاکہ انھیں ایسے کسی رُسوا کن انجام سے بچایا جا سکے۔ اب میں عینی شاہدوں سے خود تلخیوں، انتقام اور نفرت کی تفصیل سن رہی تھی ـــــ جیسے جیسے یہ تفصیلات سامنے آئیں انہوں نے مجھے خوف زَدہ کر دیا ـــــ وہ بالکل سچ کہہ رہے تھے۔

ان کہانیوں نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا۔ جہاں تک میں جانتی تھے میرے اپنے خاندان کے ساتھ اتنا ظلم اور خون ریز برتاؤ نہیں ہوا تھا۔ لیکن میں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ تقسیم، حتیٰ کہ میرے خاندان میں ـــــ تاریخ کا ایک بند باب ـــــ جس کے بے رحم سیاسی حالات نے ہم سب کو رُلا دیا، ہم سب کو اب تک تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ تقسیم روزمرہ کی زندگی میں بھی نظر آتی، جیسے ان کے تضادات تھے۔ بارہا میں نے اپنے والدین اور دادی کو لاہور میں اپنے مسلمان دوستوں کا ذکر بڑی محبت اور چاہت سے کرتے سنا اور کتنی ہی مرتبہ میں نے ''ان مسلمانوں'' کے بارے میں ان کی غیر منطقی رائے سنی۔ نہ جانے کتنی بار میں نے اپنی ماں کو اپنے بے وفا بھائی کے بارے میں باتیں کرتے سنا جس نے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کی تھی ـــــ 1984ء میں یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ تقسیم ہماری زندگی میں کس حد تک موجود ہے۔ اس کا ادراک ہوتے ہی یہ ممکن نہ رہا کہ میں ان چیزوں کو واپس تاریخ کی کتابوں کے اندر رکھ دوں۔ میں زیادہ دیر اس دھوکے میں نہ رہی کہ یہ کسی اور کے لیے بھی ایک مختلف دَور سے متعلق تاریخ ہے۔

میں نے ایک محقق کی طرح اپنے کام کا آغاز تقسیم پر لکھی ہوئی کتابوں کا جائزہ لینے سے کیا۔ وہاں مجھے مواد کی کوئی کمی تو نظر نہ آئی، لیکن انھیں پڑھنے کے بعد میری تسلی نہ ہوئی بلکہ کئی جگہ تو مجھے غصہ آ گیا۔ اگر میں پڑھی جانے والی کتابوں پر یقین کر لوں تو پھر تقسیم ہند بس وہی کچھ ہے جو اگست 1947ء کو وقوع پذیر ہوا۔ ان تفصیلات میں نمایاں باتیں صرف یہ تھیں: کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان خلیج میں پھیلاؤ، جناح اور گاندھی، نہرو، پٹیل کے درمیان مباحثے، اسی طرح سیاسی محاذ پر دیگر پیش رَفت، اس کے علاوہ واقعات کا ایک تسلسل اور پھر تشدد، وسیع پیمانے پر ہجرت، پناہ گزینی اور مہاجرین کی بحالی کے کام ـــــ یعنی تقسیم کی ''تاریخ'' صرف سیاسی واقعات میں نظر آئی اور انہی کو فوقیت دی گئی تھی۔ دیگر پہلوؤں ـــــ یعنی ان لاکھوں افراد کے ساتھ کیا بیتی جنھیں اس دَور میں جینا پڑا، جسے ہم اس تاریخ کا ''انسانی پہلو'' کہہ سکتے ہیں ـــــ کسی نہ کسی وجہ سے اس کی حیثیت کم درجے کی نظر آتی ہے۔ شاید یہ اس لیے ہوا کہ ان لوگوں کو ذرا مختلف اور مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ خسارہ اور شراکت، دوستی اور دُشمنی اور خوشی اور ایک تکلیف دہ احساس کے ساتھ گھر، ملک، دوستوں کے کھو جانے کی حسرت ناک

یادیں ـــــ ان کے ساتھ ساتھ ان تمام پہلوؤں کو از سرِ نو زندہ کرنے کی شدید خواہش۔ مجھے اب ان مشکل چیزوں کو اصل حقیقت کے مطابق پیش کرنا تھا۔

اس طرح یہ سوال اُٹھا کہ کیا ان کے لیے تاریخ میں کوئی جگہ نہیں؟ اگر نہیں تو پھر آخر یہ یادیں انفرادی اور اجتماعی یادوں میں پوری آب و تاب کے ساتھ کیوں زندہ رہیں؟

میں نے جائزہ لیا کہ اس تاریخ کے بڑے سیاسی حقائق کیا کام کرتے ہیں۔ اگر میں ان کا مطالعہ ٹھیک کر رہی ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ تقسیم کا عمل مکمل ہو چکا ہے اور یہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن گیا ہے۔ لیکن ہم سب کے ارد گرد ایک مختلف حقیقت بھی ہے۔ ہر جانب تقسیم ہی تقسیم، گروہی کشیدگی، مذہبی بُنیاد پرستی اور مذہب کی بُنیاد پر جاری اختلافات۔ دہلی میں 1984ء کے دروان میں سکھوں کو نسلی فسادات کا نشانہ بنایا گیا۔ 1989ء میں بہار کے شہر بھاگل پور میں بدترین بلوؤں کے دوران میں ہزاروں مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے چند برس بعد ایودھیا میں وحشی ہندوؤں نے بابری مسجد کو تباہ کر دیا۔ (ان لوگوں کی بھارتیہ جنتا پارٹی، راشٹریہ سیوک سنگھ، ویشوا ہندو پریشد اور شیو سینا جیسی سیاسی جماعتوں نے کھلے عام پُشت پناہی کی) اس کے بعد سورت، احمد آباد، گجرات اور ممبئی میں ایک بار پھر ہزاروں مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ تقسیم کے متعلق داستانوں اور یادوں کو جارحیت پسندوں نے اپنے من چاہے انداز میں بیان کیا۔ ان بلوؤں میں جنگ جُو ہندوؤں کو اس جانب دارانہ (یک طرفہ) دلیل کے ساتھ متحرک کیا گیا کہ مسلمانوں نے تقسیم کے وقت ہندوؤں کا قتل عام کیا تھا۔ انہوں نے ہندو عورتوں کی عصمت دَری کی تھی، لہٰذا اس کے جواب میں اب انھیں ضرور ہلاک کر دینا چاہیے اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کرنا چاہیے۔ یہی نمونے انفرادی زندگی میں بھی نظر آتے ہیں۔ آزاد بھارت کے اندر ایک مسلمان اور ہندو آسانی سے ایک دوسرے سے شادی نہیں کر سکتا۔ انھیں خوف ہوتا ہے کہ ان دونوں کو یا کسی ایک کو دونوں کے خاندانوں یا برادری کے قہر کا نشانہ بننا پڑے گا۔ اگر اس قسم کی شادی کسی بنا پر ناکام ہو جائے یا عدالت میں اس کے خلاف فیصلہ آ جائے تو آپ کو یقین ہو جائے گا کہ اس کے ساتھ عوامی سطح پر متعصب اعلانات بھی سامنے آئیں گے۔ گزشتہ عدالتی فیصلوں کی

مثالیں دی جائیں گی اور ان عناصر کے بارے میں تبصرے ہوں گے جنھوں نے دوقومی نظریہ قبول کیا یا اسے مسترد کر دیا تھا۔

اس تمام صورت حال میں اس بات پر زور کم نظر آتا ہے کہ تقسیم کے باب کو اتنی آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے گہرے، شخصی معانی، اس کے ٹوٹ پھوٹ پر مبنی اثرات، یا اختلافات جو اُبھر آئے یا مضبوط ہوئے یہ سب کئی لوگوں کی زندگی میں ابھی تک موجود ہیں۔ میں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ برصغیر کی تقسیم یقینی طور پر ایک سیاسی تقسیم یا جائداد اور اثاثوں کی تقسیم سے بڑھ کر کوئی چیز ہے۔ اس حوالے سے تفصیلات بتانے والے مسلسل ایک فقرہ دُہراتے ہیں اور وہ ہے ''دِلوں کی تقسیم'' جس نے اَن کہے مصائب، المیوں، سانحوں، اور ان برادریوں کے درمیان نفرت اور تشدد کو جنم دیا، جو اس وقت تک ایک اَن لکھے سماجی معاہدے کے تحت اکٹھے رہ رہے تھے۔ اس نے خاندانوں کو من مانی سرحدوں سے تقسیم کیا۔ یہ لکیریں بسا اوقات راتوں رات کھینچ دی گئی تھیں۔ اور اس کے بعد لوگوں کے لیے عملی طور پر یہ جاننا ناممکن ہو گیا کہ آیا ان کے والدین، بہنیں، بھائی یا بچے زندہ ہیں یا پھر مر کھپ گئے ہیں۔ ایک ماں اور بیٹی نے جو تقسیم کے وقت فسادات کے دوران میں بچھڑ گئی تھیں، پچاس سال بعد ایک جریدے میں شائع ہونے والی تصاویر میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ رسالے میں بھارت کی آزادی کے پچاس برس مکمل ہونے پر تقسیم کی کہانیوں پر رپورٹ شائع کی گئی تھی اور رپورٹر اور فوٹوگرافر نے تقسیم شدہ خاندانوں سے رابطہ کیا تھا۔ اسی رسالے کی وجہ سے بھائی بہن پچاس سال بعد سرحد پر ملاقات کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک پاکستانی باپ نے جس کی 13 سالہ بیٹی کو ہندوؤں نے اغوا کر لیا تھا، اپنی بیٹی کی تلاش کے لیے ہندوستان کا کئی مرتبہ چکر لگایا۔ انہی دوروں میں ایک بار پولیس نے اسے جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ اس کی بیٹی اسے کبھی نہ مل سکی۔

☆☆☆

تقسیم ہند پر لکھی گئی تاریخ میں ان پہلوؤں ـــــ خاندان کیسے تقسیم ہوئے، سرحد کے آر پار دوستیاں کیسے پنپتی رہیں، لوگ حادثوں اور سانحوں سے کیسے نبرد آزما ہوئے، انہوں نے اپنی زندگیاں دوبارہ کیسے بنائیں، جسمانی اور ذہنی وسائل دوبارہ کس

MashalBooks.com

طرح مجتمع کیے، گھر بار چھوڑنے کے صدمے اور حادثے نے ان کی زندگیوں، بلکہ حقیقت میں ان کے شہروں، قصبوں اور دیہات کو دوبارہ کیسے تشکیل دیا؟ــــ کا بہت تھوڑا عکس نظر آتا ہے۔ پھر 1984ء کے بعد میں نے تیزی سے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ ان پہلوؤں کا تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات میں شامل ہونا ضروری ہے۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ میں لکھنے کے لیے کن لوازمات کا سہارا لوں؟ وہ کون سے ''ذرائع'' ہو سکتے ہیں جن سے میں رجوع کروں؟ قتل عام کی یادداشتوں اور شہادتوں پر لکھتے ہوئے جیمز ینگ نے یہ سوال اُٹھایا کہ ہم مختلف واسطوں سے ملنے والی معلومات کے سوا قتل عام کو کس طرح جان سکتے ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ ''جتنا ہمیں علم ہے ہم جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام کو اس کے ادبی، تاریخی اور سیاسی حوالوں سے جانتے ہیں، ہم اسے اس کے ذاتی اور شہادتی پہلوؤں سے بھی جانتے ہیں، کیوں کہ کسی واقعے کے ''حقائق'' ہی اہم نہیں ہوتے بلکہ یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہے کہ لوگ ان حقائق کو کس طرح یاد رکھتے ہیں اور انھیں پیش کرتے ہیں۔''[1] جیمز ینگ کے اس سوال کا دائرہ ہم تقسیم ہند تک بڑھا سکتے ہیں۔ وہ یہ کہ ہم ان واقعات کو افسانوی ناولوں، یادداشتوں، شہادتوں اور انفرادی یا اجتماعی یادوں کے واسطے سے ملنے والی تفصیلات اور ان واقعات نے جو تاریخ بنائی ہے اس کے سوا اور کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟ شاید ہندوستان کی جدید تاریخ میں تقسیم کا باب دیگر واقعات سے زیادہ خاندانی تاریخ، بالخصوص شمالی بھارت کے خاندانوں میں زیادہ موجود ہے جہاں اجتماعی اور انفرادی طور پر دہشت و بربریت، دوستی اور دُشمنی کی داستانیں سنائی جاتی ہیں۔ جب ایک مہاجر پنجابی دوسرے مہاجر پنجابی سے ملتا ہے تو فوری طور پر ''تقسیم کے وقت'' کی کہانیوں کا تبادلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یا ایک بھارتی شرنارتھی کسی پاکستانی مہاجر سے ملتے ہوئے اسی نوعیت کی کہانیاں چھیڑ دیتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی یادوں پر مبنی یہی قصے، خاندانی اور تاریخی اعتبار سے تقسیم کی حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں اور یہی کہانیاں تاریخ کے اس حصے پر روشنی ڈالتی ہیں جسے ہم ''چھپا ہوا'' حصہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہی راستے ہیں جن کے توسط

1: جیمز ای ینگ: Writing and Rewriting the Holocaust, Nararative and the Consequences of Intepretation: Bloominghn

سے ہم اس واقعے کو سمجھ سکتے ہیں۔ کئی اعتبار سے ان واقعات کی اصل تاریخ یہی ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اسی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس فیصلے میں بذاتِ خود کئی مشکلات بھی ہیں۔ تاریخ پر کام کرنا اتنا سادہ اور مشکلات سے پاک کام نہیں ہوتا۔ مجھے اس طریقے میں درپیش مشکلات کا پوری طرح اندازہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی یاد ہمیشہ ''خالص'' یا ''واسطے'' کے بغیر نہیں ہوتی۔ اس کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کون، کب کس کے ساتھ، کیوں اور کسے یاد کرتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک لوگ کوئی واقعہ یا تاریخ یاد کرنے کا جو راستہ اختیار کرتے ہیں وہ اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا تاریخ کے ''حقائق'' اہم ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ بہرحال یہ بھی اتنے واضح اور مصدقہ نہیں ہوتے۔ ان کی تشریح و تعبیر بھی دوسرے لوگوں کی یادوں کے حساب سے مختلف ہو سکتی ہے۔ آپ مجھے اس کی وضاحت ایک مثال سے کرنے دیجیے۔ مجھے اپنے کام کے آغاز پر جس بات کا سب سے زیادہ سامنا کرنا پڑا وہ لوگوں کی طرف سے ابتدا میں کچھ بولنے میں جھجک تھی۔ ان کا سوال ہوتا کہ بھولی بسری یادوں کو پھر سے کریدنے کا آخر کیا فائدہ؟ ہر مرتبہ مجھ سے یہی سوال کیا جاتا۔ ایک سوال میرے دماغ میں بھی اٹھتا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی کہ آخر لوگ اس دَور کو یاد کرنے میں ہچکچاہٹ کیوں محسوس کرتے ہیں؟ یقیناً یہ ہچکچاہٹ بذاتِ خود کسی بات کا اشارہ کرتی ہے۔ کیا اس کا تعلق واقعات کی اس خوف ناک نوعیت سے ہے جو تاریخ کی کتابوں میں اعداد و شمار اور تعداد میں کانٹ چھانٹ کر درج کیے گئے ہیں، یا پھر ان کا بعض صورتوں میں اس تاریخ میں لوگوں کی اپنی ذہنی اُلجھن سے تعلق ہے؟ تقسیم کے وقت کوئی ''اچھے'' یا ''بُرے'' لوگ نہیں تھے۔ عملاً ہر خاندان فسادات کے دوران میں متاثر اور جارح دونوں شکلوں میں نظر آتا ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کیوں لوگ سرِ عام ان واقعات کو یاد کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ماسوائے ان خاندانوں کی اندرونی سطح پر جہاں اس تاریخ کے بدنما حصوں کو دبایا جا سکتا تھا۔

جیمز ینگ کے نظریے کو آگے بڑھاتے ہوئے ہم پوچھ سکتے ہیں کہ پھر کیسے تقسیم کو ان واسطوں کے بغیر جانا جا سکتا ہے جن کے توسط سے ہمیں تفصیلات معلوم ہوتی ہیں؟ یہ نہ صرف تحریروں اور یادوں کی شکل میں ہیں بلکہ ان میں لوگوں کی جھجک بھی

شامل ہے۔ اس قسم کی صورت حال میں ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ کون سے حقائق واضح اور روشن ہیں۔ تقسیم ہند کی موجودہ تاریخ میں سے کتنی تاریخ ''حقائق'' پر مباحثوں کے نتیجے میں وجود میں آئی؟ وہ مباحثے جو ایک شخص کی دوسرے فرد کے خلاف توضیح کو متوازن کر سکتے ہوں—— میں ان کو دُہرانا یا ان کی تفصیل میں جانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اس طرح اگرچہ تقسیم ہی اس کتاب کا موضوع ہے، اس کے باوجود یہاں قاری کو تقسیم کی طرف جانے والے واقعات، ترتیب وار نہیں ملیں گے۔ کئی ''سیاسی'' مباحث کو بھی اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قاری کو اس تاریخ کے بڑے کرداروں، گاندھی، نہرو، پٹیل، جناح، لیاقت علی خان اور ماؤنٹ بیٹن کے بارے میں بھی زیادہ کچھ نہیں ملے گا۔ میں نے اپنی توجہ چھوٹے اور بظاہر نظر نہ آنے والے کرداروں پر مرکوز رکھی ہے۔ یہ عام لوگ، خواتین، بچے اور اچھوت ذاتیں ہیں۔ میں نے اُصولی طور پر انٹرویو اور زبانی بیانات کے ذریعے یہ تحریر لکھی ہے۔

میں یہ بات بلا تامل کہہ سکتی ہوں کہ مجھے اندازہ ہے میں ایک دُشوار گزار دائرہ میں قدم رکھ رہی ہوں۔ تاریخی حوالوں میں زبانی تاریخ کو ایک نزاعی باب کی حیثیت حاصل ہے۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں کہ میں لوگوں کے خیالات یا ان کے خام تجربے کی تصویر جیسی چیز، جسے تاریخ کا نام دیا جا سکتا ہے آپ کے سامنے پیش کروں، کیوں کہ یہ دونوں ہی پریشان کن تصورات ہیں۔ میں کوئی تاریخ دان ہوں نہ تاریخ میرا مضمون ہے۔ میں اس کام کی طرف تاریخ کے ساتھ اپنے سیاسی—— اور—— ذاتی تعلق، معاصر فرقہ واریت اور آزادی نسواں پر اپنے گہرے اور مستقل رابطے کی بنا پر آئی۔ ان تمام باتوں سے میں نے یہ محسوس کیا کہ یقیناً یہ بات میرے لیے بہت اہم ہوتی کہ اس طرح میں یہ سننے اور سمجھنے کے قابل ہو سکوں گی کہ کیسے اور کیوں مذہبی تفریق ان لوگوں پر حاوی ہوئی۔ کیوں ہندوؤں اور سکھوں کی دوسری اور تیسری نسل تقسیم کے بعد بھی ''ہماری'' اور ''ان کی'' کی تفریق کی اندرونی تصویر بنی ہوئی ہے حالانکہ ان کے پاس ماسوائے خاندانی اور برادری کی یادوں کے کوئی دیگر حوالہ موجود نہیں ہے۔ آخر ان کی یادوں کے بارے میں وہ ترجیحی رُجحان کیا تھا جس میں خوف اور نفرت کے جذبات پلتے رہے؟ جب کہ دوستی اور بھائی چارے کے احساسات کو اُبھرنے نہ دیا گیا۔ مجھے اپنے

اختیار کردہ طریقے میں پوشیدہ خطرات کا اندازہ ہے، میرے پاس واقعات کی حقیقت جانچنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ مثال کے طور پر مجھے کیا معلوم کہ لوگوں کی سنائی ہوئی داستانیں سچ ہیں؟ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ انہوں نے دوسروں کے خلاف جارحیت کے لیے کس ذریعے کا انتخاب کیا؟ ہم یوں بھی چار یا پانچ عشروں کے بعد اس کی حقیقت کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں کہ یہ کہانیاں محض ان افراد کی کارگزاریوں کا اعادہ نہیں۔ یا یہ کہ یہ کہانیاں مختلف لوگوں کے لیے مختلف انداز میں کہی گئی داستانیں ہیں؟ شاید ان کو بیان کرنے والا یہ سوچتا ہو کہ انٹرویو کرنے والا کیا سننے کی خواہش رکھتا ہے اور وہ وہی کہہ رہا ہو۔ ہم ان داستانوں کے دوران میں خاموشی کے پیچھے چھپائی ہوئی حقیقتوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟ ہم ان کے یہاں سے کیا اخذ کریں اور کیا اس خاموشی کو توڑنا بذاتِ خود اچھی بات ہے؟ اس طرح کے سینکڑوں سوالات ہیں لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر رہی کہ جسے ہم تاریخ کا منظّم بیان سمجھتے ہیں اس کے مقابلے میں مَیں زبانی تاریخ رقم کر رہی ہوں۔ یہاں میں یہ پوچھنا چاہوں گی کہ کیا ایسا کوئی راستہ ہے جس کے توسط سے لوگوں کی کہانیاں، قطع نظر ان کے مسائل کے تاریخ کی تعریف اور حدود کو اس طرح پھیلا سکتی ہوں کہ وہ اس میں اپنی جگہ بنا سکیں؟ کیا کوئی ایسا راستہ ہے جس کے تحت تاریخ میں چھوٹی یا انفرادی آواز کے لیے کوئی جگہ بن سکے؟ اس کی حدود چاہے کچھ بھی ہوں، زبانی بیان تاریخ کو مختلف انداز اور مختلف معانی میں ظاہر کرتا ہے، اس لیے بھی کہ ایسی کہانیاں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہو کر آگے چلتی ہیں۔ جس دَور سے ان کا تعلق ہوتا ہے اس میں ان کے وجود کی شناخت بھی غیر واضح اور دھندلی ہوتی ہے۔ چونکہ لوگ مختلف تاریخوں اور مختلف نظام الاوقات کی نسبت سے اپنی یادوں کو تازہ رکھتے ہیں، اس لیے ایسے واقعات جو تاریخوں کے آغاز اور اختتام کی نشان دہی کرتے ہیں وہ تاریخ کے باقاعدہ بیان کے اوپر نیچے بہتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ہم سے تاریخ کا عدسہ ایک مختلف زاویے پر مرکوز رکھنے کا تقاضا کرتے ہیں اور اس مخصوص مقصد پر سوچ بچار کی پیش کش کرتے ہیں۔ میں یہاں یہ بحث نہیں چھیڑنا چاہتی کہ زبانی واقعات باقاعدہ تاریخ کی جگہ لے سکتے ہیں۔ ہاں یہ تاریخ میں انتہائی اہم مقام ضرور حاصل کر سکتے ہیں اور میرا یقین ہے کہ ان کی شمولیت سے تاریخ کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اس بات کو سمجھنے کا کوئی ایسا راستہ نہیں جو تقسیم سے متعلق ہو۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں کہ میں یہ دیکھنے کے لیے کہ لوگ تقسیم کی تاریخ کو کیسے یاد رکھتے ہیں اسے ادبی رنگ میں ڈھال دوں یا ان بیان کردہ باتوں کے اندر جا کر کسی نوعیت کا ''سچ'' معلوم کرنے کی کوشش کروں۔ اس کے بجائے میں ان یادوں کو محض انہی کے لیے دیکھنے کی تمنا رکھتی ہوں—— مصنف جیمز ینگ کہتا ہے: ''زندہ بچ جانے والوں سے جو بھی کہانی ابھرتی ہے وہ چاہے سچ سے مختلف ہو لیکن مخصوص انداز میں سچ کا حصہ ضرور ہوتی ہے۔ کسی شہادت میں موجود غیر حقیقی عنصر حقائق کے حوالے سے تنازعات میں ملوث نہیں ہوتا۔ لیکن ان حقائق میں موجود گواہی در گواہی، زبان در زبان اور کلچر در کلچر ناگزیر تبدیلیوں اور پیش کش کا سمجھنا مشکل ہے۔''[1] اسی لیے مجھے جتنی اُمید تھی اس کے مطابق میں اس کتاب میں واقعات کو زیادہ مؤثر انداز میں اور زیادہ فصاحت سے نہیں بیان کر سکی۔

☆☆☆

کوئی کتاب لکھنے کے لیے مواد جمع کرنا آسان ترین کام ہوتا ہے، مشکل فیصلے اس وقت کرنا پڑتے ہیں جب لکھنے والے کو یہ کوشش کرنا پڑے کہ کیا چیز شامل کی جائے اور کون سی چھوڑ دی جائے۔ اس موضوع پر میں نے کئی سال کام کرتے ہوئے شاید 70 کے لگ بھگ لوگوں کے انٹرویو کیے۔ تقسیم سے متاثرہ افراد کی تعداد کے حوالے سے اتنی تعداد میرے نزدیک اہم تو ہے۔ اگرچہ اسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے تاہم یہ بات اس حقیقت کا واضح اشارہ ہے کہ کوئی ایک شخص اس پورے منصوبے کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ جہاں کتاب کے ایک حصے میں مَیں نے تقسیم کی داستانیں خود بیان کی ہیں وہاں دوسرے حصے میں لوگوں کے انٹرویو شامل کیے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی زبان میں تفصیلات بتائی ہیں لیکن جن جن لوگوں سے میں ملی، میں نے ان میں سے صرف ایک قلیل تعداد میں لوگوں کو کتاب میں شامل کیا ہے۔ میں نے یہ کام اس لیے نہیں کیا کہ دیگر افراد کا حوالہ دینا میرے لیے اہم نہیں تھا بلکہ وجہ یہ ہے کہ کتاب کے لیے ان تفصیلات کی کانٹ چھانٹ کرنا واقعی بہت مشکل تھا۔ آخر میں مَیں نے اپنی مرضی کا معیار

1 : دیکھیے جیمز ای ینگ، رائٹنگ اینڈ ری رائٹنگ دی ہولوکاسٹ۔

معیار منتخب کر لیا۔ میں نے وہی کہانیاں شامل کیں جن کی میرے نزدیک اہمیت تھی۔ ان لوگوں کی کہانیاں جن کے ساتھ میری حقیقی دوستی ہو گئی یا وہ داستانیں جن سے میرا بار بار واسطہ پڑا۔ ان انٹرویوز کو پیش کرتے ہوئے میں نے ان کے تسلسل کا خیال رکھا—— اس لیے میں نے انٹرویو دینے والے افراد کے سوالات کو شامل نہیں کیا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ اصل متن مسلسل بیانیے میں ہو۔ اس میں ترتیب وار تبدیلیاں بھی نہیں کی گئیں۔ کچھ صورتوں میں البتہ میں نے دیگر لوگوں کی طرف سے بیان کے دوران میں قطع کلامی کو بھی برقرار رکھا بالخصوص وہاں جہاں متن کے مخصوص پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کے لیے مثالیں دی گئیں۔ انٹرویوز کو ''قابل مطالعہ'' بنانے کے لیے تبدیلیاں نہایت محتاط انداز میں کی گئیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ کسی انٹرویو کی ریکارڈ شدہ نقل کو ترتیب کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔ الفاظ کو متن میں تبدیل کرتے ہوئے بہت کچھ ضائع ہو گیا۔ جیسے مخصوص زیر و بم، مختلف خیالات اور حملوں کے حوالے سے جھجک، یہاں تک کہ مخصوص محسوسات اور جسمانی حرکات جو اکثر الفاظ سے مختلف داستان کہتی ہیں۔ سب سے بڑھ کر انٹرویو کرنے والے کی طرف سے انٹرویو کی محتاط تشکیل، جو عام طور پر انٹرویو والے شخص کے مقابلے میں زیادہ مضبوط پوزیشن میں ہوتا ہے۔ یہ بیان کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس بات کے اظہار کی نشان دہی کرنا ممکن نہیں کہ انٹرویو ایک خالص حالت میں قاری کے سامنے پیش ہو سکیں گے اور میں نے ان خیالات کو زیادہ بہتر طور پر قابل مطالعہ بنانے کے لیے انھیں ایڈیٹ کیا۔ ہر انٹرویو کا مکمل متن اور درحقیقت وہ واقعات جو میں نے یہاں پیش نہیں کیے مجھے اُمید ہے کسی لائبریری کے طاق میں موجود رہیں گے اور اسی حوالے سے تحقیق کرنے والوں کے کام آ سکیں گے۔

زیادہ تر انٹرویو گھریلو ماحول کے اندر ہوئے۔ اس وقت مجھ سے مخاطب ہوتے وقت عورتیں کم کم ہی اکیلی ہوتیں۔ انٹرویو کے دوران میں زیادہ مشکل وقت وہ ہوتا جب خواتین بڑی مشکل سے گھریلو مصروفیات سے چند لمحے بچا کر میرے لیے وقت نکال لیتیں۔ اگر ان کے شوہر اور بیٹے پاس ہوتے تو بھی وہ انٹرویو کی طرف راغب ہو جاتے، یا پھر وہ غیر ارادی طور پر بولتے بولتے کسی نامعلوم خاموشی میں ڈوب جاتیں —— یہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں—— زبانی تاریخ لکھنے والوں کو اکثر خواتین سے گفتگو

کرتے ہوئے ایسی دُشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سننے اور سیکھنے کا مختلف انداز اکثر اوقات لہجے کا مخفی اُتار چڑھاؤ، ادھ کہی بات اور خاموشی جو بعض اوقات تقریر سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے، میرے نزدیک خواتین کو سننا دو عورتوں کے درمیان ملاقات کے مقابلے میں ایک مرد اور عورت کے مابین گفتگو سے مختلف ہوتا ہے۔

اب جب میں ان انٹرویوز کو پڑھتی ہوں تو مجھے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کے کہے ہوئے الفاظ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کیا جنس کی بُنیاد پر تقسیم کے حوالے سے بیان میں ایسا ہی کوئی پہلو موجود ہے؟

میں نے جوں ہی عورتوں کو ان کے مقام کے مطابق پہچاننے کا فن سیکھا یہ خواتین تقسیم کے اس بڑے واقعہ میں بہت چھوٹے کردار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خواتین سے میں نے ان کی زندگیوں کی غیر اہم تفصیلات بھی سنیں جب کہ مرد زیادہ تر گروہوں کے باہمی تعلقات اور سیاسی حقیقتوں پر بات چیت کرتے رہے۔ بہت کم ایسا ہوا کہ کسی مرد نے اپنے کھوئے ہوئے یا مقتول بچے کا ذکر کیا ہو۔ دوسری طرف کوئی خاتون بہ مشکل ہی ایسے کسی واقعہ کو بھلا پاتی تھی۔ یہ وہ سوال ہے جس پر میں نے کتاب کے آخر میں مزید بحث کی ہے۔

اپنے موضوع پر بات کرنے کے لیے موزوں افراد کی تلاش بھی ایک پیچیدہ مرحلہ تھا۔ پہلے میں نے برطانیہ میں ''چینل فور'' ٹی وی کے لیے 2 دوستوں کی تیار کردہ فلم A Division of Hearts پر کام کرتے ہوئے اس حوالے سے محتاط طریقے سے آغاز کیا لیکن جیسے ہی کام شروع ہو گیا تو جہاں جہاں میں گئی مجھے ایک نئی داستان سننے کو ملی۔ بالخصوص دہلی میں۔ آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ ہر دوسرے پنجابی خاندان میں کسی نہ کسی جگہ تقسیم کی تاریخ کا حوالہ موجود ہے۔ اکثر اوقات میں سڑک پر کھڑی ہو کر کسی بوڑھے فرد کو روک کر اس موضوع کا ذکر چھیڑ دیتی۔ ایک دفعہ میں دہلی کے علاقہ جنگ پورہ میں ایک فیملی سے گفتگو کے بعد آٹو رکشا پر واپس روانہ ہوئی تو دیکھا کہ ڈرائیور نے شلوار کرتا پہن رکھا ہے جو پاکستانی پنجابیوں کا مخصوص لباس ہے۔ میں نے پوچھا تمھارا تعلق کہاں سے ہے۔ اس نے وہی سوال کیا جو شمالی ہندوستان میں کسی سے پوچھنے پر کیا جاتا ہے۔ اس نے کہا کیا آپ موجودہ یا سابق علاقے کا پوچھ رہی ہیں؟ لفظ سابق اس کے اصل

لفظ کا قریب ترین ترجمہ ہے۔ اس نے پنجابی میں کہا تھا ''پچھے سے'' جو عام طور پر کسی کے ماضی کے تعلق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا، میری دلچسپی موجودہ نہیں سابق تعلق کے بارے میں جاننے سے ہے۔ اس نے کہا اس کا تعلق بلوچستان سے ہے، جہاں وہ تقسیم کے دس برس بعد تک مقیم رہا۔ اس کے چھوٹے سے گاؤں میں ہندو آبادی بڑے سکون سے کسی تکلیف کے بغیر رہتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس کے گھر پہنچ گئے اور گزرے وقت کی یادوں پر گفتگو کرنے لگے۔ اسی طرح ایک دن میں جنوبی دہلی کے ایک ریستوران سے روٹی اور کباب پکڑے باہر نکل رہی تھی کہ مجھے ایک بھکارن نے روک لیا اور پیسے مانگے۔ وہ پنجابی بول رہی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیوں کہ دہلی میں پنجابی بھکاریوں کی تعداد بہت کم ہے۔ میں نے اس سے دریافت کیا، تم کہاں کی رہنے والی ہو؟ اس نے بھی وہی سوال کیا، موجودہ علاقہ یا پہلے والا۔ میرا جواب بھی وہی تھا جس پر اس نے بتایا کہ وہ چھوٹے گاؤں چک 53 سے آئی ہے۔ اس نے شرنارتھیوں کے ایک بڑے قافلے کے ساتھ طویل فاصلہ طے کیا اور دہلی پہنچی اور اب بھیک مانگنے پر مجبور ہے۔ اسی طریقے سے میں ایک فرد سے دوسرے تک اور ایک کہانی سے دوسری کہانی تک پہنچتی گئی اور کہانیوں کا تقریباً مسلسل مجموعہ اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں ان زبانی واقعات پر مبنی کتاب کی تحریر کے لیے کوئی واضح نمونہ کیوں نہیں اختیار کرسکی۔

البتہ کچھ نمونے پڑھنے والوں کے لیے قابل فہم ہوں گے۔ مثال کے طور پر میں نے جو انٹرویو کیے ان میں سے کئی انٹرویو ایک ہی خطے ـــــ ضلع راولپنڈی ـــــ کے ہیں اور ان کا تعلق تقسیم سے محض چند ماہ پہلے مارچ 1947ء میں ہونے والے ہنگاموں سے ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ تقسیم کی وجہ سے تباہ حال خاندانوں کی ازسرِنو آبادکاری کے لیے لوگ بڑی تعداد میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہوتے رہے یا ان کا قیام سرکار کی طرف سے مخصوص مقام پر رہا۔ جب میں نے تقسیم کے پسماندگان کو ڈھونڈنا شروع کیا تو سب سے زیادہ میرا واسطہ راولپنڈی کے سانحے کے متاثرین سے پڑا جو دہلی کے مڈل کلاس علاقے میں مقیم تھے۔ ایک شخص نے دوسرے کے بارے میں نشان دہی کی، پھر تیسرا اور اس طرح میں ان کہانیوں کو جمع کرسکی۔ یہی وجہ ہے کہ راولپنڈی کے زندہ بچ

جانے والے افراد کا ذکر اس کتاب میں زیادہ ملے گا۔ زبانی بیانات سے منسلک تمام تکنیکی مسائل سے قطع نظر ان کو عملی اور ساختی حوالوں سے سنبھالنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ آخر ایسی کتاب کا ڈھانچہ کیسے تشکیل دے سکتے ہیں جس کی بُنیاد ایسے حوالوں پر ہو؟ یہاں کئی سوالوں نے جنم لیا۔ کیا کتاب کو صرف انٹرویو پر مبنی ہونا چاہیے؟ یا ان کے ساتھ تبصرہ بھی شامل ہونا چاہیے؟ کیا کوئی تجزیہ یا وضاحت بھی ہونی چاہیے؟ انٹرویو طویل ہونا چاہئیں یا مختصر؟ اس طرح کئی دیگر سوالات تھے۔ میں گویا ان تمام سوالوں سے گتھم گتھا ہوگئی۔ شروع میں مَیں نے سوچا کہ صرف زبانی تفصیلات پر مشتمل کتاب کی تدوین کروں۔ اس میں کوئی وضاحت یا تبصرہ شامل نہ ہو۔ دوسری جانب ایک قاری اور پبلشر کی حیثیت سے مجھے یقین ہو گیا کہ بہت کم قاری صرف ایسے زبانی واقعات کو تفصیل سے پڑھتے ہیں جو مختصر ہوں۔ میں یہ بھی سوچنے لگی کہ میں انٹرویو میں بتائی گئی بہت اہم باتیں کانٹ چھانٹ دوں یا انھیں کسی تبصرے کے بغیر پیش کروں۔ جب میں انٹرویوز کو الفاظ میں ڈھال رہی تھی میں نے سوچا کہ کیا میں ان چیزوں کی نشان دہی کروں جو میرے نزدیک اہم ہوں؟ بہرحال جیسے جیسے میں اس کام میں منہمک ہوتی چلی گئی مجھے لگا کہ اس میں میرے کہنے کی بھی بہت سی باتیں ہیں اور یہ باتیں لوگوں کی بتائی ہوئی تفصیلات کا ہی تسلسل ہیں۔ ایک وہ کہانیاں جو انہوں نے بیان کیں، دوسرے ان کو اپنے انداز میں سمجھنا۔ اس کے بعد میں نے دونوں چیزوں کو باہم ملانے کا سوچنا شروع کر دیا۔ اس کتاب کی جو ساخت آپ کو نظر آ رہی ہے یعنی تجزیاتی باب کا بڑا حصہ، جو انٹرویوز کے اقتباسات پر مشتمل ہے وہ دراصل اس طریقے سے وجود میں آیا ہے۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ اپنی جگہ موجود رہا کہ کیسے اور کہاں انٹرویوز کی تمام تفصیل دی جائے۔ میں نے اسے ضروری خیال کیا کہ کم از کم ان منتخب کہانیوں کی کچھ تعداد کے لیے کوئی جگہ ہونا چاہیے جو اس کتاب کا لازمی حصہ ہیں۔ بہت زیادہ سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ تمام انٹرویوز کو کتاب کے آخر میں ایک علیحدہ سیکشن میں رکھا جائے۔ لیکن یہ کام کرنے کے بعد وہی مشکل پھر سامنے آ گئی کہ کیا واقعی لوگ ان واقعات کو پڑھیں گے یا انھیں محض دیگر حصوں سے منسلک ایک باب قرار دیں گے۔ اس بات کا امکان زیادہ نظر آ رہا تھا کہ اس حوالے سے کام کا کیا نتیجہ ہوگا۔ میرے نزدیک ان انٹرویوز کا

الگ ضمیمہ بنانا نہایت اہمیت کا حامل تھا۔ آخرکار میں نے فیصلہ کر لیا کہ انٹرویو کو اصل عبارت میں ہی شامل کر لوں۔ ہر باب میں ایک یا دو انٹرویو پر میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ حتی الامکان میری یہ کوشش رہی ہے کہ ہر انٹرویو کو اس باب میں شامل کروں جس سے اس کا کوئی تعلق یا حوالہ نکلتا ہے۔ تاہم ایسا ہر بار کرنا ممکن نہیں تھا۔

درحقیقت بہت اختصار کرنے میں یہ مشکل تھا کہ ہر باب کے اختتام پر ایک ایسا انٹرویو شامل کیا جائے جو واقعات کے حوالے سے موزوں ہو۔ اس کام کے آغاز سے قبل ابواب کی فہرست میرے ذہن میں ہوتی تو میں احتیاط سے ان انٹرویوز کا انتخاب کر لیتی جو مخصوص باب سے متعلق ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ بعد میں ہوا، میرے کیے انٹرویو کسی مخصوص نمونے سے مطابقت نہیں رکھتے۔ میں نے اس لیے انھیں ہر باب کے ساتھ رکھنا پسند کیا کیوں کہ یہ ان تفصیلات کا اندرونی احاطہ کرتے ہیں جن پر میں نے اس کتاب میں بحث کی ہے۔ ایسا صرف اس باب تک محدود نہیں جس میں انھیں رکھا گیا ہے۔ کئی جگہ پر باب کا آغاز انٹرویو سے ہوتا ہے اور کسی باب کا اختتام انٹرویو پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ یوں کہہ لیں کہ یہ ایسے دھاگے ہیں جن پر باب کا تانا بانا جوڑا گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ قاری کتاب پڑھتے ہوئے اس بات کو پیش نظر رکھے گا۔

اگرچہ انٹرویو ہی کتاب کی بُنیاد بنتے ہیں تاہم میں نے مختلف ڈائریاں، یادداشتیں، اخباری رپورٹیں اور ایسی دستاویزات بھی دیکھیں جو میرے نزدیک اس کام کے لیے معاون ثابت ہو سکتی تھیں۔ ان میں مختلف لوگوں کے لکھے خطوط، انکوائری کمیشنوں کی رپورٹیں، پمفلٹس اور کتابیں بھی شامل ہیں۔ ان کی مدد سے میں نے تقسیم کی کئی مختلف آوازوں کو از سرِنو ترتیب دیا۔ ان میں سرکاری، غیر سرکاری، غیر رسمی اور دیگر ''آوازیں'' شامل ہیں۔ ان میں اپنی کہانیاں سنانے والے لوگوں کی آوازیں، یادداشتوں کے ذریعے بیان کی گئی تفصیلات، ڈائریاں، خودنوشتیں، وہ آوازیں جو سرکاری ریکارڈ سے اُبھرتی ہیں یا وہ جو مختلف گروہی بیانات میں دیکھی جا سکتی ہیں، اور ان سب کے ذریعے ترتیب پانے والی میری اپنی آواز، میرا مطالعہ، باتیں، سوالات اور تکلیف دہ وضاحتیں بھی شامل ہیں۔

ان سب کو جمع کر کے ایک کتاب ترتیب دی گئی ہے، جس میں مصنف اور

پبلشر کی حیثیت سے میری موجودگی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ بلکہ کچھ پڑھنے والوں کو تو یہ موجودگی بہت ہی نمایاں محسوس ہو گی۔ میں اس پر کوئی معذرت نہیں کرتی بلکہ صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں ہمیشہ سے ہی تواریخ کے بارے میں گہری بدگمانی کا شکار رہی ہوں جو ایسے لکھی گئیں گویا مصنف ایک گاڑی ہو۔ مؤرخ رونلڈ بارتھس کے الفاظ میں ''لگتا ہے تواریخ نے اپنے آپ کو خود ہی لکھا ہے۔ ایسی تاریخوں میں ''میں'' کی عدم موجودگی غالباً دوری قائم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مقصدیت تو مبہم ہوتی ہے مگر غالباً حقائق سامنے لانے میں اس سے مدد ملتی ہے۔ یہاں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ میں یہ ظاہر کروں کہ تقسیم کے حوالے سے یہ کہانیاں کوئی با مقصد چیز ہیں۔ مجھے یقین نہیں کہ ایسا کرنا کسی صورت میں بھی ممکن ہو۔ کئی برسوں سے جب سے میں اس کام میں جُتی رہی ہوں میں نے خود کو اس میں پوری شدت سے جذباتی سیاسی اور علمی طور پر شامل محسوس کیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا بددیانتی ہو گی کہ ''تاریخ از خود'' لکھی گئی۔

تاریخ پر کام کرنے کے مرحلے میں ہر اس محقق یا مصنف کی طرح جو اپنے کام میں مکمل مگن رہتا ہے، میں بھی اسی وہم میں مبتلا رہی۔ کئی برسوں تک میں کچھ اور نہ سوچ سکی۔ ایک چیز جس نے مجھے بہت پریشان کیے رکھا اسے ہم کام کی مقصدیت میں کمی کہہ سکتے ہیں۔ اس کتاب میں میری ذاتی مداخلت کی تردید نہیں کی جا سکتی۔ اس بات کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ یہ دعویٰ کروں کہ اس کام میں جذباتی اُلجھاؤ نہیں۔ اس کے علاوہ میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ میں اسے سیاست سے بالکل مبرّا رکھوں۔ اس حقیقت کو قبول کرنے میں مجھے کئی برس لگ گئے۔ اگر اس کتاب کو تاریخ کے طور پڑھا جا رہا ہے تو اسے شاید اُٹھا کر دروازے سے باہر بھی پھینکا جا سکتا ہے۔ غالباً اس کے بعد مناسب ترین یہ ہو گا کہ میں یہاں تاریخ کے ساتھ ''ذاتی'' (پرسنل) کا لفظ استعمال کروں جس کی میں اس کتاب میں کوشش کر رہی ہوں۔ ایسی صورت میں مقصدیت اور دوری کا تصور باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ ایک ذاتی تاریخ ہے جس کو مقصد نما بنا کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

ان کہانیوں کے اندر اور باہر میری اپنی آواز کی گونج کی ایک اور وجہ بھی ہے۔

زبانی تاریخ ایک منظم طریقہ کار ہے۔ اس نکتے کو کئی خواتین مؤرخوں نے بہت زیادہ مؤثر پایا ہے۔ خواتین کے بیانیوں اور شہادتوں کو دیکھتے ہوئے اور انھیں سرکاری تاریخ کے اُلٹ یا ان کے مقابلے میں ایک طرف رکھنے کے طرزِ عمل سے خواتین مؤرخوں کو تاریخ کو ایک مختلف زاویے سے دیکھنے کی راہ دکھائی ہے۔ ایک عورت کی آنکھ سے دیکھی گئی ''تاریخ'' کیسی نظر آتی ہے؟ یہ تاریخ بیانات اور گواہیوں کے سانچے میں اس وقت کیسے ڈھلتی ہے جب ایک عورت دوسری عورت سے بات کرتی ہے؟ لیکن جہاں زبانی تاریخ کو مؤثر سمجھا جاتا رہا ہے وہاں اس نے کئی مسائل کو بھی جنم دیا ہے۔ بہرحال کوئی بھی بیان یک طرفہ ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد مؤرخین یہ کیسے یقینی بنا سکتے ہیں کہ ان کے انٹرویوز کے عنوانات محض ''خام مواد'' نہیں جس کی بنا پر وہ اپنے نظریات کی تخلیق کریں گے۔ بعض صورتوں میں زبانی تاریخ دان بالخصوص نسوانی مؤرخین نے اپنی تحقیق کے نتائج کو ان کے عنوانات کی طرف موڑنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے دراصل کوشش کی ہے کہ جذبات سے کھیلنے کا رنگ اس میں شامل نہ ہو۔ اس صورت میں جہاں ان کاوشوں نے پُرخلوص محرک کو جنم دیا، ان کے ذریعے اس زورِ بیان میں توازن کم ہی تبدیل ہوتا ہے جس سے زبانی شواہد کے مجموعے کی اہمیت اجاگر کی جاسکتی ہے۔ جب آپ کے عنوانات آپ سے مخاطب ہوتے ہیں اس کے طویل عرصے بعد ان کی آوازیں آپ کے کام کے اندر زندہ نظر آئیں تو یہ آپ کے کیریر کی ترقی میں معاون ہو سکتی ہیں۔ اور جہاں تک آپ کا تعلق ہے ان کا وجود قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد عنوانات پس منظر میں آگے اور پیچھے کی جانب بڑھتے محسوس ہوں گے۔ ایک ہی وقت میں تبدیل ہوتے جذبات سے آگاہی کے ہمیشہ سے تکلیف دہ احساس نے مجھے یہ سبق دیا کہ میں ایسا طریقہ کار استعمال کروں جس میں یہ دعویٰ نہ ہو کہ میری ذات ایک سائے یا عکس کے طور پر نظر آئے۔ میں نے جو کہانیاں سنیں انھیں کتاب میں مرکزی اہمیت دی۔ اس کے ساتھ میں نے جو محسوس کیا اس کو بھی پیش کیا۔ اس طرح اگرچہ یہ کتاب نہ ''صرف'' خواتین کے بارے میں ہے بلکہ اس میں خواتین، ان کی تاریخ اور تخلیق کردہ طریقہ ہائے کار کو بھی اس میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ حقوقِ نسواں کی علم بردار ہونے کی بنا پر، یا جس کسی کے لیے نسوانی تاریخ دانی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، میں نے یہ کام

مکمل کیا۔

تاہم یہاں میرے کام کے اندر ایک بڑا سقم پایا جاتا ہے کہ یہ یک طرفہ ہے۔ اس کا تعلق تقسیم کے صرف ایک پہلو سے ہے—— وہ ہے تقسیم پنجاب۔ میں نے مشرق کی طرف تقسیم بنگال پر بالکل نگاہ نہیں ڈالی۔ ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ مجھے وہاں کی زبان نہیں آتی۔ دوسری یہ کہ تقسیم بنگال، پنجاب کی تقسیم سے مختلف واقعہ ہے، اور مجھے اس کی قابل ذکر معلومات بھی نہیں ہیں۔ اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اس کام کا آغاز کیسے اور کہاں سے کروں۔ اسی طرح اس موضوع پر پاکستان میں معلومات، انٹرویو یا معاون، کسی بھی چیز تک میری رسائی نہیں تھی۔ (ماسوائے غالباً میرے انکل کی لہو رنگ داستان، یا ایک اور انٹرویو جو میں نے اپنی بعض دوستوں کے ذریعے کیا) تقسیم ہند کا ایک اور المیہ یہ ہے کہ تاریخ برصغیر کے اس بڑے واقعے پر تحقیق کرنے والوں کو بھارت اور پاکستان صرف دو ملکوں میں اس صورت میں رسائی حاصل ہوتی ہے۔ اگر اس کا اپنا تعلق کسی تیسرے ملک سے ہو ان دونوں ملکوں کے کسی فرد کا سرکاری فائلوں اور دستاویزات تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ دونوں طرف سے اگر کوئی دوسرے ملک میں انٹرویو کرنا چاہے تو تلخیاں اور تکلیف دہ بوجھ ایسا کرنا ناممکن بنا دیتے ہیں۔ یا حقیقت میں دوسرا راستہ تقسیم کو جذباتی رنگ دینے کے گرد ہی گھومتا ہے۔ میں نے کئی مواقع پر ایسا کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

اس کتاب میں آپ کو جو انٹرویو ملیں گے وہ کئی برسوں میں مکمل کیے گئے ہیں۔ جب میں نے لوگوں سے گفتگو کرنے کا آغاز کیا تو میرے ذہن میں کوئی واضح منصوبہ نہیں تھا۔ کتاب لکھنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خیال اُبھر کر سامنے آیا۔ تاہم اس بات کا فیصلہ میں نے بہت پہلے کر لیا تھا کہ میں انٹرویو کے لیے روایتی طریقہ اختیار نہیں کروں گی۔ وہ یہ کہ نہ کوئی مخصوص سوال نامہ ہوگا، نہ لوگوں کا منتخب ''نمونہ'' یا علاقائی، طبقاتی تخصیص ہوگی۔ میں صرف لوگوں سے یہ پوچھوں گی کہ وہ اپنی زندگی میں اس مخصوص وقت کے حوالے سے بولیں، اس طرح وہ گفتگو خود بخود کسی سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی اور جہاں مناسب ہوگا اس سمت کو بہتی رہے۔ یہ سوچا سمجھا فیصلہ تھا، اگر کسی کو لوگوں کی تقسیم کی تواریخ کا مناسب نمونہ بنانا ہو تو

یہ مشکل کام کوئی ایک فرد نہیں کر سکتا اور اگر کوئی تنہا شخص میری طرح ایسا کرنے کی کوشش کر بھی لے تو اسے محدود رہنا پڑتا ہے۔ یہ بتاتی چلوں کہ محتاط طریقے سے تیار کردہ سوال نامہ یا سوچا سمجھا نمونہ کسی کے مکمل ہونے میں مدد فراہم نہیں کر سکتا۔ میں نے پھر فیصلہ کر لیا کہ جس طرح مجھے انٹرویو لکھوائے گئے میں ان کی تقلید کروں اور لوگوں کو کتاب کے اس مقام پر رکھوں جو ان کے لیے مناسب ترین ہے۔ لہٰذا میں نے کئی لوگوں سے گفتگو کی۔ مثال کے طور پر دمیانتی سہگل کی طرح مجھے بعض اوقات ایک انٹرویو کرنے میں کئی ماہ لگ گئے۔

ان حالات میں جن سے میرا واسطہ پڑا کسی شخص کا تنہائی میں انٹرویو کرنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ زیادہ تر انٹرویو گھریلو ماحول کے اندر کیے گئے۔ یہاں تک کہ ہم اگر کبھی ایک شخص سے گفتگو کر رہے ہوں تو پورا خاندان ـــــ اکثر کئی پیڑھیاں ـــــ اس میں شامل ہو جاتیں، یعنی ہر کوئی وضاحت کرنے لگے، یا کوئی سوال کر ڈالے۔ جو کہانیاں شروع کی گئیں وہ ادھوری چھوڑ دی گئیں اور جب دوبارہ شروع ہوئیں تو ان کے سرے کہیں اور جا ملے۔ بعد میں ہم دوبارہ اس داستان کی طرف آ جاتے یا پھر کبھی نہ آ پاتے۔ ان باتوں کو شفاف طور پر ترتیب نہیں دیا گیا۔ ان کا کوئی واضح آغاز تھا نہ انجام۔ میں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ کتنا اور کیسی آسانی سے ماضی کا بہاؤ حال میں ہو سکے گا۔ اور جو کچھ یاد کیا گیا ہے اس کی جڑیں ماضی سے ہٹا کر حال کے سیاق و سباق میں کیسے بیان ہو سکتی ہیں۔ پھر کئی لوگوں کے لیے 1947ء اور 1948ء کی یادداشتوں کو کسی الجھاؤ کے بغیر بتانا بہت مشکل تھا۔ جیسے تشدد کے واقعات کو یاد کرنا۔ اس عرصے کے دوران میں گزارا گیا تلخ ماضی، جو برسوں پر محیط تھا کئی مواقع پر کچھ یاد کرتے ہوئے یا یادداشت کریدتے ہوئے الفاظ کو بیان کی شکل دینا مشکل ہو جاتا کیوں کہ اس یاد کا ٹکراؤ ایک تکلیف دہ چیز سے ہوتا۔ اکثر کیفیت دہشت کا روپ دھار لیتی اور کچھ بیان کرنا دُشوار ہو جاتا۔ کوئی روتے ہوئے کہتا، ''میں کیسے کچھ بتاؤں، میرے پاس کہنے کے لیے الفاظ نہیں۔'' ایسے لمحات میں مَیں کچھ کریدنے سے گریز کرتی۔ میں ہرگز یادوں کو نچلی سے بالائی سطح پر لانے کے لیے دباؤ نہ ڈالتی۔ اس طرح شروع کی گئی بات ادھوری رہ جاتی۔ میں نے اس بات کو محسوس کرنا سیکھ لیا، یعنی ماضی، اور حال کے دَور کا گڈ مڈ

ہونا، نامکمل پن، حتیٰ کہ بعض دفعہ یاد کرنے کے مرحلے میں تصادم بھی دیکھنے کو ملتا۔ میں نے اس زورِ بیان میں توازن کا فقدان بھی تسلیم کر لیا، جو ایسے حالات میں زبانی تاریخ لکھنے والوں کی طرف سے موروثی طور پر اکثر بیان کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر میں لوگوں کو اپنی زندگی سے پردہ اٹھاتے ہوئے دیکھتی، سنتی اور ریکارڈ کرتی رہی۔ پھر وہ کچھ سوالات لے کر مجھ سے مخاطب ہو جاتے: آپ کیا سمجھتی ہیں، آپ کو اس سے کچھ حاصل ہو گا۔ آپ کی ان ریکارڈنگ ٹیپوں کو کون سنے گا؟ کیا واقعی اس سے ہماری زندگی میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے؟ یا کسی اور کی زندگی پر کچھ فرق پڑے گا؟ میں نے فوری طور پر محسوس کیا کہ میرے پاس ان سوالوں کے کافی جواب موجود نہیں۔ کیا جن لوگوں سے میں مخاطب تھی ان کے لیے یہ بات اہم تھی کہ میں سمجھتی ہوں تقسیم کی تاریخ گم نہیں ہو گی؟ یا یہ کہ تقسیم کی تاریخ میں ان کے تجربات اور داستانوں کو نظر انداز کیا گیا۔ اور کیا میرا مقصد ان کہانیوں کو تاریخ کے اندر بحال کرنا ہے؟ اور میرے نزدیک یہ بات یاد کرنا بھول جانے کا لازمی حصہ ہے؟ میرے پاس ان سوالوں کے کوئی آسان جواب نہیں تھے۔

آخر میں مَیں اس اُلجھے راستے کے بارے میں چند الفاظ کہوں گی جو مجھے اس کام کی طرف لے گیا۔ شروع میں مَیں نے تن تنہا کام کا آغاز کیا۔ پھر جلد ہی میرے لیے اپنے طور پر اسے جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ جس نوعیت کی کہانیوں سے میرا واسطہ پڑا وہ اتنی دردناک اور افسردہ کرنے والی تھیں کہ میرے لیے ان کو سننا ممکن نہ رہا اور میں اپنے ذہن پر ان کہانیوں کے بوجھ کے احساس سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکی۔ ایسا لگا کہ ابتدائی جھجک کے بعد جب ان لوگوں نے ایک بار بولنا شروع کر دیا تو وہ اپنا بوجھ تو کم کر لیں گے لیکن ایک سامع کے طور پر مجھے ان کا یہ بوجھ اُٹھانا ہو گا۔ مجھے یاد ہے کہ جنگ پورہ میں ایک دن ایک کنبے کے تمام روز انٹرویو کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ میرے لیے تشدد اور دہشت کی داستانیں سننے کا یہ سلسلہ جاری رکھنا ممکن نہیں ہو گا۔

یہی وہ موقع تھا جب میری ایک نہایت عزیز دوست سدیش وید میری درخواست پر میری مدد کے لیے تیار ہو گئی۔ اور جب ہم دونوں نے مل کر کام شروع کیا تو آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ہم بات کرنے، کچھ چیزیں بانٹنے اور کسی بات پر مسکرانے کے قابل ہو گئے۔ آپ اس کتاب میں کتنے ہی ایسے انٹرویو دیکھیں گے جو ہم نے مل کر

کیے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کئی جگہوں پر انٹرویو کرنے والوں کے لیے ''ہم'' کا صیغہ استعمال کیا۔ کئی انٹرویو میں نے اکیلے شروع کیے اور بعد میں ہم دونوں نے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ بھی مجھ سے الگ ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کہانیوں کی ہَول ناکی کو مزید برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا کہ میرے لیے منصوبے کو بالکل ترک کر دینا ممکن نہ رہا۔ میں نے تن تنہا اس سلسلے کو آگے بڑھانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ مجھے ابھی تک افسوس ہے کہ سدیش اس منصوبے پر میرے ساتھ زیادہ دیر نہ چل سکی۔ اگر وہ تعاون جاری رکھتی تو مجھے کامل یقین ہے کہ کتاب زیادہ پُرمغز اور اس سے بہتر حالت میں آپ کے سامنے ہوتی۔ اس کتاب کی جو بھی حدود ہیں—— اور یہ بہت زیادہ ہیں—— میں نے اب یہ کام اس اُمید کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ اس کا تقسیم پر لکھی تواریخ میں—— چاہے کم ہی ہو—— کچھ حصہ ضرور ہوگا اور مستقبل قریب میں کسی وقت ہندوستان کے دونوں حصوں تک آزادانہ رسائی ممکن ہو سکے گی۔ 1997ء میں بھارت اور پاکستان نے اپنی آزادی کی پچاسویں سال گرہ ''منائی''۔ میرے نزدیک اس موقع کو منانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دونوں ملک اپنی سرحدیں کھول دیتے، چاہے یہ محدود عرصے کے لیے ہی کیوں نہ ہوتا۔ (ایک سال یا شاید دو سال کے لیے) مجھے یقین تھا اگر ایسا ہو جاتا تو دونوں طرف سے سینکڑوں نہیں ہزاروں افراد ایسے ہوتے جو ''دوسری'' طرف جانا پسند کرتے۔ اپنے آبائی گھروں میں جانا، اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملنا چاہتے ہوں گے۔ لیکن یہ لمحہ بھی گزر چکا ہے۔ میرے خیال میں اب ہم یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ معاملات کچھ کھلیں گے۔ اگر کسی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے تو اس کام کے وقوع پذیر ہوئے بغیر ہم تقسیم پر گفتگو کے قابل ہوں گے۔ مجھے خدشہ ہے کہ ہمارے لیے اس سے پیچھا چھڑانا ممکن نہیں ہے۔



MashalBooks.com

2

خون

MashalBooks.com

MashalBooks.com

حصہ اوّل

رانا ماما

دیگر تمام کہانیوں کی طرح اس کہانی کا آغاز بھی مجھ سے ہوتا ہے۔ کئی سال تک جب کہ یہ کہانی میرے ساتھ جیتی جاگتی رہی میں سوچتی اور خود سے بحث کرتی رہی کہ اسے کس طرح بیان کروں، یا درحقیقت مجھے اسے بیان کرنا بھی چاہیے؟ شروع میں یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ بات تھی۔ میں نے سوچا اس کو بیان کرنا بہت ذاتی نوعیت کا معاملہ ہوگا۔ اگرچہ میرے انکل نے کئی بار کہا کہ وہ اس کہانی کو منظرعام پر لانے پر خفا نہیں ہوں گے اور میری ماں کو بھی علم تھا۔ اس کے باوجود یہ کہانی سنانا چاہتی تھی لیکن پھر بھی میں اس احساس خودغرضی سے چھٹکارا نہیں پا سکی۔ میں اس بات پر قائل ہوگئی کہ انھیں خود اپنی کہی باتوں کی تشریحات کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا لہٰذا میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ مناسب ترین یہ ہوگا میں کہانی شائع کرنے سے پہلے ایک مرتبہ انھیں سنا لوں۔ لیکن جب میں نے ایسا کرنے پر غور کیا تو میں نے محسوس کیا کہ میں ایسا نہیں کرنا چاہتی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کہانی بیان کی جائے گی۔ کئی حوالوں سے جب میں نے اسے دیکھنا شروع کیا تو ثابت ہوگیا کہ داستان گوئی نے نہ صرف میری کہانی، نہ صرف میرے خاندان کی کہانی، بلکہ ان کی زندگیوں کے ذریعے کئی دیگر کہانیوں کو بے نقاب کر دیا اور یہ سب کہیں نہ کہیں اس عجیب چیز کی داستان بنتی نظر آتی ہے جسے ہم ایک قوم کہتے ہیں۔ چاہے اس کہانی اور آنے والی دیگر کہانیوں میں اس کا تاثر زوردار نظر آتا ہو لیکن میرا مقصد بڑی چیزوں کی نظریاتی تشکیل نہیں تھی، مگر میں کچھ سوالات کرنا چاہوں گی: مشکل، پریشان کن سوالات، جنھوں نے اس وقت سے مجھے فریب دینا شروع کیا جب میں اس سفر پر روانہ ہوئی۔

کافی عرصے تک میں نے اس بات پر بھی بحث کی کہ مجھے اس کہانی کو کیسے

شروع کرنا چاہیے۔ جب کہ اسے بیان کرنے کی ذمہ داری بھی میرے سر ڈالی گئی تھی۔ کئی آغاز تھے جن میں سے انتخاب مشکل تھا۔ مثال کے طور پر کیا یہ تقسیم کے الم ناک حادثوں اور درد کی کہانیاں تھیں؟ اس کے نتیجے میں ہونے والے تشدد کی تفصیل تھی؟ جسے میں اپنی پوری زندگی میں سنتی رہی اور جس نے مجھے اس تحقیق پر مائل کیا؟ کیا یہ فلم تھی جس کی تیاری کے لیے میں نے کچھ دوستوں کی مدد کی اور مجھے اس دوران میں تقسیم کے زندہ کرداروں سے ملاقات اور اس کے زیر اثر یہ منصوبہ شروع کرنے کا موقع ملا؟ یا پھر کیا یہ 1984ء تھا، وہ سال جب اندرا گاندھی کے قتل کے بعد کے واقعات رونما ہوئے، دہلی میں سینکڑوں سکھوں کو قتل اور اپاہج کر دیا گیا۔ پُرتشدد ہنگامے اور ان کی زندگیوں کو زیر و زبر کرنے کے واقعات سے کیا تقسیم کے سانحوں کا اعادہ ہوا؟ یا کیا یہی سب کچھ تھا، مجھے واقعی کچھ معلوم نہیں، بہرحال یہاں میں اپنے طور پر کہانی کی ایک شروعات دے رہی ہوں، باقی ماندہ تفصیلات بھی اس کہانی میں آگے چل کر سامنے آئیں گی۔

☆☆☆

یہ 1987ء میں گرمیوں کی ایک گرم رات تھی۔ 10 بجے کا وقت تھا اور میں لاہور کے نواح میں ایک خستہ حال قدیم گھر کے برآمدے میں کھڑی تھی۔ اُلجھی تاروں کے گچھے کے ساتھ ایک گرد آلود بلب لٹک رہا تھا جس کی زرد روشنی سبزی مائل دراڑوں والی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ میں کچھ نروس بلکہ شاید کچھ خوف زدہ اور بے تاب بھی تھی۔ میں جو کچھ کرنے والی تھی مجھے اس کے بے قاعدہ ہونے کا احساس بھی ہونے لگا۔ میں کہنا چاہوں گی کہ اس وقت میرا دل چاہا میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوں، لیکن واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ لاہور تھا۔ رات بھی تھی۔ عورتیں سنسان گلیوں میں بھاگ نہیں سکتی تھیں ـــــ ہجوم بھی ہوتا تو بھی، پھر اکیلے میں اس وقت عدم دست یاب ٹرانسپورٹ کی تلاش مشکل ہوتا۔

لہٰذا میں نے وہی کیا جس کے لیے میں آئی تھی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد تین عورتیں کھلی کھڑکی میں نمودار ہو گئیں۔ میں نے پوچھا کیا یہ اس شخص کا گھر ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ جی ہاں! انھوں نے جواب دیا، تاہم وہ اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ وہ کسی دورے پر گیا تھا اور رات گئے اس کی واپسی کا امکان تھا۔ میں اس

MashalBooks.com

صورت حال کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں نے احمقانہ طور پر تصور کر لیا تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی فوراً پہچان لے گا ـــــ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس نے پہلے کبھی مجھے نہیں دیکھا تھا اور اسے میری موجودگی کا قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔ اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور فرش پر دیکھنے لگی جہاں مجھے Chopar کا کھیل کندہ نظر آیا۔ اس کے بارے میں مجھے میری ماں بتایا کرتی تھی ـــــ اسے میرے نانا نے اپنی ماں یعنی میری پرنانی کے لیے خصوصی طور پر بنایا تھا۔ میں اپنے حوصلے مجتمع کرتے ہوئے ان تینوں جڑی ہوئی خواتین سے بولی: میں اس لیے ان کی منتظر ہوں کیوں کہ میں ان کی بھانجی ہوں، ان کی بہن کی بیٹی، دہلی سے آئی ہوں۔

دروازے کی کنڈی کھلی اور مجھے اندر آنے کی دعوت دے دی گئی۔ ان عورتوں میں سے ایک رانا کی بیوی ـــــ میری ممانی ـــــ اور دونوں اس کی بیٹیاں ـــــ میری ماموں زاد بہنیں تھیں۔ آج تک مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ محض میرا تخیل تھا یا واقعی ان کا رویہ دوستانہ تھا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران تھیں کیوں کہ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ میں کون ہوں ـــــ ''یقیناً تم سوبھدرا کی بیٹی ہو۔'' انھوں نے کہا۔ تمھاری شکل ان سے تھوڑی تھوڑی ملتی ہے ـــــ میری ماں جیسی شباہت؟ لیکن انھوں نے تو کبھی میری ماں کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت میں یہ سوال پوچھتے ہوئے کافی نروس تھی۔ مجھے ایک بڑے اور کسی حد تک آراستہ کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک گھنٹے تک ہم نے محتاط گفتگو کی اور اس دوران میں کوکا کولا پیا۔ کچھ دیر بعد میری دوست فرحانہ مجھے لینے آ گئی۔ میں اس کی بہن فریدہ کو جانتی تھی اور انہی کے گھر میرا قیام تھا۔

یہ اس کہانی کا بہت اچھا اختتام ہو سکتا تھا۔ ایک لحاظ سے ماموں کو گھر موجود نہ پانے میں میرے لیے ایک قسم کا احساس اطمینان تھا۔ میں سوچتے ہوئے واپس چل پڑی کہ کیا یہی وہ کام تھا جو میں نے کر لیا۔ اب میں گھر واپس جا سکتی ہوں اور سب کچھ بھلا سکتی ہوں۔ لیکن ایسا کہنا کرنے سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ ہسٹری اتنی آسانی سے آپ کو کچھ بھولنے نہیں دیتی۔

☆☆☆

پاکستان کی سرحد پار کرنا میری سوچ سے زیادہ آسان ثابت ہوا تھا۔ ویزا حاصل

کرنا تاہم ایک مشکل کام تھا۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ دہلی میں پاکستانی قونصل خانے میں دو مختلف ویزا کاؤنٹر تھے۔ ایک ان لوگوں کے لیے جنھیں وہ ''غیر ملکی'' کہتے ہیں، جب کہ دوسرا بھارتی باشندوں کے لیے تھا۔ مؤخرالذکر کاؤنٹر پر لوگوں کا رش تھا اور دھکے پڑ رہے تھے۔ وہ بہ یک وقت تمام کاغذی کارروائی پوری کرنے کی کوشش میں لگے تھے، جب کہ بیرونی جانب ایک خمیدہ کمر والا بوڑھا موقع پر تصاویر بنانے کی پیش کش کر رہا تھا۔ اس کے قریب تصویروں کی فوری ڈویلپنگ کے لیے بالٹی پڑی تھی۔ لیکن ایک بار جب آپ نے سرحد پار کر لی تو ایئرپورٹ پر ہر چیز مانوس نظر آتی ہے—— وہی ہنگامہ، وہی زبان، وہی خوشبوئیں، وہی لباس، البتہ ایک چیز جس کے لیے میں پہلے سے تیار نہیں تھی وہ تھا سرحد پار کرنے کے بعد پیدا ہونے والا جذباتی کھنچاؤ۔ میں نے محسوس کیا —— اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ میرے پاس نہیں—— لیکن گھر کو واپس آنے کا احساس ضرور تھا۔ میں نے خود سے سوال کرنا شروع کیا کہ ایسا کیوں ہے؟ میں تقسیم کے پانچ برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ مجھے تاریخ کے اس دُکھ اور صدمے کا کیا پتہ جس نے میرے والدین اور دادا، نانا کو دھوکا دیا تھا؟ مجھے یہ جگہ جو زندگی میں پہلے کبھی میں نے نہیں دیکھی تھی دہلی میں اپنے گھر سے زیادہ اپنی لگتی ہے، حالانکہ دہلی میں مَیں نے اپنی پوری زندگی گزاری تھی؟ تاریخوں اور داستانوں کا یہ عجیب خاکہ کیا تھا جس کے زیر اثر میں نے یہاں آنا ضروری سمجھا؟ اپنے ماموں کے گھر کے برآمدے میں کھڑے، شاید پہلی بار، مجھے یہ خیال آیا کہ یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ جب میں نے اپنی ریسرچ کا آغاز کیا تھا، اگرچہ یقین نہیں تھی کہ مجھے اس سے کیا ملے گا لیکن میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں جو مجھے ملا۔ میرے لیے اس حوالے سے تاریخ میں کوئی مثال بھی موجود نہیں تھی۔ یہ لوگ، یہ اجنبی جن سے میں پہلی بار عملی طور پر ملی تھی، مجھ سے ایک فیملی کی طرح برتاؤ کر رہے تھے لیکن دراصل تقسیم کی وہ سرحد اتنی گہری ہو چکی تھی کہ آپ، مذہب، سیاست، جغرافیہ اور تاریخ جس طرح دیکھیں یہ اپنا بدنما سر اُٹھاتی اور تقسیم پر حاوی ہونے کی کوششوں کا مذاق اڑاتی تھی۔ رانا ماما، جن کے گھر کے باہر اس رات میں کھڑی تھی۔ میری ماں کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں، شمالی ہندوستان کے کئی کنبوں کی طرح ہمارا خاندان بھی بٹوارے کے وقت تقسیم ہوا تھا۔ میری ماں نے، جو اس وقت کنواری تھی،

سرحد کی دوسری جانب بھارت میں جانا پسند کیا، جب کہ ان کے بھائی رانا ماما نے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ میری ماں اور دیگر اہل خانہ کا کہنا ہے کہ رانا ماما کے اس فیصلے کے پیچھے ایک محرک تھا—— وہ میرے نانا جن کا انتقال ہو چکا تھا، کی جائداد پر قبضہ اور ملکیت چاہتے تھے۔ خاندان کے دیگر تمام افراد کے چلے جانے کے بعد وہ تن تنہا جائداد کے مالک بن گئے۔ اس وجہ اور تقسیم کے بعد بعض ناممکنات کی بنا پر باقی فیملی کے ان سے رابطے منقطع ہو گئے۔ پورے 40 برس تک کسی نے ان سے کوئی رابطہ نہ کیا۔ ان کے بارے میں کچھ سنا نہ ان کے حوالے سے کوئی چیز دیکھی، یہاں تک کہ میں ان سے ملنے چلی آئی۔

☆☆☆

میں اپنی دادی، جو ہمارے گھر میں رہتی تھیں، اور والدین کی تقسیم سے متعلق سنائی کہانیاں یاد کر سکتی ہوں—— یہ لوگ اس تمام عرصے میں مختلف انداز میں رہے۔ جس طریقے کے مطابق میں نے دیگر کہانیاں ریکارڈ کیں، اسی کے تحت میں نے رانا ماما کی کہانی کا بھی اندراج کیا۔ وہ نہ صرف تقسیم کے وقت پیچھے رہ گئے تھے بلکہ اس سے بھی بُری بات یہ تھی کہ وہ مسلمان ہو گئے تھے اور مجھے شبہہ ہوا کہ ان کے اس طرز عمل نے انھیں ہمارے خاندان میں ناپسندیدہ شخص بنا دیا تھا۔ بدترین نسلی فسادات کے دوران میں ماں نے 2 مرتبہ لاہور کے خطرناک سفر کیے تاکہ اپنے اہل خانہ کو بھارت لے جا سکیں۔ پہلی بار وہ اپنے ساتھ چھوٹے بھائی بلّو اور بہن سونیا کو لے گئیں۔ دوسری مرتبہ وہ اپنی ماں اور اپنے چھوٹے بھائی رانا کو لینے گئیں۔ (ان کے والد عرصہ ہوا مر چکے تھے) لیکن انھوں نے بتایا کہ رانا نے نہ صرف ساتھ جانے سے انکار کر دیا بلکہ وہ ماں کو بھیجنے کے بھی مخالف تھے۔ انھوں نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ ماں کو محض اس لیے روکنا چاہتے تھے کیوں کہ جائداد ان کے نام تھی۔ تاہم انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ بہت جلد ماں کو بھارت بھیج دیں گے۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہو سکا۔ ایک مرتبہ جب ملک تقسیم ہو گیا، مختلف برادریوں کے لوگوں کے لیے یہ تقریباً ناممکن ہو گیا کہ وہ ''دوسرے'' ملک کا آزادانہ دورہ کر سکیں۔ ماسوائے مقتدر اور مراعات یافتہ طبقے کے چند لوگوں کے—— اور ایسے لوگوں کی اکثریت واپس اپنے گھروں کو جانے سے قاصر تھی جو عجلت میں گھر پیچھے

چھوڑ آئے تھے، دونوں طرف گہرے شکوک وشبہات پائے جاتے تھے اور سرحد کے آر پار نقل وحرکت پر پولیس اور انٹیلی جنس والے کڑی نظر رکھتے تھے۔

کچھ عرصہ تک رانا اور ان کی فیملی کے درمیان رابطہ قائم رہا لیکن ان کی مسلسل نگرانی کی جاتی۔ ان کے خطوط کھولے گئے اور کئی بار ان سے پوچھ گچھ کی گئی۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے آپس میں رابطوں کی کوشش کا سلسلہ منقطع کر دیا جو پورے 40 برس کٹا رہا۔ اگرچہ رانا ماموں میرے نانا کے گھر میں مقیم رہے، کسی نے ان سے رابطے اور انھیں خط لکھنے کی کوشش نہ کی۔ ان تمام برسوں میں کسی نے ان کی خیر خبر لینے کی زحمت نہ کی۔ 1947ء کے آس پاس میری فیملی کو یہ غیر مصدقہ اطلاعات ملیں کہ میری نانی کا انتقال ہو چکا تھا، تاہم درست خبر کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ کچھ کھونے کا گہرا احساس، خاندان، ماں، گھر، سب کچھ... اس احساس نے تلخی، مایوسی اور آخرکار ایک گوناں یکسانیت کو جنم دیا۔ شاید آخری بار ان سے 'رابطہ' اُس وقت ہوا جب ہم اپنے خاندان کے ماضی اور تقسیم کی کہانیاں بچپن میں سنا کرتے تھے۔

☆☆☆

اسی دن نصف شب کو میری دوست فریدہ کے گھر پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت ہم کافی اور نمکین/میٹھی چائے جسے پاکستانی قہوہ بولتے ہیں، پیتے ہوئے گپ شپ اور باتیں کر رہے تھے۔ ایک لمحے کو فون سن کر اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھر آئے—— اس وقت کون فون کر سکتا ہے—— اور رسیور مجھے تھما دیا—— پھر اچانک پُرجوش انداز میں بولی: یہ تمھارے ماموں کا فون ہے۔ فریدہ نے جب فون اٹھایا تو دوسری طرف ایک مردانہ آواز میں پوچھا گیا، ''میرا خیال ہے میری بیٹی آپ کے گھر میں مقیم ہے۔ براہِ کرم اسے بلا دیں، میں اپنی بچی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' جیسے ہی میں فون پر بولی، انھوں نے کہا، ''بیٹی! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟ یہ تمھارا اپنا گھر ہے، فوراً یہاں چلی آؤ اور یہیں قیام کرو۔ مجھے اپنا پتہ بتاؤ، میں ابھی آ کر تمھیں لے جاتا ہوں۔'' کوئی تمہید، کوئی خیر مقدمی کلمات نہیں، بس ایک بے تکلفی، خاندان کے بندھن کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ میں حیران رہ گئی۔

ہم نے باتیں کیں اور بحث بھی کی۔ آخرکار میں نے انھیں ٹوک دیا۔ رات

کافی گزر چکی تھی، ماموں بھی تھکے ہوئے تھے۔ میں نے کہا، ''کیا ہم صبح کے وقت ملاقات نہیں کر سکتے؟ میں اپنی دوست کے ساتھ آ جاؤں گی۔'' انھوں نے کہا، ''میں صرف ملنا نہیں چاہتا، یہ نہ سوچو کہ تم یہاں سے کہیں اور چلی جاؤ گی۔ یہ تمھارا گھر ہے جہاں تمھیں رہنا چاہیے—— اپنوں کے ساتھ۔

گھر؟ اپنے؟ میں نے سوچا۔ یہ الفاظ ان دو افراد کے درمیان بہت اجنبی تھے، جو بہ مشکل ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ کیا مجھے وہاں جا کر ان کے ساتھ قیام کرنا چاہیے؟ مجھے اس پیش کش میں کشش بھی محسوس ہوئی اور میں گومگو میں بھی تھی۔ کیسے میں اپنا سامان اُٹھا کر ایسے گھر رہنے کے لیے چلی جاؤں جن کے ساتھ رشتے داری کے باوجود میری کوئی جان پہچان نہیں تھی؟ اگلے روز میں سامان اُٹھائے بغیر وہاں چلی گئی۔ انھوں نے دیکھتے ہی سوال کیا—— تمھارا سامان کدھر ہے؟ اور پھر اس شام وہ میرے ساتھ فریدہ کے گھر آئے۔ میں نے اپنا سامان اُٹھایا اور ہم اکٹھے ہی واپس ان کے گھر چلے گئے۔ ماموں کے گھر میں ایک ہفتے تک رہی۔ اس تمام عرصے میں مجھے وہاں ایک قسم کے احساس بے وفائی کا گمان ہوا۔ میری ماں کی اپنے اس بھائی سے تعلقات بحال کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی جو ان کے نزدیک دولت کا پجاری اور سازشی تھا۔ وہ پوچھا کرتی تھیں وہ وہیں کیوں رہ گیا؟ جائداد ہتھیا لی اور ماں کا بھی بلا شرکت غیرے نگران بن بیٹھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تلخی اور ناراضی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لیکن میرے اپنے سیاسی مقصد کے حوالے سے میرا یہ دورہ کسی طرح بھی خالی از مصلحت نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن ایک بار جب میں نے اپنے ماموں کو دیکھا اور انھوں نے مجھے ''بیٹی'' کہہ کر بھی پکارا تو میرے لیے فرار ممکن نہ رہا۔ لہٰذا میں نے اس بڑی اور ویران حویلی میں ایک ہفتے تک قیام کیا اور باتیں کیں۔ یہ ہفتہ جذباتی غبار نکالنے کے حوالے سے ایک سخت ہفتہ تھا۔ اس کے طویل عرصے بعد میرے لیے اپنی زندگی کے اس اضافی باب کے حوالے سے گفتگو کرنا بہت مشکل تھا۔ مجھے یاد آتا ہے میں نے ممانی اور اپنے چھوٹے بڑے کزنوں سے باتیں کرنے، کھانے، سونے اور—— بے مقصد اِدھر اُدھر گھوم کر وقت گزرا۔ اب صرف وہی یادیں میرے ذہن میں تازہ اور شفاف موجود رہیں جن کا تعلق میری ماموں جان سے گفتگو سے تھا۔

میں نے ان سے پوچھا: ''تقسیم کے وقت آپ باقی بہن بھائیوں کے ساتھ کیوں نہیں گئے تھے۔ کیوں... آپ نے پیچھے رہنے کو ترجیح دی؟'' ''ہوں،'' وہ بولے، اصل میں دیگر کئی لوگوں کی طرح انھیں بھی تقسیم کے وقت ایسے حالات کی توقع نہیں تھی۔ ''ہم میں سے کئی لوگوں کا خیال تھا، ہاں... کہ کچھ تبدیلی ہو گی۔ لیکن ہمیں آخر کیوں جانا چاہیے تھا؟'' غالباً انھوں نے سوچا تک نہ تھا کہ سیاسی فیصلوں سے ان کی زندگی پر کوئی اثر پڑے گا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب انھیں حقیقت کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ مقام آ چکا تھا جہاں سے دراصل واپسی ممکن نہیں تھی۔ ''اس وقت میں بہ مشکل 20 سال کا تھا اور میری تعلیم بھی بہت کم تھی۔ میں انڈیا جا کر کیا کر لیتا؟ میری کوئی کوالی فی کیشن نہیں تھی۔ کوئی نوکری نہیں تھی، کوئی بھی سفارش نہیں تھی۔'' تاہم میرے خیال میں خاندان کے لوگ بھارت میں تھے اور یقیناً ان میں سے کوئی ایک ماموں کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ انھوں نے کہا سوائے تمھاری ماں کے—— کسی نے مجھے ساتھ لے جانے کی کوشش نہ کی، لیکن وہ بیمار اور اکیلی پہلے ہی دو بہن بھائی اپنے ساتھ لے جانے کی ذمہ داری لے چکی تھی اور میری نانی؟ میں نے کرب کے احساس کے ساتھ پوچھا۔ انھوں نے کیوں نانی کو ساتھ رکھنے پر اصرار کیا؟ میرا خیال تھا کہ ان کے پاس اس کی قابل معافی معقول وجہ نہیں ہو گی۔ انھوں نے جو وضاحت کی، میں نے اس پر یقین نہیں کیا۔ ''مجھے پریشانی تھی کہ تمھاری ماں کو ایک بوڑھی ماں کا اضافی بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ اسی طرح جیسے مجھے خود اپنی ذات کے بارے میں تشویش لاحق تھی، لہٰذا میں نے سوچا کہ میں اپنا حق ادا کروں گا اور اپنی ماں کی دیکھ بھال کروں گا۔''

میری نانی دیاونتی کا انتقال 1956ء میں ہوا۔ پہلی بار ہمارے خاندان کو اس کا اس وقت علم ہوا جب 1987ء کو میں رانا ماما کے گھر آئی۔ اس سے قبل برسوں تک ہم سمجھتے رہے کہ نانی جو پاکستان میں رہ گئی ہیں وہ غالباً 1949ء، 1952ء، 1953ء، یا شاید اس سے پہلے کہیں انتقال کر چکی تھیں۔ لیکن اب پتہ چلا کہ وہ 1956ء تک حیات رہیں، یعنی تقسیم کے 9 برس بعد تک۔ اس دوران میں ان کے 8 میں سے 7 بچے سرحد کے اس پار بھارت میں اور ان میں سے بھی زیادہ تر دہلی میں مقیم رہے۔ فضائی رستے سے سفر کریں تو دہلی لاہور سے ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ان میں سے کسی کو کچھ پتہ نہیں

تھا۔ مجھے لگا کہ اس بات کو معاف کرنا ممکن نہیں۔

جس انداز میں رانا ماما نے بات کی، پاکستان میں مقیم رہنے کی چوائس دراصل کوئی چوائس نہیں تھی۔ حقیقت میں دیگر کئی لوگوں کی طرح ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے لیے یہ راستہ چن نہیں رہے بلکہ انتظار کر رہے تھے کہ مناسب وقت آنے پر کوئی فیصلہ کریں گے لیکن تبدیلی مذہب کا راستہ چننے کی آخر کیا وجہ تھی؟ کیا اب وہ مسلمان ہیں؟ کیا پہلے بھی تھے؟ ان کے نزدیک مذہب کے کیا معنی ہیں... آخرکار دونوں ملکوں کی تخلیق کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ مذہب کو ہی سمجھا جاتا ہے اور عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا—— جس میں کچھ سچائی بھی ہے—— کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو ''دوسرا'' مذہب قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا، لیکن رانا ماما؟

''مجھے کسی نے کچھ کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ لیکن اس لحاظ سے کہ شاید کوئی اور چارہ کار نہیں تھا، میرے پاس یہاں رہنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ میں مذہب تبدیل کر لوں، لہٰذا میں نے ایسے ہی کیا۔ میں نے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کر لی۔ مذہب تبدیل کر لیا اور اپنا نام بھی اسلامی رکھ لیا۔

لیکن کیا وہ واقعی مسلمان ہوئے؟ لیکن کیا اس تبدیلی نے عقیدے سے جنم لیا یا یہ محض سہولت کے پیش نظر اختیار کی گئی؟ میرے لیے پوری سچائی سے اس سوال پر ماموں کا ردعمل دینا مشکل ہے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ کیا میں وہ کچھ لکھ سکتی ہوں جو انھوں نے بتایا ہے تو وہ بولے، ''بالکل، جو تم چاہتی ہو لکھو، میری زندگی مزید بدتر نہیں ہو سکتی۔'' میرا اپنا خیال ہے کہ وہ اپنی بات کے مضمرات سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے لہٰذا میں نے وہی کیا جو میں نے سوچا تھا۔ ان حصوں کو میں نے چپ ہی رہنے دیا جن کو خاموش رکھنے کی ضرورت تھی۔ اس کا میں نے کوئی جواز نہیں گھڑا، ماسوائے یہ کہ میں اس دیومالا جسے دانش وارانہ دیانت کہتے ہیں، کے نام پر کچھ کہوں، یا کچھ بے نقاب کرنے کی کوشش میں رانا ماما کو نقصان پہنچاؤں۔

میرے ایک سوال پر ماموں نے جواب دیا، ''ایک بات میں تمھیں ضرور بتاؤں گا۔ ان چالیس برسوں میں ایک رات بھی ایسی نہیں گزری جس میں مَیں اپنے فیصلے پر تاسف کیے بغیر سو سکا ہوں، ایک بھی رات نہیں۔'' میں ہڈیوں تک منجمد ہو کر رہ

گئی۔ وہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ ان کی بات کا مطلب کیا ہے؟ اگر یہ بات تھی تو وہ ان 40 برسوں میں کس حالت میں زندہ رہے؟

''میری بچی تم دیکھتی ہو! تبدیلی مذہب بہرحال قابل معافی عمل نہیں ہوتا۔ انھوں نے وہ بات دُہرائی جو آنے والے دِنوں میں کرنے سے انھوں نے احتراز کیا۔ وہ بولتے رہے، تمھارا ماضی تمھارا تعاقب کرتا ہے۔ تمھیں شکار کرتا ہے۔ میرے لیے یہ صوت حال زیادہ بدترین ہے کیوں کہ میں پہلے والی جگہ پر ہی مقیم رہا، حتیٰ کہ آج بھی جب میں بازار میں جا رہا ہوتا ہوں میں اکثر لوگوں کی سرگوشیاں سنتا ہوں، 'ہندو، ہندو' نہیں، بالکل نہیں، تم نہیں جان سکتیں، وہ تبدیلی مذہب کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔

میں یہ جاننے کے لیے بھی متجسّس تھی کہ رانا ماما نے بھارت آ کر اپنے خاندان سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ اگر انھیں اپنے خاندان کو کھونے کا اتنا گہرا احساس تھا تو انھوں نے دیگر لوگوں کی طرح اُنہیں تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ یہ بات تو تسلیم کی جا سکتی ہے کہ شروع شروع میں لوگوں کے لیے سرحد کے آر پار جانا مشکل تھا، لیکن بعد میں ایسے دور بھی آئے کہ حالات معمول پر آ گئے۔ لیکن ماموں کے پاس ان باتوں کا بھی جواب تھا: ''میں کیسے وہاں جاتا؟ کہاں جاتا؟ میری فیملی، میری بہنیں جانتی تھیں میں کہاں ہوں، لیکن مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ اور پھر بھارت میں ہندو سے مسلمان بننے والے اور اپنے ہندو رشتہ داروں کو ڈھونڈنے والے پر کون یقین کرتا؟ اور صرف یہی ایک گھر ہے جسے میں جانتا تھا۔''

اور ابھی تک ان کے نزدیک گھر کی تعریف کئی مختلف حوالوں سے تھی۔ جب سے ٹی وی آیا تھا، رانا ماما کوشش کرتے کہ ہر روز بھارت کی خبریں سنی جائیں۔ جب کبھی پاکستان اور انڈیا میں کرکٹ میچ کھیلا جاتا، وہ ضرور دیکھتے اور سب سے چھپ کر دل میں بھارت سے لگاؤ کا اظہار کرتے۔ اکثر جب بھارت کسی اور ملک سے کھیلتا وہ بھارت کی طرف ہوتے۔ کچھ عرصہ قبل وہ چھوٹی سکرین پر بھارتی صابن کی مشہوری بھی دیکھتے رہے اور اگرچہ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ انھیں صرف لاہور میں اپنے گھر کا پتہ تھا۔ یہ انڈیا ہی تھا جسے وہ اپنے گھر سمجھتے تھے۔ پنجابی زبان میں ایک لفظ ہے جسے اکثر پنجابی بولتے اور سمجھتے ہیں، ''وطن''۔ اس لفظ کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔ اس کا مطلب،

MashalBooks.com

گھر، ملک، زمین—— سب کچھ یا ان میں سے کوئی ایک ہوسکتا ہے۔ جب ایک پنجابی مرد یا عورت اپنے وطن کی بات کرتی ہے تو آپ جانتے ہیں وہ کسی نا قابل تشریح چیز کا حوالہ دے رہی ہوتی ہے۔ کسی جگہ سے خاص نسبت، لگاؤ...

اکثر پنجابیوں کے نزدیک، جنھیں تقسیم کے عمل سے گزرنا پڑا، وطن وہ ہے جہاں وہ پہلے رہتے رہے۔ رانا ماما کے لیے، اگر اسے محتاط غلط بیانی کہوں تو، پاکستان میں اپنے کنبے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی انڈیا ان کا وطن بن گیا۔ وہ ملک جہاں وہ بہت تھوڑی دیر کے لیے صرف ایک مرتبہ گئے۔ ان کے بچوں اور خاندان کے لیے یہ معاملہ بہت عجیب تھا۔ انھیں سمجھ نہیں آ سکی تھی کہ یہ خفیہ وابستگیاں کیا ہیں اور ماموں کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ سوچتے وہ کتنی عجیب کہانیاں سناتے ہیں۔ وہ کون لوگ ہیں۔ ان کے رشتہ دار—— ہندو—— سرحد کے پار۔ دونوں چھوٹی لڑکیوں نے ایک مرتبہ مجھے بتایا، ''آپا، تم بہت اچھی ہو، بالکل ہمارے جیسی، لیکن ہم سوچتے تھے کہ ''وہ'' بہت خوف ناک لوگ ہیں۔'' اور ان بے چاریوں کو کون الزام دے سکتا تھا؟ انھیں اپنی زندگی میں جن چند ہندوؤں سے واسطہ پڑا تھا وہ کچھ دور کے رشتہ دار تھے اور ایک مرتبہ ان سے ملنے آئے تھے۔ تاہم انھوں نے قدامت پسند ہندوؤں جیسا برتاؤ کیا اور اکثر ہندوؤں کی طرح انھوں نے مسلمانوں کو ''اچھوت'' ہی سمجھا۔ وہ اپنا کھانا خود تیار کرنے پر اصرار کرتے اور گھر والوں کا پکایا کچھ نہ کھاتے۔ وہ کئی لحاظ سے اپنے میزبانوں کو ''کم تر'' ہونے کا احساس دلاتے تھے۔ بیر بہادر سنگھ، جس کا انٹرویو اس کتاب میں شامل ہے، نے مجھے بتایا کہ ہندو اور سکھ مسلمانوں سے کس طرح برتاؤ کرتے تھے:

''ہمارے تعلقات اتنے اچھے تھے کہ ہم ایک دوسرے کو اپنے ہاں فنکشن پر بلاتے، مسلمان ہمارے گھروں میں آتے تو ہمارا پکایا کھانا کھا لیتے۔ لیکن ہم ان کے گھروں میں کچھ کھانے سے گریز کرتے اور یہ ایک بُری بات تھی، جس کا مجھے اب احساس ہوتا ہے۔ جب مسلمان ہمارے گھر آتے تو ہم نے ایک کونے میں برتن الگ رکھے ہوتے تھے، انھیں کہا جاتا وہ اُٹھاؤ اور کھا لو۔ پھر وہ خود ہی برتن دھو کر وہیں رکھ دیتے۔ یہ بہت ہَول ناک چیز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان بن گیا۔ اگر ہم ان کے گھروں میں جاتے اور ان کی شادیوں یا دیگر تقریبات میں شرکت کرتے تو وہ دل سے

ہماری عزت و احترام کرتے۔ ہمیں پکانے کے لیے گھی، دال، آٹا، سبزیاں، چکن، حتیٰ کہ مٹن دیا جاتا۔ یہ سب کچا ہوتا، لیکن دوسری طرف ہمارا ان کے ساتھ رویہ اتنا تضحیک آمیز ہوتا کہ مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایک مہمان ہمارے گھر آتا ہے اور ہم اسے کہتے ہیں، وہ برتن اُٹھاؤ اور انھیں صاف کرو، اور اگر میری ماں اور بہن کو انہیں روٹی دینا ہوتی تو وہ روٹی دور سے ان کی طرف پھینک دیتی، مبادا ان کا ہاتھ برتن سے چھو جائے اور پلید ہو جائے.. ہم نیچ ذاتوں سے اس طرح سلوک نہیں کرتے تھے جس طرح ہندو اور سکھ مسلمانوں سے برتاؤ کرتے تھے۔

☆☆☆

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، رانا ماما اپنی ذات میں محصور ہوتے چلے گئے۔ ان کی زندگی اپنے ذہن تک یوں محدود ہو گئی کہ کسی کو فوری طور پر پتہ نہ چلتا۔ لیکن ہر کوئی، بالخصوص ان کے اہل خانہ مشکوک ضرور ہو گئے۔ ان کے بچے—— خاص طور پر ان کی بیٹیاں اور بہویں ان کا بہت خیال رکھتیں لیکن ان سب کو رانا ماما کے ذہن میں رونما ہونے والی چیزوں سے خوف محسوس ہوتا، اور جتنا انھیں اپنی بیٹیوں سے پیار ملا، مجھے یوں لگا انھیں بیٹوں سے بہت کم محبت ملی۔ ان کے بیٹوں کی اصل دلچسپی صرف جائداد میں تھی۔ شاید اگر کوئی ایک فرد جو بعض معنوں میں ماما کے ذہن کو سمجھ سکتا تھا تو وہ ان کی بیوی تھیں۔ مامی کو بہت جلد اس بات کا ادراک ہو گیا تھا اور میں نے سوچا، وہ ہرگز اپنے بچوں کو شناخت کے اس بحران سے نہیں گزرنے دیں گی جس سے ماموں کو گزرنا پڑا تھا۔ ان کی پرورش ایک اچھے مسلمان کے طور پر کی گئی۔ لڑکیاں پردہ کرتیں، گھر میں مُلّا نے آ کر انھیں قرآن کی تعلیم دی۔ گھر کے کم عمر افراد کے درمیان، جنھیں تقسیم سے متعلق کچھ یاد نہیں رانا ماما اپنے خاندان کی کئی کہانیوں، دوستوں اور گھر کی داستانوں سمیت ایک باپ کے طور پر موجود رہے لیکن پھر بھی اجنبی رہے۔ بعض لحاظ سے اس بات نے انھیں گھر والوں سے مزید دور کر دیا اور وہ مزید تنہائی کا شکار ہو گئے۔ جب کہ دوسرے لوگوں میں ان کی مذہبی حیثیت مشکوک سمجھی گئی۔ ان کی حالت ایک عام پنجابی گھرانے کے کسی باپ کے مقابلے میں زیادہ قابل رحم تھی۔ دوسری طرف ان کے کنبے کے کئی افراد کے نزدیک وہ جائداد کے غیر آرام دہ مالک تھے جو جتنی جلدی رُخصت ہو جاتے

بہتر تھا۔

میں یہ نہیں جان سکی کہ وہ اس انداز سے کیسے زندہ رہ سکے تھے۔ کیا کوئی ایسا فرد تھا جس سے وہ دل کا حال کہہ سکتے تھے؟ انھوں نے اب مجھے بتایا کہ ایسا کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بھلا اتنی گہری اور تکلیف دہ بات کس سے کر سکتے تھے؟ آخر کس سے؟ کوئی بھی نہیں، کوئی نہیں جو انھیں سمجھنے کی کوشش کرتا۔ تاہم انھوں نے مجھے جو باتیں بتائیں وہ نہ کہنا بہتر تھا۔ پھر آخر کیوں کر وہ یہ مجھے بتا رہے تھے؟ میں کون تھی؟ ایک دن جب ہم شام کو گفتگو میں مصروف تھے اور اس دوران میں کھانا کھانے کے بعد چائے پی رہے تھے کہ انھوں نے مجھے تقسیم کے بعد اپنی زندگی کے واقعات سنانا شروع کیے۔ مجھے ایک قسم کے بوجھ اور دباؤ کا احساس ہوا اور میں بول پڑی اور پوچھا، کیوں؟ آخر کیوں آپ مجھ سے یوں باتیں کر رہے ہیں؟ آپ مجھے جانتے تک نہیں، اگر مجھے بازار میں ملیں تو میں بھی آپ کے لیے ایک اجنبی ہوں گی۔ ہاں ہماری زبان ایک ہے، ہم ایک جیسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، لیکن ان چیزوں سے قطع نظر... انھوں نے ایک طویل لمحے کے لیے میری جانب دیکھا اور بولے، ''میرے بچے ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ میں اپنے خون سے مخاطب ہوں۔'' مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں نے احتجاجاً کہا، ''آپ کا اپنے افراد خانہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آپ کا خون یہ ہے، میں نہیں۔''

''نہیں،'' وہ بولے، ''ان کے لیے میں ایک اجنبی رہا۔ تم... تم سمجھ رہی ہو ناں میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں! کیوں کہ تم اس بات کا کھوج لگانے کے لیے یہاں آئی ہو، تم جانتی ہو، اگر اور کچھ نہ ہو تو بھی میں جانتا ہوں تمھیں میرا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔''

اور کچھ حوالوں سے یہ بات سچ بھی تھی۔ میں جانتی تھی اور مجھے حیرانی ہونا شروع ہوئی۔ نہ جانے کتنے لوگ اسی چیز سے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے جسے ہم تاریخ میں تقسیم کے نام سے جانتے ہیں۔ نہ جانے کتنے اپنی خاموشیوں کے ساتھ جی رہے ہیں۔ کتنوں کو کچھ کہنے کا موقع ملا اور کیوں ہم سب (جنھوں نے سکول میں انڈیا کی ماڈرن ہسٹری پڑھی) مانتے ہیں کہ تقسیم ہند آزادی کے ساتھ ہی ہوئی۔ ہمیں اس رُخ کا کیوں پتہ نہیں؟ یہ داستانیں سربستہ کیوں ہیں؟ کیا تاریخ میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں؟

MashalBooks.com

☆☆☆

جب میں پہلی بار پاکستان کا چکر لگا کر انڈیا واپس گئی، میں سرحد کے اس طرف سے کئی لوگوں کے پیغامات اور تحائف سرحد کی دوسری جانب لے کر گئی۔ رانا ماما نے اپنی تمام بہنوں کے نام طویل خط لکھا، (اس وقت ان کا بھائی مر چکا تھا) پہلے پہل تو ماں کے لیے اپنی تلخیوں اور ناراضگیوں پر قابو پا کر خط دیکھنا مشکل ہو گیا۔ ان کی تمام پانچوں بہنیں ہمارے گھر میں جمع ہوئیں اور قطار میں بیٹھ گئیں۔ وہ کچھ کھنچی کھنچی اور متجسّس بھی تھیں۔ پھر کسی نے خط اُٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر باری باری سب نے اسے پڑھا۔ یادوں کا تبادلہ ہوا تو آنسوؤں کی جھڑیاں بھی لگ گئیں۔ پھر اپنی اپنی کہانیاں سناتے ہوئے کچھ مسکراہٹیں بھی بکھر گئیں۔

ہمیں بتاؤ، انھوں نے مطالبہ کیا، بتاؤ ناں! ہمارا گھر کیسا لگ رہا تھا۔ کیا امرود کا درخت اب بھی موجود ہے؟ Chopar کے کھیل کے ساتھ کیا ہوا، گھر کے عقب میں اب کون رہتا ہے؟... سینکڑوں سوال چل رہے تھے۔ میں نے ان سب کا جواب دینے کی کوشش کی—— مگر شاید کامیاب نہ ہوئی۔ میں انھیں کیسے بتاتی کہ فلاں کمرے میں کون ٹھہرا ہے اور گھر میں کیا تبدیلیاں آئی ہیں، جب کہ میں نے گھر کو اصلی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ ماموں کا خط بار بار پڑھا گیا، چھوا گیا، سونگھا گیا، اس کے ساتھ ساتھ رویا اور ہنسا گیا۔ اچانک میری ماں اور ہماری خالاؤں کا سرحد کے اس پار ایک ناتا قائم ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے ماموں سے رابطہ بحال کر لیا۔ خط لکھے گئے۔ میں کئی بار پاکستان گئی اور ان سے ملی۔ ایک مرتبہ انھوں نے میری ماں کو خط لکھا: ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں اروشی کو پنجرے میں بند کر کے اپنے پاس رکھ لوں۔'' اور ماں نے مجھے کہا کہ میں ان کی (ماموں کی) زندگی میں حقیقی تبدیلی لائی ہوں، لیکن جیسی تبدیلی ان کی زندگی میں آئی ویسی ہی میرے اندر بھی رُونما ہوئی۔ کیوں کہ انھوں نے مجھے اس راستہ پر گام زَن کر دیا جہاں سے ہٹنا مشکل تھا۔

لیکن پُرانی ناراضگیاں اتنی جلدی ختم نہیں ہوتیں۔ یہاں بھی زیرِ سطح کئی چیزیں ابھی باقی تھیں جنھیں ہم قابو نہیں کر سکتے۔ ایک بار جب میں ان سے ملنے جانے والی تھی میری ماں نے مجھے کہا، اسے پوچھنا... اس سے پوچھو، کیا اس نے میری ماں کو

دفن کیا یا اس کی چتا جلائی؟ میں نے صدمے کی کیفیت میں ان کی طرف دیکھا... ان کے نزدیک مذہب کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی... اگرچہ وہ کٹر مذہبی نہیں تھیں لیکن مذہب کے حوالے سے ان میں برداشت کم تھی۔

''آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' میں نے ان سے کہا۔ ''بس تم اس سے صرف پوچھنا،'' انھوں نے عجلت میں کہا، اور میں نے پوچھ ہی لیا۔

ماموں نے بتایا، ''یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ پاکستان میں رہتیں اور اپنا اصل نام قائم رکھتیں؟ میرے لیے ان کے مذہب کی تبدیلی ضروری تھی۔ ان کا نام عائشہ بی بی رکھا گیا اور انھیں دفن کیا گیا۔''

مجھے اکثر یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ تقسیم کے 9 برس بعد تک میری نانی کو دو دُنیاؤں میں کس طرح خاموشی سے رہنا پڑا ہوگا۔ کیا وہ حیران نہیں ہوتی تھیں کہ ان کے بچے کہاں چلے گئے؟ کیا وہ سوچتی تھیں کہ وہ سب انھیں تنہا چھوڑ گئے ہیں؟ کیا انھیں پتہ تھا کہ ہوا کیا تھا؟ دیاونتی ــــ جس کے معنی رحم کرنے والا ہیں ــــ کیا واقعی خوش بخت نام تھا۔ وہ اولاد کی دولت سے مالا مال تھیں ــــ ان کے حیات بچوں کی تعداد 9 تھی۔ 6 بیٹیاں اور 3 بیٹے ــــ اور ایک شوہر جن کی میڈیکل پریکٹس کامیاب تھی۔ ان کے پاس خوش رہنے کی معقول وجوہات تھیں۔ پھر اچانک المیے نے ان کی طرف رُخ کرلیا۔ ان کے بڑا بیٹا وِکرم ایک روز تربیتی پرواز کے دوران میں طیارہ کریش ہونے سے ہلاک ہو گیا۔ میری ماں بتاتی ہے، اس کے بعد نانی شکست خوردہ سی ہو کر ایک قسم کے خول میں بند ہو گئیں۔ ہاں دیگر بچوں کے لیے کھانا پکاتے اور ان کی دیکھ بھال کرتے کبھی کبھار وہ اس سے باہر بھی نکل آتیں۔ پھر دوسرا سانحہ ہوا۔ ان کے میاں بیمار ہوئے اور مر گئے۔ دیاونتی نے ایک بار پھر داخلی دُنیا میں پناہ لے لی۔ جب تقسیم کا وقت قریب آیا تو امکانات یہ ہیں کہ دیاونتی اس سے آگاہ نہیں ہوگی کہ کیا ہونے والا ہے۔ تاہم اندر اور باہر کی دُنیاؤں کے اس سفر میں ان سے وہ چیز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رُوٹھ گئی جسے ہم ''ذہنی آسودگی'' کہتے ہیں۔ کیا وہ اپنے کنبے کا سوچ کر حیران ہوتی ہوں گی؟ وہ کس سے پوچھ سکتی تھیں؟ اپنی نئی شناخت پر ان کے کیا احساسات ہوں گے؟ کیوں کہ میری ماں اکثر کہتی تھیں کہ تمھاری نانی ایک ''کٹر ہندو'' تھیں ــــ لیکن ان کا عقیدہ انتہا پسندی اور

تعصب پر مبنی نہیں تھا۔ وہ ایک سچی عقیدت مند تھیں جو روزانہ پوجا کر کے اور روزے رکھ کر سکون محسوس کرتی تھیں۔ ایک ہی رات میں عقیدہ اور مختلف روٹین اختیار کرنے کی انھوں نے کیا قیمت ادا کی ہوگی۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کیا اس سے ان کی اجنبیت میں مزید اضافہ ہوا ہوگا۔ اپنی ذات میں کھو جانے کی شدت بڑھی ہوگی یا پھر انھیں ایک قسم کی سرد، شفاف مگر الٹ آسودگی کا منہ دیکھنا پڑا۔ انھوں نے یہ جھوٹ مرتے دم تک قبول کرنا سیکھ لیا تھا؟ ان 9 برسوں میں ان کے ساتھ کون تھا؟ کیا تاریخ دیاونتی کی زندگی اور موت کی جواب دہ ہوگی؟

☆☆☆

تقسیم ہند کے نتیجے میں 12 ملین (ایک کروڑ 20 لاکھ) افراد بے گھر ہوئے اور تقریباً 10 لاکھ موت کا شکار ہو گئے۔ 75 ہزار عورتوں سے زیادتی کی گئی۔ اغوا ــــ یا یرغمال بنایا گیا۔ یا پھر ''دوسرے'' مذہب کے مردوں نے انھیں حاملہ کر ڈالا۔ ہزاروں خاندان بٹ گئے۔ گھر جلائے گئے اور تباہ کر دیے گئے۔ گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ شمالی ہند کے اکثر بڑے شہروں کے طول و عرض پر مہاجر کیمپ لازمی حصہ بن گئے۔ لیکن نصف صدی گزرنے کے بعد اس کی کوئی یادگار، کوئی یاد نہیں ما سوائے مختلف خاندانوں میں اجتماعی یادیں جنھیں پہلے سنبھالا گیا تھا اور جو اَب تیزی سے مر رہی ہیں۔

جب میں نے ریسرچ شروع کی تو بعض کہانیاں اتنی عجیب و غریب تھیں کہ ان پر یقین کرنا مشکل تھا۔ ہم نے بارہا یہ سنا کہ سرحد کے دونوں طرف کئی دیہات میں ہزاروں عورتوں نے کنویں میں کود کر جان دے دی ــــ یا انھیں زبردستی کنوؤں میں دھکیل دیا گیا کیوں کہ انھیں زبردستی ساتھ لے جانے، اغوا، زیادتی اور تبدیلی مذہب پر مجبور کرنے کا خوف تھا۔ یہ بات کچھ عجیب لگتی ہے۔ کیا مذہب کی کشش اتنی شدید ہو سکتی ہے کہ لوگ ــــ بالخصوص خواتین ــــ اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیں؟ اور پھر میری ملاقات بیر بہادر سنگھ کی ماں بسنت کور سے ہوئی۔ 60 سالہ بسنت کور مضبوط قد کاٹھ کی لمبی عورت ہے اور مارچ 1947ء میں وہ اس وقت گاؤں ٹھوا خالصہ میں تھی جب یہ فیصلہ کیا گیا کہ عورتیں کنوؤں میں کود جائیں گی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے 90 عورتوں کو مسلمانوں کے خوف سے کنویں میں چھلانگ لگاتے دیکھا۔ اس نے خود بھی چھلانگ لگائی لیکن پانی کم

ہونے کی وجہ سے بچ گئی۔ اس نے کہا: ''اس کی مثال ایسی ہے کہ جب آپ تندور میں روٹیاں لگائیں اور وہ بھر جائے تو اوپر والے حصہ میں لگی روٹیاں کچی رہ جاتی ہیں اور انھیں باہر نکال لیا جاتا ہے۔ اس طرح کنواں بھر گیا اور ہم نہ ڈوب سکیں... جو مر گئیں، سو مر گئیں اور جو زندہ بچ گئیں انھیں باہر نکال لیا گیا...

اسی طرح اس کے بیٹے بیر بہادر سنگھ نے اپنے باپ کو اس کی بہن قتل کرتے دیکھا۔ اس نے فخریہ انداز میں یہ واقعہ سنایا۔ اسے اپنی بہن کی جرأت اور ''شہادت'' پر ناز تھا کیوں کہ وہ سکھ مذہب کے دیگر شہیدوں سے پیچھے نہیں رہی تھی۔ پہلی بار میں خاندان کے اندر ہلاکتوں کا اس وقت سن کر چونکی تھی جب امرت سر میں فلم ''اے ڈویژن آف ہارٹس'' کی تیاری کے دوران میں میری ملاقات منگل سنگھ سے ہوئی۔ وہ پہلا موقع تھا جب میں نے سنا کہ گھر کے مرد اپنے ہی بچوں اور عورتوں کو مار دیتے ہیں۔ منگل سنگھ نے بتایا کہ اس نے کس طرح اپنے دو بھائیوں کے ساتھ اپنے کنبے کے 17-ارکان کو مارنے کا فیصلہ کیا— اس نے لفظ ''شہید'' استعمال کیا تھا۔ ''ہمیں یہی فیصلہ کرنا چاہیے تھا، بصورتِ دیگر ان سب کو تبدیلی مذہب پر مجبور کر دیا جاتا۔'' یہ ''فرض'' ادا کرنے کے بعد منگل سنگھ سرحد پار کر کے امرت سر چلا آیا اور نئی زندگی کا آغاز کیا۔ جب میں اس سے ملی تو ان تینوں بھائیوں میں سے صرف وہی زندہ بچا تھا۔ یہاں اس کا نیا خاندان تھا۔ بیوی، بچے، پوتے، پوتیاں۔ جو سب اس کی کہانیاں سنتے اور اسے مسترد کر دیتے۔ وہ مجھ سے بار بار پوچھتا تم یہ سب کچھ کیوں جاننا چاہتی ہو، اس کا مقصد کیا ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ میں جاننا چاہتی ہوں کہ آپ نے دکھ، نقصان اور جرم کے احساس سے کیسے نجات پائی؟ اس نے کہا: ''بھوک نے تمام دکھ اور صدمے کے احساسات مٹا دیے، سمجھیں؟ جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو دُکھ تکلیف کہاں باقی رہ جاتی ہے؟

☆☆☆

تم یہ کچھ کیوں جاننا چاہتی ہو؟ یہ وہ سوال ہے جو مجھ سے بار بار پوچھا گیا— جن لوگوں کا میں نے انٹرویو کیا، یا جنھیں میں نے اپنے کام کے بارے میں بتانے کی کوشش کی وہ یہی استفسار کرتے رہے۔ تقسیم ہند پر کام کا آغاز کرتے ہوئے دو یا تین

بار میں نے حوصلے مجتمع کیے اور تحقیقی اداروں میں کئی مقالے دیکھے۔ میں بعض پریشان کن سولات شیئر کرنا چاہتی تھی: مثال کے طور پر کیوں تاریخ کے عام حوالے تقسیم کی تاریخ کے مخفی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں کامیاب نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے تجربات سے یہ اندازہ کیوں نہیں لگایا جا سکا کہ انھوں نے اس بھارت جسے آج ہم جانتے ہیں، کو موجودہ شکل میں ڈھالنے میں کیا کردار ادا کیا؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ مؤرخ جانتے تھے یہ داستان دُکھ اور درد میں اتنی گوندھی ہوئی ہے کہ اس پر کچھ لکھنے سے پہلے ہی الفاظ پگھل جاتے ہیں؟ کیوں کہ کئی لحاظ سے یہ کہانی کئی لوگوں سے جڑی ہوئی ہے اور ہمارے کئی خاندان تقسیم کے مہاجرین ہیں۔ میں یہ سمجھنا چاہتی تھی کہ ان کہانیوں کو میں کیسے پڑھوں جنھیں اب میں سن رہی تھی۔ مجھے علم تھا، خود کو ایک مورخ سمجھے بغیر، میں مشکل سے دوچار ہوئے بغیر اس سے عہدہ برأ نہیں ہوسکتی تھی۔ مثال کے طور پر کیا میں سنائی گئی کہانیوں میں بتائے گئے ''سچ'' پر انحصار کرسکتی تھی؟ اتنے برس گزرنے کے بعد کتنے لوگ ان یادوں پر یقین کرسکیں گے؟ کہانیاں بیان کرنے والوں کے نزدیک میں محض ایک سامع تھی اور انھیں ایک بار پھر سنانے کے تجربے سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ میں جانتی تھی میرا مڈل کلاس سے تعلق، ایک عورت، ایک پنجابی اور شاید آدھا سکھ ہونا لوگوں کو کچھ بتانے پر مائل کرے گا۔ پھر مجھے لوگوں کی یادوں سے انصاف کیسے کرنا چاہیے؟ اکثر انٹرویوز سے اُبھرنے والی تلخیوں، غصے، مایوسی اور نسلی احساسات سے میں خوف زدہ ہو جاتی۔ مجھے اس جمع ہونے والے مواد سے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا ایک تاریخ دان کی حیثیت سے یہ مجھ پر واجب تھا کہ اس مواد کو ایمان دارانہ طور پر بیان کروں یا ایک سیکولر انڈین کے طور پر مجھے یہ احتیاط کرنا چاہیے کہ میں دیکھوں میں نے کیا چیز منظر عام پر لانی ہے اور کیا نہیں لانی؟ ایک اور سوال جو مسلسل میری ضد بنا رہا وہ یہ تھا: کیا مجھے اس صورت میں ان انٹرویوز کو سامنے لانا چاہیے، اگر یہ صرف تاریخ کے ایک پہلو کا احاطہ کرتے ہوں؟ کیا اس قسم کے مواد کا کسی ایک دوسری طرف سے غلط استعمال نہیں ہوسکتا ہے؟ آج تک میں یہ اُلجھن نہیں حل کرسکی، میں ایمان دار ہونے اور محتاط ہونے کی خواہش کے درمیان ٹوٹ پھوٹ گئی اور ہر بار مجھ سے پوچھا گیا: کیوں، آخر کیوں میں یہ کر رہی ہوں؟ یہ سوال ایک اور وجہ سے بھی اہمیت اختیار کر گیا: وہ اس طرح کہ دونوں

ملکوں میں سرحد کھینچی گئی تھی اور میرے لیے یہ تقریباً ناممکن تھا کہ میں پاکستان جا کر ریسرچ کروں حتیٰ کہ انٹرویو کر سکوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرا تمام کام یک طرفہ رہا — اور اب تک یک طرفہ ہے۔ میں جانتی تھی یہ درست نہیں تھا۔ میں نہیں جانتی تھی — اور اب بھی نہیں جانتی — میں کیا کرنا چاہ رہی تھی۔ کیا مجھے اپنا ارادہ ترک کر دینا چاہیے تھا؟ ان کے جوابات اتنے آسان نہ تھے؟ تاہم آخر میں مَیں نے فیصلہ کیا اگر اس کام کی میرے نزدیک اہمیت ہے تو مجھے یہ کر گزرنا چاہیے۔ مجھے ارادہ ترک نہیں کرنا چاہیے۔

☆☆☆

حالیہ چند برسوں میں پاکستان اور بھارت کی سرحد سے آمد و رفت نسبتاً آسان دکھائی دی۔ یہی وجہ ہے کہ میں پاکستان کئی مرتبہ آئی تا کہ رانا ماما کے ساتھ اپنے تعلقات کو مضبوط بناؤں۔ ایک مرتبہ جب ان کی ایک بیٹی (چھوٹی سے بڑی) کی شادی ہو رہی تھی میں اپنے ساتھ اپنی ماں اور بڑی خالہ کو لے آئی۔ جب ہم نے جانے کا پروگرام بنایا تو ہمیں اس میں زبردست جوش محسوس ہوا کیوں کہ یہ سفر گویا کسی نامعلوم منزل کی جانب تھا۔ دونوں بہنوں کو پتہ نہیں تھا کہ ان کا ماں جایا اب کیسا ہو گا، انھیں دیکھ کر اس کا ردِعمل کیا ہو گا، گھر کیسا ہو گا، ان کا پیارا شہر انھیں کیا پیش کرے گا... لاہور ایئرپورٹ پر ماموں اپنی بہنوں کو لینے آئے۔ آخری مرتبہ ماں اور خالہ نے اپنے بھائی کو 40 سال پہلے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ 20 سال کے نوجوان تھے۔ دبلے پتلے، لمبے، سمارٹ، لیکن اب جو مرد ان کے سامنے کھڑا تھا وہ 60 کے پیٹے میں تھا۔ گنجا اور سفید ہوتے بالوں والا آدمی، انھوں نے عوامی سوٹ پہن رکھا تھا، ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص جو بھٹو کی وجہ سے مقبول ہوئی۔ میں نے تصور کرنے کی کوشش کی کہ وہ بہنوں کو کیسے دیکھ رہے تھے۔ ایک میری خالہ جن کی عمر 70 سال سے اوپر تھی، دوسری ماں جو 60 کے لگ بھگ تھی۔ دونوں کا سر سفید تھا۔ یہ ملاپ بلاشبہ مشکل اور ایک بڑی آزمائش تھا۔ ہر کوئی اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اب ایک اجنبی کے طور پر ساتھ کھڑی تھی۔ میری سہیلی لالہ جو ایئرپورٹ آئی تھی مجھے بتاتی ہے کہ وہ ان کے چہروں کے تاثرات کبھی نہیں بھلا سکی۔ اس کے پاس اظہار کے لیے الفاظ نہیں۔ گھر پہنچنے تک کار میں جاتے ہوئے سب نے بہت مختصر بات کی۔ گھر — یہی وہ گھر تھا جہاں میری ماں، ان کی بہن

اور بھائی پلے بڑھے۔ اس جگہ کے ہر پتھر، کونے اور چھید سے واقف تھے لیکن گھر اب جن لوگوں کے قبضے میں تھا وہ انھیں نہیں جانتے، لہٰذا وہ اس سے شائستگی سے برتاؤ پر مجبور تھے۔ جیسے کسی اجنبی گھر میں کیا جاتا ہے، میری ممانی گرم جوشی مگر محتاط طریقے سے ان کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ انھیں یقیناً حیرت ہوگی کہ فیملی میں شادی کی تقریب کے موقع پر دوسری طرف سے آنے والے رشتہ دار یہاں کیا کر رہے ہیں؟ انھیں کیسے توقع کرنا چاہیے تھی کہ یہ رشتہ دار انھیں مہمانوں کے سامنے کسی اُلجھن میں نہیں ڈالیں گے۔

پہلے دو روز تو ماموں اور ان کی بہنیں کھنچی کھنچی رہیں۔ وہ شائستگی اور تناؤ میں باتیں کرتے رہے۔ تیسرے روز سیلابی ریلا بہہ نکلا۔ تینوں ایک کمرے میں بند ہو گئے۔ روتے، قہقہے لگاتے، باتیں کرتے اور یادیں تازہ کرتے رہے۔ ماموں نے اپنی بہنوں کو گھر کا باقاعدہ معائنہ کرایا۔ وہ اپنے پُرانے کمروں میں جا سکتے تھے۔ اپنے پسندیدہ درخت دیکھ سکتے تھے اور اپنے والدین اور عزیزوں کو یاد کر سکتے تھے۔ میں جو ایئرپورٹ پر ملاقات میں ایجنٹ کا کردار ادا رہی تھی اب اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برأ ہو چکی تھی۔ میں پہلے ہی انھیں کہہ چکی تھی کہ میں لالہ کے گھر میں رہوں گی اور میں نے ایسا ہی کیا۔ تاہم اس میں ایک قسم کا احساس جرم بھی تھا۔ لیکن اب میں اپنے کیے پر خوش ہوں—— میں نے سوچا وہ اب میری موجودگی کے بغیر باتیں کر سکتے تھے۔ لیکن میں نے یہ کام درست نہیں کیا تھا کیوں کہ فوری طور پر جہاں ایک خاندان جڑ گیا وہاں دوسرا مزید دور ہو گیا۔ ماموں کے اپنے کنبے کے لیے دونوں بہنوں کی آمد قدرتی طور پر کچھ تشویش ناک ہو سکتی تھی۔ آخر ایک لڑکی کی شادی ہو رہی تھی۔ سسرال والوں نے خاندان میں ہندوؤں کی موجودگی پر اعتراض کر دیا تو؟ اور یہاں آنے والے ان ہندوؤں نے اپنی زمین کی ملکیت کا دعویٰ جتا دیا تو پھر کیا ہوگا؟ اور اگر ہندوؤں نے خاندان والوں کے سامنے کوئی ایسی ویسی حرکت کر دی تو کیا ہوگا؟ اس طرح کی ایک اور پیچیدگی تھی۔ میری ماں اور خالائیں تینوں، بھائی سے بڑی تھیں۔ روایت کا تقاضا تھا کہ انھیں عزت دی جائے۔ اس کا مطلب تھا شادی کی رسومات میں انھیں حیثیت دی جائے۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ اس طرح فیملی کی ''اِس طرف'' اور ''اُس طرف'' کے درمیان ایک قسم کی خاموشی تھی اور مجھے دھچکا لگا کہ وہ سرحدیں دوبارہ قائم کرنا کتنا آسان ہے جن کے بارے میں ہمارا

خیال تھا کہ ہم نے انھیں پار کر لیا تھا۔

☆☆☆

رانا کے ساتھ ہمارا تعلق کچھ برسوں تک قائم رہا۔ البتہ میں نے پھر انھیں ملنے کے لیے پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اب یہ اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ انھوں نے پریشان ہونا شروع کر دیا تھا کہ پولیس ان کی نگرانی کر رہی تھی اور پھر بتدریج انھوں نے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ تک ماں انھیں خط لکھتی اور تحائف بھیجتی رہی لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ میں نے اپنی دوستوں کے ذریعے کئی بار انھیں خط اور پیغامات ارسال کیے، یہاں تک کہ انھوں نے جواب بھیجا ــــ ''رابطے کی کوشش نہ کرو، اس سے کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔'' ایسا صرف حکومتی دباؤ کی وجہ سے نہیں تھا۔ ماموں کے بیٹوں نے بھی ان پر پریشر ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ بھارتی خاندان سے رابطے منقطع کر لیں۔ اس کے بعد پھر ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا۔

اب کئی برس بیت چکے ہیں۔ میں نے رانا کو نہیں دیکھا۔ مجھے یہ علم نہیں آیا وہ زندہ ہیں یا انتقال کر چکے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ زندہ ہیں۔ میں انھیں زندہ ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور کسی نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔ مجھے اپنی تسلی کے لیے وہاں جانا چاہیے۔ میں نے خود سے کہا کہ اگر انھیں کچھ ہوا ہوتا تو یقیناً کوئی نہ کوئی ہمیں بتا دیتا۔ تاہم میری یہ منطق خود مجھے اطمینان نہ دے سکی۔ برسوں پہلے جب میری ماں نے ماموں سے سوال کیا تھا کہ انھوں نے نانی جان کو دفن کیا تھا یا ان کی چِتا جلائی تھی تو میں نے یہ بھی پوچھا تھا: کیا وہ مجھے نانی کی قبر پر لے جا سکتے ہیں؟ مجھے اب بھی یاد ہے کہ شام کے دھندلکے میں دروازے پر ان کے ساتھ کھڑے ہوئے میں سڑک کی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ''ماموں، میں اپنی نانی کی قبر دیکھنا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے وہاں لے جائیں۔'' پہلی بار انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا، انھوں نے بے چینی سے پیر پٹختے ہوئے کہا: ''نہیں میرے بچے ابھی نہیں، میں اس کے لیے ابھی تیار نہیں۔''

☆☆☆

14-اگست 1996ء کی شب سرحد پر ایک سو بھارتی شہریوں نے واہگہ

(پنجاب) میں پاک بھارت سرحد کا دورہ کیا۔ وہ دونوں طرف کے گروپوں کی جانب سے طویل عرصے سے تعطل کا شکار مقصد کی تکمیل کے لیے وہاں گئے۔ دونوں طرف سے پاکستانی اور بھارتی باشندوں نے سرحد پر کھڑے ہو کر امن کے گیت گائے۔ ان کا خیال تھا کہ انھیں سرحد پر ایک علامتی لکیر لگا کر ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ملے گا لیکن انھیں مایوس لوٹنا پڑا۔ سرحد ان کی سوچ سے زیادہ پیچیدہ تھی۔۔۔ ان کے درمیان ایک وسیع میدان حائل تھا۔ بھارتی حدود میں ایک نیون سائن جلائی گئی جس پر لکھا ہوتا ہے ''میرا بھارت مہان''۔۔۔ پاکستان کی طرف سے اس قسم کا روشن نعرہ بلند کیا گیا ہے: ''پاکستان زندہ باد''۔ لوگ یہاں پکنک منانے آتے ہیں۔ کھاتے پیتے اور لطف اُٹھاتے ہیں۔ ہر شام سرحدی چوکی پر تقریب ہوتی ہے، جس کو دیکھ کر وہاں آنے والا دونوں طرف سے جارحانہ انداز کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ جیسے ہی پرچم سرنگوں کیے جاتے ہیں دونوں طرف کے سپاہی تیز تیز ایک دوسرے کی جانب بڑھتے اور پھر سے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ یہ تمام عمل اتنی شان و شوکت سے دُہرایا جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ شاید انھوں نے ہی تفریق کی لکیر کھینچنے کے لیے مل کر کام کیا ہوگا۔ دن کے وقت جب لوگ سرحد پر آتے ہیں تو قلیوں نے مختلف لباس پہنے ہوتے ہیں۔۔۔ نیلا اور سرخ۔۔۔ تاکہ ''ہمارے'' اور ''ان کے'' درمیان فرق کیا جا سکے۔ وہ بارہ انچ کی لکیر جو سرحد قائم کرتی ہے، پر ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ بھاری تھیلوں اور لفافوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ جب ان کے سر ملتے ہیں تو سرحد عبور ہوتی ہے۔ لیکن ان کے پاؤں اپنی جانب ہی جمے ہوتے ہیں۔ تقسیم کے دُکھ اور تکالیف کی یادگار پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں سرحد، عوامی جگہ یا کسی جگہ پر نہیں۔ 10 لاکھ لوگ شاید مارے گئے تھے لیکن ان کی کوئی یادگار نہیں۔ صرف لوگوں کی کہی داستانیں ہی سب کچھ ہیں۔ ان کہانیوں میں شاذ و نادر ہی سرحدوں، مذاہب یا خاندانوں کا ذکر ہوتا ہے۔ لوگ صرف اپنے خون کا ذکر کرتے ہیں۔

MashalBooks.com

حصہ دوم

سوبھدرا بوٹالیہ

''ایک ہی والدین، ایک ہی خون کی اولاد...''

سوبھدرا بوٹالیہ میری ماں ہیں۔ جب سے میں پاکستان جا کر رانا ماما سے ملی تھی اور بعد ازاں ماں کو ان کے آبائی گھر لے کر گئی تھی ہم دونوں رانا ماما اور تقسیم سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے جھجکنے لگی تھیں۔ تب میں نے اکثر محسوس کیا کہ ہم کس باقاعدگی سے لاہور، اپنے پُرانے خاندانی گھر اور نانا نانی کی باتیں کرتے تھے۔ لیکن ان باتوں میں سے کتنی کم ہم خود میں جذب کر پاتے تھے۔ جب میری ماں ماموں سے لاہور میں مل کر واپس گئیں یا اس سے پہلے جب ماموں خط لکھتے تھے، میں اس تجسّس سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی کہ ماں نے اپنے فیملی گھر میں اتنے برسوں میں بھلا بھائی کو دوبارہ دیکھ کر کیا محسوس کیا تھا۔ اگر لاہور جانے کے لیے میرے اندر اتنا طاقت وَر جذباتی کھنچاؤ تھا تو ان کے احساسات کیا ہوں گے؟ کئی برسوں کے دوران میں مَیں نے انھیں اپنے تجربات بیان کرنے کی طرف راغب کیا اور اس کے نتیجے میں مجھے ایک اور تضاد کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے والدین کی نسل کے لوگ ہر وقت تقسیم کی کہانیاں سناتے رہتے۔ ان کے ذہنوں پر یہ باتیں سوار تھیں۔ ان کی زندگیاں ان واقعات سے بھری تھیں اور یہ ان کی ماضی کی یادیں تھیں۔ لیکن جب آپ ان کو لے کر بیٹھ جائیں اور ان سے انٹرویو کرنے کی کوشش کریں تو وہ حیران کن طور پر ہچکچاہٹ کا شکار ہو جائیں گے۔ میں نے اس پر کافی سوچ بچار کیا اور یہ نتیجہ اخذ کر سکتی ہوں کہ جب حافظے کی گہرائیوں سے نکالی جانے والی یاد خود آگاہی اور خود عکاسی کے تجربے سے گزرتی ہے، لوگوں کو اپنی ذات کے بارے میں ذمہ داری قبول کرنے میں زیادہ ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ ماسوائے اس کے کہ انھیں یقین ہو کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ ''درست'' اور ''سچ'' ہے۔ لیکن سب کچھ یہی نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں میری ماں کے ضمن میں کہ انھیں ملنے والے زخم اتنے گہرے تھے کہ ان کا ذکر کرنا زیادہ مشکل ہے، یہی حالت میری تھی۔ شاید میری جگہ کوئی اجنبی

ہوتا تو وہ وہاں کامیاب رہتا جہاں مجھے ناکامی ملی۔ ایک موقع پر جب میں ماں سے یہ پوچھ رہی تھی کہ نانی کو زبردستی لاہور میں روکتے وقت ان کے احساسات کیا تھے، وہ بولیں: کون اپنی ماں سے جدا ہونے کے لمحے کے دُکھ کو بیان کرسکتا ہے؟ میں نے محسوس کیا کہ میں نے اس پہلو کے بارے میں کتنا تھوڑا سوچا تھا۔ والدین کی طرف سے اولاد کو چھوڑنے کے درد کو ہم سمجھ سکتے ہیں لیکن اس جدائی کا دوسرا موڑ ایسا ہے جس پر کہ کم غور کیا جاتا ہے۔ اس بات کو جاننے کا کوئی طریقہ نہیں کہ تاریخ کے اس جھکڑ میں کتنے والدین بچوں سے جدا ہو گئے، اس بات کے جاننے کا بھی کوئی راستہ نہیں کہ ان میں سے کتنے حادثاتی طور پر اور کتنے منصوبے کے تحت کھو گئے۔

میں نے اس انٹرویو کو کتاب میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا کیوں کہ کئی حوالوں سے یہ رانا ماما کی کہانی میں تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرتا ہے۔ اس لیے بھی کیوں کہ یہ خاندانوں کے اندر چھپی خاموشیوں اور اس کے پس منظر میں مشکل کا بھی انکشاف کرتا ہے۔ جتنا اس سکوت کی تحقیق کا تجربہ اہم ہے اتنا ہی اہم یہ سوال ہے کہ یہ تفتیش کیسے کی گئی؟ سوالات کس نے اُٹھائے اور کب؟ اور دراصل کون اس خاموشی سے پردہ اُٹھاتا ہے؟ میری ایک دوست نے بتایا کہ کس طرح برس ہا برس چپ رہنے کے بعد اس کی ماں نے ایک محقق کے سامنے تقسیم ہند کی یادیں کھول کر رکھ دیں۔ ایسا کرنے کے کئی ہفتوں بعد تک وہ ماضی کا دُکھ اور ذہنی عذاب یاد کر کے سو نہ سکی تھیں۔ یوں یہ محض سکوت اور بیان کا سادہ سا سوال نہیں ہوتا، کیوں کہ کچھ بولنا ہمیشہ آسودگی کا باعث بنتا ہے نہ ذہن کو آزاد کرتا ہے۔ اپنے کام کے دوران میں مَیں نے بھرپور کوشش کی کہ صرف انہی لوگوں سے مخاطب ہوسکوں جو بولنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اپنے کہے کے مطلب کی ذمہ داری اُٹھانے کے لیے بھی تیار ہوتے ہیں۔ اس بات کے جانچنے کا کوئی طریقہ نہیں کہ واقعی یہ درست اپروچ ہے، لیکن میرے نزدیک صرف یہی ایک اپروچ تھی جس کو میں اختیار کرسکتی تھی۔

اپنی ماں کا انٹرویو شامل کرنے کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں۔ کچھ حوالوں سے ماموں نے میری نسبت ان سے زیادہ بے تکلفی سے باتیں کی تھیں۔ انھوں نے اعتراف کرلیا کہ ان کے پاکستان میں رہ جانے کی وجوہات میں سے ایک وجہ گھر تھی۔ یہ ایک

المیہ اور مضحکہ خیز بات ہے کہ وہی گھر جو تقسیم کے وقت ماموں کے لیے ایک قسم کی آزادی کا نشان تھا وہی آنے والے وقتوں میں ان کی گردن کے گرد ایک طوق بن گیا۔ اگر رانا کی باتوں کا یقین کر لیا جائے تو بھی انھیں اپنے بیٹوں کے ہاتھوں نتائج بھگتنا پڑے۔ گھر ہی ان کے نزدیک اہم ٹھہرا تھا لیکن انھوں نے میری ماں کو بتایا کہ ''میں اپنے ہی گھر میں اجنبی ہوں، مجھے اپنے ہی گھر میں اپنے بچوں نے شکار کر لیا۔''

سوبھدرا بوٹالیہ

میں 1946ء میں نابھہ میں سٹیٹ ہائی سکول میں کام کرتی تھی۔ سکول کی بڑی عمارت میں ایک وسیع دالان تھا۔ اس کے چاروں طرف گنجان آبادی تھی، جس میں طوائفوں اور کچھ بہت غریب مسلمانوں کے گھر تھے۔ بہرحال ان چاروں اطراف میں مسلم آبادی کا غلبہ تھا۔ ایک موقع پر لوگ تقسیم سے متعلق باتیں کرنے لگے اور ہمیشہ یہ بحث ہوتی کہ آیا ایسا ہو جائے گا یا نہیں۔ میں اور ہیڈ مسٹریس رنجیت، میری ماں، بہن بھائی ہم سب اکٹھے رہتے تھے۔ ہم ہر وقت خوف زدہ رہتے تھے کیوں کہ جو کہانیاں گردش کرنے لگی تھیں اُن سے مترشح تھا کہ اگر کوئی گڑ بڑ ہو گئی یا جب لڑائی شروع ہوئی تو سب سے پہلے سکول کو نشانہ بنایا جائے گا۔ ہمارے تو چوکیدار اور آیائیں تک مسلمان تھیں۔ یوں ہم دہشت زدہ رہنے لگے۔ ہم حیران تھے کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ عام طور پر ہمارا معمول تھا کہ ہم کھلے میدان میں چاردیواری کے اندر سوتے تھے لیکن ہمیں ہدایات جاری کی گئیں کہ اگر کبھی کوئی شور ہو، گڑ بڑ محسوس ہو تو سب لوگ بھاگ کر اندر چلے جائیں۔

سکول کے بالکل سامنے سڑک کے پار ایک طوائف کا گھر تھا۔ ایک دن اس کا کسی سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ آدمی فوجی تھا، اس نے طوائف کو گولی مار دی۔ رات کے وقت اس نے دو گولیاں چلائیں۔ پھر بھاگ کر ہماری چاردیواری پھلانگتے ہوئے اندر گھس آیا اور خودکشی کر لی۔ ہم حقیقت میں بہت دہشت زدہ ہو گئے اور بھاگ کر اندر چلے گئے۔ لیکن میری سب سے چھوٹی بہن مونا حواس باختہ ہو کر اندر کے بجائے باہر جا کر چھپ گئی۔ پریشانی سے ہمارا بُرا حال ہو گیا۔ مونا، مونا، وہ کہاں ہے؟ کون جانتا تھا باہر کیا ہو رہا ہے۔ رنجیت نے مجھے باہر نہ جانے دیا۔ میں نے کہا کہ میں چھوٹی لڑکی کو باہر اکیلے

کیسے رہنے دوں؟ وہ واقعی ایک بحران تھا پھر اس نے ہماری آوازیں سن لیں اور اندر چلی آئی۔ صبح کو ہمیں پتہ چلا کہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا، یہ تو کوئی اور ہی کہانی تھی، فوجی نے ایک عورت کا خون کر دیا تھا۔

ہمیں پتہ چلا کہ وہ شخص اپنی جائے تعیناتی سے اس عورت کو پیسے بھیجا کرتا تھا۔ واپس آ کر اس نے پوچھا کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔ وہ بولی، جاؤ کام کرو، یہاں تم جیسے کئی اُمید وار ہیں جو یہاں آ کر میرے تلوے چاٹتے ہیں۔ پھر یہ کچھ ہو گیا۔ اس طوائف کی ماں ہر رات کو دل دہلا دینے والے انداز میں ''اللہ'' پکارتی تھی۔ ہمارے ڈر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمارے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ ہم سب عورتیں تھیں اس لیے ڈرتی رہتیں۔ کشیدگی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس عبوری دَور میں مَیں نے سوچا ہم یہاں سے نکل کر کہیں چلی جائیں۔ بچوں نے سوچا انھیں لاہور چلے جانا چاہیے—— یہ معلوم نہیں تھا کہ لاہور میں کیا ہو گا۔ رنجیت نے کہا، وہاں نہ جاؤ، حالات بہت بُرے ہیں۔ ابھی ہم صلاح مشورے کر رہے تھے کہ لاہور سے میرا بھائی رانا آ گیا۔ اس نے کہا کہ ہر طرف تقسیم کی باتیں ہو رہی ہیں، لہٰذا ہمیں یہ گھر فروخت کر دینا چاہیے۔

میں تمھیں رانا کے بارے میں کچھ بتاتی چلوں۔ ہم 9 بہن بھائیوں میں اس کا نمبر چھٹا ہے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو انھوں نے ورثے میں ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑا۔ مستقبل میں ہمارے تحفظ کے لیے ایک گھر موجود تھا۔ اس لیے ہمارے رشتہ دار جو ہم سے ہمدردی کے لیے آتے تھے، کہتے تھے اس کنبے کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہو گی۔ لیکن ہمارے لیے کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ بکرم، میرے بھائی نے، جو کالج چھوڑ چکا تھا، کاروبار شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے اس نے ماں سے رقم لی تھی۔ لیکن یہ منصوبہ ناکام رہا۔ اس کے باوجود نقصان کے اثرات زیادہ محسوس نہ ہوئے۔ بعد میں بکرم ایئرفورس میں بھرتی ہو گیا۔ جب وہ ملازمت پر بھرتی کی خوش خبری لے کر آیا تو اس کے ساتھ ایک خوب صورت مسلمان لڑکی بھی تھی، آمنہ۔ اس نے کہا وہ پہلی تنخواہ ملتے ہی اس سے شادی کر لے گا۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہو سکا۔ جس روز بکرم تنخواہ وصول کرنے اپنے دفتر گیا، دفتر ابھی کھلا نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ چھوٹے طیارے پر تھوڑی سی پرواز کرے، لیکن طیارہ بجلی کے تاروں سے ٹکرا گیا اور میرا بھائی مر گیا۔

کچھ وجوہات کی بنا پر بکرم کی موت نے رانا کی زندگی پر بہت اثر ڈالا۔ ہمارے ایک چچا نے، جو لاہور ہائی کورٹ میں جج تھے، کہا کہ رانا کو گاؤں میں بھیج دینا چاہیے۔ اس طرح 12، 13 برس کی عمر میں اسے سکول سے نکال کر پراگ پور بھیج دیا گیا۔ اسے گاؤں سے سخت چڑ تھی۔ ایک دن اس نے خط لکھا اور کہا: ''یہاں مجھے اپنی چادریں خود دھونا پڑتی ہیں۔ اگر مجھے واپس نہ بلایا گیا تو میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔'' کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ وہ کہیں لاپتہ ہو گیا ہے... ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا کریں، کیسے اسے تلاش کریں۔ ماں کو مرگی کی تکلیف شروع ہو گئی، بڑی بہنیں بیاہ کر رُخصت ہو چکی تھیں اور میں بہ مشکل 20 سال کی تھی...

مجھے یاد نہیں کہ کیسے ہمیں پتہ چلا کہ وہ میری ایک خالہ کے پاس تھا۔ ہم نے اسے واپس گھر لانے کی کوشش کی مگر وہ پھر بھاگ نکلا۔ اگلے 2 برس تک اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا، اور ہمیں لگا کہ ہم دوسرے بھائی سے بھی محروم ہو گئے ہیں۔ مجھے دوسرے افرادِ خانہ سے بڑھ کر اس نقصان کا احساس تھا... اور پھر ایک صبح بڑی باجی رانا کو ساتھ لیے گھر میں داخل ہوئیں؟ انھیں وہ ایک ریلوے ریستوران پر بیٹھا ملا تھا۔ وہ گھر میں اجنبی تھا، لیکن اس نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔

بعد ازاں ہم سب نابھہ چلے آئے، لیکن رانا لاہور میں ہی رہا۔ میں نے نابھہ میں نوکری کر لی اور ماں اور چھوٹے بہن بھائی کو ساتھ رکھ لیا۔ جب کہ رانا نے رہائش آبائی گھر میں ہی رکھی۔ اس کا گزارا کیسا چلا، کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ہاں اکثر و بیشتر وہ مجھ سے اُدھار مانگتا رہتا تھا...

جب تقسیم کے بادل ہم پر سایہ فگن ہونے لگے تو مجھے لاہور میں اپنے گھر کی فکر لاحق رہنے لگی۔ یہ گھر ہماری آخر اُمید تھا۔ میں نے سوچا اگر کسی تقسیم کی گڑبڑ کے دوران میں ہم سے ہمارا گھر چھن گیا تو ہمارے پاس کچھ باقی نہیں بچے گا۔ ایک دن میں نے اخبارات میں اشتہار پڑھا، جس میں سہارن پور کے مسلمان مالک نے اپنے گھر کے بدلے لاہور میں مکان تبدیل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ مجھے یہ پیش کش بہت پُرکشش محسوس ہوئی۔ میں نے اس سے بات چیت کا آغاز کیا اور اپنے چچا کو بھی اس کی تفصیلات لکھ بھیجیں۔

MashalBooks.com

چچا کی طرف سے تو کوئی جواب نہ ملا البتہ رانا چند روز بعد ہمیں ملنے آ گیا۔ اسے خوشی تھی کہ ہم جائداد کا تبادلہ کرنے والے ہیں۔اور کہا کہ وہ اس حوالے سے تفصیلات طے کرنے کے لیے ماں کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ میں مان گئی۔ میں خوش تھی کہ میری کاوشیں رائیگاں نہیں گئیں۔ جب کئی روز بعد وہ واپس نہ آئیں تو مجھے پریشانی ہونے لگی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، لہٰذا میں انھیں ملنے اور صورت حال جاننے کے لیے لاہور چلی گئی۔

وہاں مجھے پتہ چلا کہ میرے چچا نے رانا کو میرے خلاف بھڑکایا تھا کہ میں جائداد ہتھیا لوں گی۔ اصل میں رانا اس لیے ماں کو اپنے ساتھ لاہور لے گیا تھا کہ مکان پر قبضہ کر سکے۔ جب میں نے اسے استفسار کیا تو وہ بولا: میں ایک اَن پڑھ شخص ہوں، میں انڈیا میں جا کر کیا کروں گا؟ تم کب تک آخر میری مدد کرو گی۔ جلد تمھاری شادی ہو جائے گی اور پھر تمھاری فیملی ہی تمھاری ترجیح ہو گی، یہاں کم از کم یہ گھر مجھے پناہ تو دے سکے گا۔

میں نے اس کے ساتھ بحث کرنے کی کوشش کی اگر پاکستان ایک حقیقت کا رُوپ دھار لیتا ہے تو وہ کیسے گزارا کرے گا؟ رانا کا جواب بالکل سیدھا سادہ سا تھا۔ اس نے بتایا اس نے تمام منصوبہ بندی کر لی ہے۔تم اس لڑکی کو جانتی ہو ناں جس کی ماں کا گھر جتندر کے کوارٹر سے اگلا تھا؟ میں کافی عرصے سے اسے جانتا ہوں، اگر میں اسلام قبول کر لوں تو وہ مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہے۔

ماں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے پوچھا۔اس نے بتایا کہ وہ میری بھی ماں ہے، وہ مسلمان بن جائے گا۔ اُس لڑکی فوزیہ سے شادی کر لے گا اور ماں کو اپنے ساتھ رکھ لے گا۔

ایک ناتواں ماں کو چھوڑ دینے کے غم کا اندازہ کون لگا سکتا ہے...؟ میں نے رانا سے التجا کی کہ وہ ماں اور چھوٹے بھائی کو ساتھ لے جانے دے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس پر مزید اعتماد نہیں کر سکتی۔ میں نے سوچا جائداد کی ہوس میں وہ ماں اور بھائی کا خون بھی کر سکتا ہے... اور صورت حال کشیدہ بھی تو بہت تھی۔ میں ڈر گئی، میں رات کو اس مکان میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ آخر کار میں نے جانے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے اپنی بیمار، لاچار ماں کو چھوڑا اور بھائی کی اس سنگ دِلی کو کبھی معاف نہ کر سکی۔ رُخصت ہوتے

وقت میں رو پڑی۔ اس نے مجھے دیکھا ور بولا: ''تم مجھ سے اس لیے ناراض ہو کہ میں مسلمان ہو رہا ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور روتے ہوئے کہا، ماں کا خیال رکھنا۔ میں نے کہا کہ میرے لیے یہ بات زیادہ اہم نہیں کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو—— آخرکار ہمارے ابا ایک سیکولر اور وسیع الذہن انسان تھے۔ لیکن جس بوڑھی عورت کو تم ہم سے چھین رہے ہو، وہ بوڑھی اور لاغر ہے اور اسے توجہ کی ضرورت ہے... میں افسردہ دل کے ساتھ وہاں سے اس اُمید پر نکل پڑی کہ شاید میری کوئی اور بہن، بھائی کو قائل کر لے کہ وہ ماں کو ہمارے ساتھ جانے دے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ ماں کیسے زندہ رہی، کیا اس کی مناسب دیکھ بھال کی گئی، کیا اسے مناسب انداز میں کھانا دیا گیا تھا یا وہ بھوکی رہتی رہی... مجھے کبھی اس کا علم نہیں ہو سکا۔ البتہ میرے دل میں ماں کے لیے دردمندانہ جذبات ہمیشہ موجود رہے۔ جب سے میرے باپ کا انتقال ہوا تھا اماں میرے ساتھ ہی رہی تھیں... وہ ایک پکی ہندو تھیں اور ہر شام عبادت کرتی تھیں... میں یہ سوچ کر حیران ہوتی رہی کہ کیا ماں کے معمولات پہلے جیسے رہے...

رانا عبداللہ بن گیا اور فوزیہ اس کی بیوی بن گئی۔ ہمارے بچپن کا گھر اب راسخ العقیدہ اور نومسلم خاندان کا مسکن تھا۔ کیا وہ خوش تھا؟ کیا اس نے ماں کا خیال رکھا؟ یہ جاننے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک یا دو بار اس نے چھوٹی بہن مونا کو خط لکھا لیکن پھر مونا نے اسے خط لکھنے سے منع کر دیا کیوں کہ اس کا شوہر بھارتی فوج میں تھا اور کئی سوالات جنم لے سکتے تھے... جیسے جیسے وقت گزرتا گیا رانا تنہا ہوتا چلا گیا، میرا خیال ہے وہ ہمیں مِس کرنے لگا۔ ہاں اس نے مجھے کبھی خط نہیں لکھا۔ اور پھر برسوں بعد تم نے اس سے رابطہ کیا اور اس نے تمھارے ذریعے خط بھجوایا۔ اس نے لکھا کہ وہ 4 بیٹوں اور 3 بیٹیوں کا باپ ہے۔ اس نے کہا: ''میں نے جوانی میں جو کچھ کیا اس پر خود کو کبھی معاف نہیں کر سکا۔ میں اپنے قدموں کے نشان نہیں تلاش کر سکتا۔ مجھے یہاں کبھی قبول نہیں کیا گیا، میرے اپنے خاندان نے بھی...''

اس کے خط نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے اسے جوابی خط لکھ دیا۔ میں نے اس سے کہا: میں سوچتی تھی وہ خوش قسمت ہے... کم سے کم اس نے زندگی اپنے گھر میں گزاری۔ اس نے کہا: ''پیاری بہن مجھے خوش قسمت نہ کہو۔ کیا تمھیں پتہ ہے

جب سے میں نے مذہب تبدیل کیا ہے میں ایک بھی رات سکون کی نیند نہیں سو سکا۔ گھر کی ہر اینٹ مجھ پر لعنت بھیجتی لگتی ہے۔ میرا جو کچھ تھا اسے میں نے مسترد کر دیا اور جو عقیدہ میں نے اختیار کیا اس نے مجھے کبھی قبول نہ کیا۔''

جب رانا ماں کو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا تو مجھے اس کی بدنیتی کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ہاں مجھے کچھ تشویش ضرور تھی۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ کیا کروں، میں نے سوچا کہ بچوں کو مسوری میں اپنی بڑی بہن سُنیتی کے پاس بھیج دوں۔ اس لیے میں نے اسے خط لکھا—— اور کہا کہ یہ جگہ محفوظ نہیں اس لیے میں بچوں کو اس کے پاس بھیج رہی ہوں۔ انھیں کچھ عرصہ اپنے پاس رکھو، جب حالات معمول پر آ جائیں گے تو میں انھیں واپس بلا لوں گی۔ جب مجھے تسلی ہو گئی کہ بچے (مراد چھوٹے بہن بھائی: مترجم) محفوظ جگہ پر ہیں تو میں نے مرانڈا ہاؤس میں داخلہ لے لیا اور روسی زبان سیکھنا شروع کر دی۔ مجھے ہمیشہ سے روسی زبان پڑھنے کا شوق تھا۔ میرا قیام ہاسٹل میں تھا۔ یہ جولائی 1946ء کی بات ہے، بہت کشیدگی تھی اور حالات بہت بُرے تھے۔ لیکن میں مطمئن تھی کہ کم سے کم بچے محفوظ ہیں۔ لیکن سُنیتی نے یہ کہہ کر بچوں کو واپس بھیج دیا کہ وہ چھٹیاں گزار رہے ہیں اور وہ ان کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔ پھر رنجیت نے مجھے بتایا کہ فکر نہ کرو، ہم گاؤں جا رہے ہیں۔ ہم بچے اپنے ساتھ لے جائیں گے، وہ وہاں اچھی طرح رہ سکیں گے، تم روسی سیکھنے پر توجہ دو۔ اس طرح، چونکہ رنجیت میری بڑی اچھی سہیلی تھی—— میں روسی سیکھنے میں لگی رہی۔

پہلے چھ ماہ خیریت سے گزر گئے۔ پھر چھٹیاں آ گئیں اور میں نابھہ چلی گئی۔ اور جب گرمیوں کی چھٹیاں گزرنے کے بعد واپس آئی تو اچانک حالات انتہائی خراب ہو گئے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے پرنسپل کا نام راجا رام تھا۔ ہم سب لڑکیاں ان کی جیپ میں بیٹھ کر شاپنگ کے لیے چلی گئیں۔ اس نے کہا آج اتوار ہے۔ ہم نے بھی سوچا کہ کچھ دیر باہر گھوم پھر آئیں، لیکن باہر گئے تو بہت گڑبڑ نظر آئی۔ ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہم یونیورسٹی ایریا سے لال قلعے کی طرف گئے۔ مجھے یاد ہے، لال قلعے کے پاس میں نے ایک تانگہ دیکھا جس پر بیٹھے آدمی نے چاقو پکڑ رکھا تھا اور اس کے ساتھ چار لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں تانگے سے اُتر کر بھاگ کھڑی ہوئیں اور آدمی ان کے پیچھے دوڑا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے پتہ نہیں چل سکا۔ ہر جگہ لاشوں سے بھری ہوئی

تھی۔ لہٰذا ہم نے راجا رام کو جیپ واپس رام پور کی طرف موڑنے کے لیے کہا۔ وہاں ایک تھانہ تھا اور اس نے کہا، آؤ اندر جا کر پولیس کو اطلاع دیں۔ وہ اندر گیا اور ساری تفصیل بتائی۔ لیکن جواب ملا کہ ان کے پاس نفری نہیں ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اور پھر نہ جانے وہ کس لیے ریلوے سٹیشن کی طرف چلا گیا۔ وہاں ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ اور پھر وہ بولا: میرا خیال ہے ہم مزید آگے نہیں جا سکتے، اور ہم واپس لوٹ آئے۔ اس نے ہمیں ہاسٹل پر اُتار دیا۔

میرے کمرے میں ایک مسلمان لڑکی بھی تھی، جس کا نام ظہیرہ الٰہی تھا۔ میرا خیال ہے وہ سرسید احمد خان کی بھانجی یا بھتیجی تھی۔ اس کے بہت زیادہ رابطے تھے... یونیورسٹی میں بہت لوٹ مار اور آتش زدگی ہوئی—— وہاں تاریخ کے ایک پروفیسر تھے، قریشی۔ مجھے یاد ہے، آج بھی یاد ہے کہ لڑکوں نے انھیں کوٹ اور ٹائی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے لوگوں سے سنا کہ ان کے پاس نادر پینٹنگ وغیرہ تھیں... انھوں نے وہ سب لوٹا اور ساتھ لے گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ... ہر طرف بہت زیادہ کشیدگی ہے۔ ہم خوف زدہ ہو گئیں۔ میرا خیال ہے ہاسٹل میں اس وقت ہم چھ، سات لڑکیاں تھیں۔ وہاں ایک وارڈن تھی جس کی ایک گول مٹول بیٹی تھی۔ ہم سوچتی رہتیں کہ ہم اندر خود کو کیسے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ ایک دن ہم ابھی کھانے کے لیے بیٹھے ہی تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا اندر آیا اور ظہیرہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا، چلو میرے ساتھ۔ اس نے انتظار نہ کیا، ہم ہکّا بکّا رہ گئیں اور وہ اسے کھینچتے ہوئے لے گیا، بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ وہ اس کا بھائی تھا جسے علم ہو گیا تھا کہ بلوائیوں کا ایک گروپ ہاسٹل پر حملہ کرنے والا ہے، یا ایسی ہی کوئی گڑ بڑ ہونے والی ہے۔ اس طرح وہ لڑکی کو ساتھ لے گیا۔ اس کا تمام سامان، بڑے بڑے صندوق اور کمرے میں بکھری ہر چیز وہیں رہ گئی۔ بعد میں ہم نے سنا کہ وہ کوٹہ ہاؤس میں رہ رہے ہیں۔ پھر وہ اسے حیدرآباد یا کسی اور جگہ لے گیا۔ اس کے بعد ظہیرہ الٰہی کا راستہ ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا۔ لیکن پھر بلوائیوں کا ہجوم آ گیا اور شور کرنے لگا، ''ہمیں ظہیرہ چاہیے، ہمیں ظہیرہ چاہیے۔ اسے باہر نکالو۔'' ہم سب کو ایک کمرے میں تالا لگا کر بند کر دیا گیا اور اس کے بعد وارڈن نے ہمیں نکالا اور راجا رام کے گھر بھجوا دیا۔

چونکہ وہ (ظہیرہ) موجود نہیں تھی اس لیے ہجوم نے محسوس کر لیا کہ وہ فرار ہو

چکی ہے۔ اس کے بعد ہم کچھ دن راجا رام کے گھر پر رہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب لوگ یہاں سے چلے گئے تو بلوائی اپنے ساتھ لوٹے گئے سامان سے بھرے بڑے بڑے صندوق ساتھ لے کر گئے۔ کچھ دیر کے لیے وہ ہمارے پاس رُکے تھے۔ ہم لڑکیاں گھر کے باہر کھڑی تھیں۔ انھوں نے ہمیں ریشمی کپڑے اور وہ تمام چیزیں بیچنے کی پیش کش کی جو کسی لڑکی کی شادی کے لیے ضروری ہوسکتی ہیں۔

پھر تمام لڑکیوں کو اپنے اپنے گھروں میں جانا پڑا اور وہ چلی گئیں، سب کی سب، لیکن میں کہیں نہ جا سکی۔ مجھے سمجھ نہ آ سکی مجھے کہاں جانا چاہیے۔ میری کوئی منزل نہیں تھی... تمھیں پتہ ہے وہ ایک بڑی نازک صورت حال تھی۔ میں نے کافی سوچ بچار کیا۔ میں نے ہمت کی۔ وہاں قائم مہاراجہ نابھہ کے برانچ دفتر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں وہاں گئی اور کہا کہ میں نابھہ میں پہلے کام کرتی رہی ہوں۔ اس وقت میں اُلجھن کا شکار ہوں اور نابھہ جانا چاہتی ہوں۔ دفتر میں سے کسی نے مجھے کہا کہ ہم یہاں سے ہر روز کاریں بھیجتے ہیں اور ہم ان میں سے کسی ایک میں تمھیں بھجوا دیں گے۔ اس طرح میں ایک فوجی گاڑی میں نابھہ کی جانب چل پڑی۔ اس میں میری ایک سہیلی کے ماموں بھی تھے۔ میں نے وہاں سے چھٹی لے رکھی تھی۔ دراصل میں نابھہ کی ملازمت سے اُکتا چکی تھی۔ میں نے 6 ماہ تک ملازمت کی تھی۔ میں اس دوران میں شادی کے حوالے سے کچھ سوچ نہ سکی۔ اس وقت تناؤ کی کیفیت اور ذاتی مسائل بہت تھے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ باہر نکلوں اور اپنی کوالی فی کیشن بڑھا کر کچھ کرنے کی کوشش کروں۔ پھر ہم واپس چلے آئے اور انبالہ کے نزدیک کچھ دیر رُکے۔ یہ رات کا وقت تھا۔ میں واقعی بہت خوف زدہ تھی۔ میں نے اس شریف آدمی سے کہا، انکل کیا آپ مجھے ریلوے سٹیشن پر اُتار سکتے ہیں؟ انھوں نے کہا، تم فکر نہ کرو۔ ہم سب یہاں موجود ہیں اور تم ہماری ذمہ داری ہو...

رات کے اڑھائی بجے ہم نابھہ پہنچ گئے۔ سکول کے گیٹ پر انھوں نے مجھے کہا، اگر تم پسند کرو تو میرے ساتھ میرے گھر میں رہو، میں صبح تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ میں نے کہا، نہیں، شکریہ اس کی ضرورت نہیں۔ آخر کسی کا گھر کسی کا ہوتا ہے۔ رات کے اس وقت مجھے خیال آیا میں کہاں جاؤں گی۔ پس انھوں نے مجھے گیٹ پر اُتارا

اور چلے گئے۔ وہاں ایک چوکیدار تھا جس کا نام جیونہ تھا۔ میں نے جیونہ، جیونہ چلانا شروع کر دیا۔ وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا، میں نے آہستگی سے دروازے کو دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ میں اندر چلی گئی۔ وہ وسیع و عریض عمارت مکمل طور پر خالی تھی اور ایک بھی لائٹ روشن نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ جیونہ کا کمرہ بند تھا۔ مجھے یہ گمان نہ ہوا کہ وہ سب پاکستان جا چکے تھے۔ وہاں ایک لڑکی سائرہ ہوا کرتی تھی۔ میں نے اسے پکارا۔ لیکن جواب ندارد۔ میں قریبی گھر کی طرف گئی تو اسے تالا لگا ہوا تھا۔ یہ سب لوگ گاؤں جا چکے تھے۔ رنجیت میری چھوٹی بہن اور بھائی کو ساتھ لے گئی تھی۔ میری دوسری بہن سُدھا نے شادی کر لی تھی۔ جب کہ ایک اور بہن بھجر کو میں نے جالندھر کے علاقے کنیا مہاوِدّیالا کے ایک ہاسٹل میں داخل کر دیا تھا، وہ بھی جا چکی تھی۔ چھوٹا بھائی، بلّو، بھی گھر سے بھاگ کر لاہور چلا گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہیں تھا ماتا جی اور مونا کہاں تھیں۔ نہیں، نہیں، ماتا جی کو تو رانا لے کر گیا تھا۔ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ گھر خالی پڑا تھا۔ چھ سات ایکڑ پر پھیلی یہ بڑی عمارت—— گہری تاریک رات اور کوئی ذی روح میرے اردگرد نہیں تھا۔ ہر طرف مسلمان تھے۔ پھر مجھے خیال آیا میں انتہائی بے وقوف تھی جو اتنا خطرہ مول لیا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ سکول کی عمارت کے عقب میں ایک ماشکی رہتا ہے۔ اس کا نام تھا... مجھے یاد نہیں پڑ رہا۔ پھر میں اپنا وجود گھسیٹتی، دیواروں کا سہارا لیتی پچھلی طرف گئی۔ میں نے اسے پکارا اور وہ اُٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔ اس نے کہا، بیبا جی! آپ یہاں؟ آپ کہاں سے آئی ہیں۔ وہ دیوار پھلانگ کر اندر آ گیا اور تالا کھول دیا۔ ہم اندر چلے گئے۔ وہ برآمدے میں سو گیا، صبح کے وقت وہ سائیکل لے کر رنجیت کے گاؤں گیا اور اسے ساتھ لے آیا۔ پھر میں کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہی۔

اسی دوران میں مَیں ایک بار پھر لاہور گئی اور رانا سے کہا کہ ماں کو واپس بھیج دو۔ میں نے وعدہ کیا کہ ان کی صحیح دیکھ بھال کروں گی۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے وہاں چچا کا وہ خط پڑا ہوا دیکھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ اس میں رانا کو لکھا گیا تھا کہ ''سوبھدرا تمھاری جائداد ہڑپ کر لے گی۔ ماں کو اس کے ساتھ ہرگز نہ جانے دینا۔'' میں نے محسوس کیا کہ اس کا اب کوئی استعمال نہیں۔ میں نے التجا کی کہ کم از کم بلّو کو جو بھاگ کر یہاں آیا ہوا تھا میرے ساتھ بھیج دو، میں نے سوچا اگر وہ جائداد کے لیے

ماں کو لا سکتا ہے تو اپنے بھائی کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ بہر حال اس نے بلّو کو بھیج دیا۔

یہ سب کچھ ... تقسیم سے پہلے کا ہے۔ یہ 1947ء تھا اور تقسیم سے کچھ عرصہ قبل کا دور تھا۔ میں دوبارہ لاہور آ گئی۔ دونوں دورے تقسیم سے پہلے کیے۔ البتہ مجھے صحیح تاریخ یاد نہیں ہے۔ ایک بے وقوف کی طرح میں نے لاہور سٹیشن سے گھر کے لیے تانگہ پکڑا۔ مجھے کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ یہ فسادات کے عین درمیان کا وقت تھا۔ دوسری بار میں نے التجائیہ انداز میں درخواست کی اور موقف اختیار کیا کہ تم ان کے کھانے کا بندوبست کیسے کرو گے، وغیرہ وغیرہ... اور پھر بلّو کو ساتھ لے آئی۔ ٹرین میں وہ دوسرے ڈبے میں بیٹھا تھا۔ پتہ نہیں کون سی جگہ تھی کہ ایک شخص میرے پاس آیا اور بتایا کہ آپ کے ساتھ جانے والا لڑکا ٹرین سے نیچے گر گیا ہے۔ میں پاگلوں کی طرح بھاگی لیکن وہ بالکل محفوظ تھا۔ پھر وہ گوڑگاؤں نوکری کے لیے چلا گیا۔ لیکن اس طرح وہ ہم سے گویا لاتعلق ہو گیا... بہر حال بچے یوں سیٹل ہو گئے۔ پھر مجھے شملہ جانا پڑ گیا، جہاں تمھارے باپ رہتے تھے۔ مجھے اور کوئی راستہ سجھائی نہ دے سکا۔ وہاں کوئی ٹرین نہیں جا رہی تھی۔ میں نے کوشش جاری رکھی۔ پھر کسی نے مجھے بتایا کہ وہاں ٹیکسیاں جاتی ہیں۔ تم 600 روپے دے کر ایک سیٹ حاصل کر سکتی ہو۔ اس طرح میں نے 600 روپے جمع کیے اور وہ ادا کر کے دہلی سے شملہ روانہ ہو گئی۔ میں سامان ظہیرہ کے صندوق کے ساتھ پیچھے چھوڑ گئی تھی... جو مجھے کبھی واپس نہ مل سکا۔ میں نے اس سامان کو ہاسٹل وارڈن کے سپرد کیا تھا۔ بعد میں اگرچہ ہمیں صندوق مل گئے، ان پر تالے لگے تھے مگر اندر کچھ نہیں تھا۔

میرے لیے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ جب اسے میں نے دوبارہ دیکھا تو مجھے کیا محسوس ہوا۔ جب وہ مجھے ایئرپورٹ پر دکھائی دیا تو وہ پہلے والا دُبلا پتلا لمبا لڑکا نظر نہ آیا، جسے میں 40 برس قبل چھوڑ آئی تھی۔ اس کا وزن بڑھ چکا تھا اور وہ ہمارے والد جیسا نظر آیا۔ اگرچہ بکرم بھی بالکل لمبا ــــ تقریباً 6 فٹ تین انچ ــــ تھا، اس کی رنگت صاف تھی، میرے سامنے کھڑا رانا اپنے باپ کی ہو بہو تصویر تھا۔ یادوں کا ریلا بہہ نکلا، میرا بچپن، میری ماں، ایک بڑی بے وفائی... پھر بھی مجھے لگا کہ میں اپنے بھائی سے نفرت نہیں کرتی۔ میں نے اس کے لیے دُکھ محسوس کیا۔ وہ مجھے ایسا مجرم لگا جو اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔

جیسے ہی میں نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں لیا اس نے سرگوشی کی، ''کیا تم اب بھی ناراض ہو؟'' میں رو رہی تھی۔ ہم ایک ہی ماں باپ، ایک ہی خون کی اولاد تھے لیکن آج ہم اجنبیوں کی طرح تھے۔ دو دُشمن ملکوں کے باشندے تھے، میں نے سوچا، اس کا مذہب تبدیل کرنا میرے لیے زیادہ اہم نہیں تھا لیکن اس نے ماں کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر میں اسے معاف نہیں کر سکی۔ وہ ہمیں گھر لے جانے کے لیے کار لایا تھا۔ ہم اس جگہ کی طرف چل پڑے جو کئی برسوں تک ہمارا گھر رہا تھا۔ ہم اندر گئے تو میں نے اپنے گھر کو دیکھا۔ وہی شان دار جھلک، لیکن جیسے ہی میں اندھیرے سے گزر کر اندر گئی مجھے دو چیزیں نظر نہ آئیں۔ میرے باپ کا نام گیٹ سے مٹایا جا چکا تھا اور گھر کے اوپر پانی کی ٹینکی کے ساتھ لکھا بڑا ''اوم'' بھی غائب تھا۔ ہم رانا کے گھر والوں سے ملے۔ بیوی اور تین بیٹے۔۔۔ چوتھے کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہم نے خود کو آرام دہ محسوس کیا۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا لیکن تمام کمرے ہیٹروں کی وجہ سے گرم تھے۔ پاکستان میں پائپ کے ذریعے گیس کی فراہمی سستی ہے۔ صبح کے وقت مجھے پتہ چلا کہ گھر سے تمام پھلوں کے درخت اکھاڑے جا چکے تھے۔ رانا نے بتایا کہ اس نے پانی کی کمی کی وجہ سے درخت کاٹ ڈالے تھے، لیکن مجھے ایک قسم کا حساس محرومی ہوا، بلکہ یوں کہو جسمانی طور پر تکلیف محسوس ہوئی۔ ہمارے والدان درختوں سے کسی بھی چیز سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ مجھے یہاں بھی ایک بے وفائی محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا ہم نے تقسیم کے دوران میں بہت کچھ کھو دیا۔۔۔ اس کے سامنے درختوں کی کیا حیثیت ہے۔ اس وقت مجھے وہ درخت ہر کھوئی ہوئی چیز کا ایک نشان، ایک علامت لگے تھے...

جس روز تمھاری دوست لالہ مجھے لاہور گھمانے لے گئی مجھے ہر چیز بدلی بدلی دکھائی دی۔ میں ہال روڈ پر اپنا کالج دیکھنا چاہتی تھی، تاہم جب ہم وہاں پہنچے، کالج نظر نہ آیا۔ کالج وہاں سے منتقل کیا جا چکا تھا۔ میں کئی جانی پہچانی جگہوں کو دیکھنے گئی، لیکن کچھ بھی تو پہلے جیسا نظر نہ آیا۔ یہ عجوبہ روزگار شہر اب مسلمان بن چکا تھا۔ لاؤڈ سپیکروں سے مسلمانوں کو اذان کے ذریعے نماز کے لیے بلایا جاتا... دُکانیں، گلیاں ہر چیز مختلف تھی... میں پاکستان میں تھی۔ پورا دن میں گھر پر رہی مگر مجھے دوسرے کمروں میں جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ میری خواہش تھی کہ میں اس کمرے میں جاؤں جہاں میں رہتی رہی لیکن

MashalBooks.com

ہمت نہ پڑی۔ صرف ڈرائنگ روم کے اس طرف ایک نگاہ نے مجھے کھینچ لیا۔ دیگر کمرے متوقع شادی کے لیے جہیز کے سامان سے بھرے ہوئے تھے۔ اور کوئی بھی ان میں قیام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید وہ سب گھر کی پہلی منزل پر رہتے تھے۔ البتہ ڈنر پر پوری فیملی اکٹھی ہوگئی اور ہم نے لذیذ خوش گوار کھانا کھایا۔

چند روز بعد رانا ہمارے کمرے میں آیا اور باتیں شروع کر دیں۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے کہا: ''اگر یہ گھر نہ ہوتا تو میرا خیال ہے ہم سب اکٹھے ہی رہتے۔ میں مذہب تبدیل نہ کرتا اور اپنی زندگی میں سکون کے ہر لمحے سے محروم نہ ہوتا۔'' لیکن یقیناً میں نے اس سے پوچھا، تبدیلی مذہب میں اس کی اپنی مرضی شامل تھی؟ ''ہاں، لیکن مجھے ابھی تک قبول نہیں کیا گیا۔ ان کے لیے میں ابھی تک ایک ہندو ہوں، اگر میں مسلمان لڑکی سے شادی کیے بغیر رہ رہا ہوتا تو جیل میں ہوتا۔'' ہم ششدر رہ گئے۔ پھر اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے ایک بیٹے نے اس کے خلاف مقدمہ درج کرایا ہے کہ میں ایک ہندو جاسوس ہوں۔ ''میں یہاں بالکل ایک اجنبی کی طرح ہوں۔'' اس نے کہا، ''ایک شخص اپنے ہی گھر میں اپنی اولاد کے ہاتھوں شکار ہو گیا۔'' اس نے مجھے کئی بار کہا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ کسی کو اپنا مذہب تبدیل نہیں کرنا چاہیے۔

وہ پاکستان میں میری آخری رات تھی۔ مجھے یاد ہے جب اگلی صبح رُخصت سے پہلے میں ناشتے کے لیے بیٹھی، رانا نے ریفریجریٹر سے مکھن کا برتن نکالا۔ ''میں یہ نہیں بھولا کہ تمھیں مکھن کتنا پسند ہے۔ میں نے اسے کل تمھارے لیے ہی خریدا ہے۔'' اس نے برتن میرے سامنے رکھا تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ یہ رانا اور میرے درمیان آخری گفتگو تھی۔

میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ رانا سچ کہہ رہا تھا کہ نہیں۔ کیا صرف مذہب تبدیل کرنا ہی اس کا مسئلہ تھا؟ لیکن بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے مذہب تبدیل کیا اور اس پر قائم رہے—— کیا مذہب اتنا ہی اہم ہوتا ہے؟ یا وہ محض جھوٹ بول رہا تھا اور وقت سے پہلے اپنے بچاؤ کا طریقہ اختیار کر رہا تھا، میں واقعی نہ جان سکی۔



MashalBooks.com

3
حقائق

MashalBooks.com

MashalBooks.com

حصہ اوّل

منقسم زندگیاں

تقسیم ہند کے منصوبے (partition plan) کا اعلان 3 جون 1947ء کو کیا گیا تھا۔ ان لوگوں کو، جو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس فیصلے کے انتظار میں مختلف بحثوں میں لگے ہوئے تھے، اس اعلان سے بہت اطمینان محسوس ہوا۔ اس وقت کی کانگریس کی ایک کارکن سنکھو چودھری نے مجھے بتایا کہ ''ہم صورت حال میں اُتار چڑھاؤ سے اتنے اُکتا چکے تھے کہ 3 جون کا اعلان سن کر ہمیں بہت خوشی ہوئی، چلو کوئی تو فیصلہ ہو گیا،'' ہم نے سوچا۔ ''اچھا! آخرکار کوئی حل نکل ہی آیا۔ اب ہم آرام کر سکتے ہیں۔'' ایسے ہی جذبات کا اظہار کئی دوسرے ایسے افراد نے بھی کیا، جو بعد میں امدادی کارکن بن گئے، ان کا کہنا تھا، ''آخرکار، تذبذب اور بات بات پر اُلجھنے کی کیفیت اختتام کو پہنچ گئی اور اب نیا آغاز کیا جا سکتا ہے۔''

یہ حل درحقیقت کوئی حل تھا، نہ وہ آغاز کوئی آغاز تھا۔ اور اگر سیاسی رہنماؤں اور حکومت نے اجتماعی طور پر محض اس لیے سکھ کا سانس لیا کہ بالآخر معاملات طے ہو گئے تھے تو یہ ٹھیک نہیں تھا۔ دراصل اس طرح لاکھوں افراد کو لاچارگی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ تقسیم سے چند ماہ قبل اور دراصل 1947ء کے اعلان تقسیم کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو بڑی تعداد میں خطوط موصول ہوئے جن میں لوگوں نے پوچھا تھا کہ کیا ہونے والا ہے، ہمارا کیا بنے گا۔ ہمارا خیال ہے انڈیا تقسیم ہونے والا ہے، ہم کہاں جائیں گے؟ کیسے جائیں گے؟ ہماری ملازمتوں کا کیا بنے گا۔ اگر ہمیں جانا ہی پڑ جاتا ہے تو کیا نئے ملکوں میں (یعنی دونوں طرف) ہمیں پہلے والی نوکریاں دوبارہ مل جائیں گی؟ ہمارے گھروں کے ساتھ کیا ہوگا اور ہماری زمینیں؟ ایک

شہری جے بی کرپلانی نے 14 مئی 1947ء کے ایک خط میں کانگریس کو لکھا:

آپ کا یہ مشورہ کہ پنجاب کی اقلیتیں (ہندو یا سکھ جو خود کو اقلیت سمجھ رہے تھے) جو کہ اپنا دفاع نہیں کر سکتیں ہجرت کر جائیں، میرے لیے صدمے کا باعث بنا ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ نام نہاد طاقت وَر کانگریس یا تو پنجاب، بنگال اور سندھ کی مجبور اقلیتوں کے تحفظ میں ناکام ہو گئی یا ان کا دفاع نہیں کر سکتی یا پھر وہ ایسا کرنا نہیں چاہتی اور اس حوالے سے احتجاج سے گریزاں ہے۔

کانگریس، جو پہلے ہندوؤں کو اہنسا (عدم تشدد) کا درس دیتی رہی، اب ہجرت کرنے کا مشورہ دینے پر اُتر آئی ہے۔ کیا آپ پلیز ہمیں یہ بتانا پسند کریں گے کہ نقل مکانی کرنے والوں کو کون سی جگہ الاٹ کی گئی ہے۔ ان لوگوں کو باعزت طریقے سے آباد کرنے کے لیے کیا انتظامات کیے گئے ہیں۔ انہیں کہاں ہجرت کرنا چاہیے، کتنی تعداد کو اور کس طریقے سے؟ وہ اپنی غیر منقولہ جائداد کا کیا کریں؟ کیا آپ ہر کسی کے لیے ملازمت یا کاروبار کا بندوبست کر لیں گے؟ کیا وہ بھکاریوں کی طرح آپ کے قائم کردہ ان ریلیف کیمپوں میں رہیں اور بے یار و مددگاری کی حالت میں گزارا کریں جو خوف و ہراس کا شکار لوگوں کے لیے یو پی، سی پی، بہار اور بمبے وغیرہ میں قائم کیے گئے ہیں۔

ہم پانچ دریاؤں کی سرزمین میں آبرومندانہ زندگی گزارتے آئے ہیں اور بہاریوں، مدراسیوں اور یو پی کے ''بھیّوں'' کی طرح قابل عزت ہیں۔ ہم کو پورا احساس ہو چکا ہے کہ آپ لوگوں نے ہماری قیمت پر صرف 7 صوبوں کے لیے آزادی حاصل کی ہے اور ان حالات میں آپ کو پنجاب اور بنگال کے باسیوں کی کوئی فکر نہیں۔ اگر آپ ہمارے لیے صرف یہی کچھ کر سکتے تھے، اگر آپ کسی صورت میں اکثریتی یا اقلیتی صوبوں میں ہندوؤں کو محمدیوں کو قتل کرنے یا ان سے لڑنے کی ہدایت نہیں کر سکتے، اور اگر آپ ہمیں تحفظ نہیں دے سکتے اور ہم کو اپنا تحفظ خود ہی کرنا پڑتا ہے تو

پھر خدا کے لیے ہمارے معاملات سے ہاتھ اُٹھا لیں۔ آپ میں سے کسی کو اپنے پاؤں ہماری جلتی زمین پر نہیں رکھنے چاہئیں۔ ہمیں ایسی کسی نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں صرف باتوں سے نہیں بچایا جا سکتا اور باتوں سے ہمیں کوئی مادی امداد نہیں مل سکتی۔ ہمیں اپنے دفاع اور مدر انڈیا کا وقار بحال رکھنے کے لیے ٹھوس تعاون کی ضرورت ہے۔

ہم بدوؤں اور خانہ بدوشوں کی طرح نقل مکانی نہیں کر سکتے۔ ہم آخر دم تک لڑیں گے اور بھگوان نے چاہا تو جیتیں گے اور ہماری بقا ہو گی۔ لیکن ـــــ لیکن اگر دوسری صورت میں راولپنڈی جیسی قسمت کے فیصلے کے لیے ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے تو یہ بہتر ہے ـــــ بہت بہتر ـــــ بہت، بہت بہتر، کہ ہندو رہتے ہوئے خیرات کے ٹکڑوں کے لیے آپ کے اور آپ کی اولادوں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے بھکاری بننے، آپ کی ہنسی اور استہزا کا نشانہ بننے کی بجائے ہم مسلمان ہو جائیں۔

اگر آپ ہمیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتے تو ہم بھی آپ کا کوئی مشورہ قبول نہیں کر سکتے۔ ہم بھی آپ جیسے انسان ہیں، ہماری زندگیاں بھی اتنی ہی قیمتی ہیں جتنی آپ کی ہیں۔ ہم آپ کی اعلیٰ ظرفی اور بلند مرتبے کے لیے ''قصاب'' نہیں بننا چاہتے۔ ہم عزت کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر کانگریس ہمارے تحفظ کی صلاحیت نہیں رکھتی تو پنجاب میں کانگریس کی تنظیم توڑ کر ہندوؤں کو اپنی مرضی سے چلنے دیا جائے۔ ہمیں پارٹی کی اعلیٰ سطح سے یا آسمانوں سے بے سر و پا واعظوں کی ضرورت نہیں۔

جیسے آپ خود بزدل ہیں، ویسے آپ کے پرچار۔ کیسی بزدلی سے آپ اپنے موقف پر قائم ہیں۔ ہم آپ کو خیر باد کہتے ہیں، ہم اُجڑ جائیں یا آباد رہیں، مر جائیں یا زندہ رہیں، ہندو یا کسی بھی حیثیت سے رہیں۔ خدا کے لیے اگر آپ ہمیں کوئی مادی امداد فراہم نہیں کر سکتے تو ہم سے ٹل جائیں، دور ہو جائیں اور کچھ نہیں کریں۔ [1]

1: AICC Papers. F no-cl 9(part I)/ 1946. Punjab۔ میں نے یہاں خط کے اصل مندرجات اور سپیلنگ برقرار رکھے ہیں۔

یہ سوالات ـــــ جن کا بڑی حد تک جواب نہیں مل سکا ـــــ اور اس خط میں بالخصوص جس قسم کے احساس بے وفائی کا عکس نظر آتا ہے، یا کم از کام دل میں یک گونہ دھڑکا لگا ہوا دکھائی دیتا ہے، یہ کہ آگے جا کر کیا ہوسکتا ہے، اس وقت دیگر کئی لوگوں ـــــ ہزاروں، شاید لاکھوں ـــــ کو یہ یقین ہی نہیں تھا کہ کوئی تبدیلی آئے گی یا اگر تبدیلی آ جاتی ہے تو وہ مستقل نوعیت کی ہوگی، یقیناً ان کی زندگیوں کو اتنی آسانی سے موڑا نہیں جا سکتا تھا؟ راجندر سنگھ نے کہا، اور یہی بات کئی دیگر لوگوں کی آواز کی بازگشت ہے:

''سیاست دان، بادشاہ اور لیڈر ہر دور میں اقتدار کے لیے لڑتے رہے، بادشاہ اور لیڈر تو تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن لوگ بھلا ہمیشہ کے لیے کب بدلتے ہیں؟'' (راجے، مہاراجے بدلتے رہتے ہیں، لیکن پرجا کب بدلی ہے؟) وہ (راجندر سنگھ) اور لوگوں کی طرح غلطی پر تھا، لوگ بھی بدل جاتے ہیں اور اس تبدیلی کا جغرافیائی مقام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس نے کہا: ''جب حالات بہت زیادہ بگڑ گئے تو ہم نے جان لیا کہ رخصت کا وقت آ گیا ہے۔ یہ تمام علاقہ پاکستان میں شامل ہونے والا ہے، ہمیں جانا ہی ہوگا۔ زمین دار کہتے تھے، 'ہاں، ہاں تم دکان داروں کے لیے تو آسان ہے کہ تولنے کی مشین اور باٹ اٹھاؤ اور چل دو، لیکن ہمارا کیا بنے گا۔ ہماری تو زمینیں یہاں ہیں، اسے ہم کیسے ساتھ لے جائیں؟ ہم انھیں سر پر رکھ کر تو نہیں لے جا سکتے۔' دکان دار کہیں بھی سامان لے جا سکتے ہیں، اور لوگ ایک دوسرے کو یہی بتاتے رہے کہ نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ بادشاہ تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن کیا کبھی رعایا نے بھی کوئی جگہ چھوڑی ہے۔ جب رنجیت سنگھ نے حکومت شروع کی تھی تو کیا رعایا تبدیل ہوئی؟ جب سکھوں کا اقتدار آیا تو کیا انھوں نے مسلمانوں کو نکال باہر کیا تھا؟ وہ کہتے، فکر نہ کرو، کچھ بھی نہیں ہوگا... اسی طرح وہ ایک دوسرے کو یقین دہانی کراتے رہے، میرے والد نے کہا... انھوں نے کہا، کہانی ختم ہوگئی، ختم، اب تو دیہات میں بھی لوگ نظر نہیں ملاتے۔

سب سے زیادہ حیران کن یہ بات تھی کہ کئی لوگوں کی طرف سے تشویش کا اظہار ہونے کے باوجود بھارتی حکومت، پاکستانی حکومت اور بلاشبہہ برطانوی حکام نے

بھی اتنی بڑی آبادی کی نقل مکانی کا پیشگی اندازہ نہ لگایا۔ انھیں پتہ نہ چلا کہ ڈر و خوف کے باعث لوگ ان جگہوں پر نقل مکانی کریں گے جہاں ان کی اپنی طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ جس وقت تقسیم کا منصوبہ پیش کیا گیا، پنجاب میں پہلے ہی ایک بڑی خون ریزی رونما ہو چکی تھی۔ مارچ 1947ء میں ضلع راولپنڈی میں فسادات کے دوران میں ہزاروں افراد ہلاک ہوئے اور وسیع پیمانے پر لوٹ مار کی گئی، املاک نذرِ آتش کرنے کے واقعات ہوئے، تباہی پھیلی، عورتوں پر تشدد کے واقعات تقسیم کی خون ریزی کی علامت بنے۔ اس سے پہلے 1946ء میں بنگال، نواکھلی، بہار، گڑھ مکتیشور میں بھی تشدد پھیلا تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے ایک دوسرے پر حملے کیے تھے۔ اس طرح تقسیم ہند کے دو روز بعد یعنی 17 اگست کو پاکستان اور بھارت کے وزراء اعظم نے انبالہ میں ملاقات کر کے آبادی کے تبادلے پر اتفاق کیا۔ اس وقت تک وزارت بحالیات کی رپورٹوں کے مطابق پاکستان کی طرف سے 5 لاکھ افراد سرحد پار کر چکے تھے اور اتنی ہی تعداد میں آبادی نے دوسری جانب سے گھر بار چھوڑے۔ جب یہ بالکل واضح ہو گیا کہ لوگ ہجرت کریں گے تو دونوں حکومتوں کو مجبوراً اسے قبول کرنا پڑ گیا۔ تاہم جب مہاجرین کو جانے کی اجازت دے دی گئی تو انھیں اپنی مشینری، گاڑیاں، فیکٹریوں سے آلات اور دیگر اثاثے منتقل کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس سے نہ صرف ان کی نقل و حرکت سست ہو گئی بلکہ وہ اس ملک کے لیے بھی مفید ہو گئے جسے چھوڑ کر جا رہے تھے۔

اس کے بعد برسوں تک ـــــ بلکہ فی الحقیقت آج تک ـــــ تقسیم کی خون ریزی میں ملوث افراد خود سے پوچھتے ہیں کہ یہ وہ وقت تھا جس نے زندگی بھر، بلکہ آئندہ نسلوں تک تعلق کو تبدیل کر دیا۔ مختلف زندگیوں کے باوجود ایک دوسرے پر انحصار کرنے والے دُشمنی پر اُتر آئے۔ سرحدی گاؤں اٹاری کے رہنے والے سکھ ہرجیت نے کہا: ''میں بیان نہیں کر سکتا، ایک دن ہمارا پورا گاؤں قریبی مسلمان آبادی پر چڑھ دوڑا اور خون کی ہولی کھیلی۔ ہم مکمل طور پر وحشی ہو چکے تھے۔ اس کی قیمت مجھے 50 برس تک احساسِ ندامت اور نیند کے بغیر راتوں کی صورت میں ادا کرنا پڑی ـــــ میں ان لوگوں کے چہرے کبھی نہیں بھلا سکتا جنھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔'' اس کے احساسات جیسی ہی بازگشت ''دوسری جانب'' سے بھی سنائی دیتی ہے ـــــ ان میں ایک سابق فوجی ناصر

حسین شامل ہے۔ ''میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ مجھے اور میری عمر کے نوجوانوں کو کیا ہوا تھا۔ صرف دو روز کی بات تھی۔ ہم سب نفرت کی لہر میں بہہ گئے تھے... میں یاد نہیں کر سکتا کہ اصل میں مَیں نے کتنے لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ یہ ہمارے ذہن کی وہ حالت تھی جس پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔ ہمیں یہ تک پتہ نہیں تھا کہ ہم کیا کر رہے تھے۔'' ہر جیت کی طرح ناصر کو بھی اس وحشت پر آج تک ندامت محسوس ہوتی ہے۔

''دوسری'' طرف کے انسانوں کا اچانک دُشمن بن جانا، اس ''چیز'' کو مٹا دو اس سے قبل کہ وہ تمھیں تباہ کر دے، یہ کیفیت ہر ذہن پر سوار تھی۔ نفرت کے سوا تامل اور غیر جانب داری کا کہیں وجود نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ ان لوگوں کا شکار کرنے واپس آ گئے جنھوں نے خون ریزی میں حصہ لیا یا پھر اس سے لاتعلق رہے۔ ایک 70 سالہ پروفیسر بتاتا ہے کہ کس طرح پٹیالہ میں آر ایس ایس (راشٹریہ سیوک سنگھ) کے رضا کار کی حیثیت سے اس نے سر بازار ایک مسلمان عورت کی آبرو ریزی ہوتے دیکھی اور اس عورت کی چیخیں سنیں۔ زیادتی کے بعد اس عورت کو قتل کر دیا گیا۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ اور سن کر ٹس سے مس نہ ہوا کیوں کہ آر ایس ایس کے رضا کار کی حیثیت سے انھیں ''اُن'' کے لیے رحم دلی کے جذبات محسوس کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ 50 سال بعد وہ اس عورت کے ماتمی آنسوؤں اور اپنی بے توجہی کو یاد کرتے ہوئے رو پڑا۔

سیاسی رہنماؤں کی طرف سے نکالے گئے ''حل'' کے پیچھے چھپی ستم ظریفی کہیں نہ کہیں ظاہر ہو جاتی تھی۔ یہ ان کی خام خیالی تھی، اگر وہ تصور کر رہے تھے کہ متحارب دھڑوں کو جغرافیائی تقسیم کی لکیر کھینچ کر الگ کرنے سے مسئلہ حل ہو جائے گا۔ جنگیں اور لڑائیاں سرحدیں عبور کرنے اور سرحدوں کی بے حُرمتی کرنے کے لیے بدنام ہیں اور صدیوں کی پیچیدگی اور اُلجھاؤ، جسے الم ناک ستم ظریفی کہا جا سکتا ہے، کو حل سمجھا جا رہا تھا، حالانکہ دراصل یہی ایک مصیبت کا آغاز تھا۔

جب تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان کر دیا گیا اور دونوں فریقوں نے اسے قبول کر لیا تو اس کے نفاذ کے لیے ایک مشینری تشکیل دی گئی۔ اس وقت کا سب سے مشکل مرحلہ سرحدوں کا تعین تھا جس سے لاکھوں افراد کی زندگیاں تبدیل ہونا تھیں۔ اس مرحلے کو عارضی طور پر ملتوی کر دیا گیا۔ سرل ریڈکلف جسے پاکستان اور بھارت کے

MashalBooks.com

نقشے کھینچنے کی ذمہ داری سونپی گئی، وہ انتقال اقتدار کے وقت تک اپنا کام مکمل نہیں کر سکا تھا۔ اس طرح وجود میں آنے والی دو نئی مملکتیں آئندہ کئی برسوں تک اپنی حدود کے تعین کے لیے لڑتی رہیں۔ تقسیم کے منصوبے کے اعلان کے تھوڑے سے عرصے بعد 18 جولائی 1947 کو برطانوی پارلیمنٹ نے ''انڈین انڈی پنڈنس بل'' کی منظوری دی جو قانون بن گیا۔ اس میں شامل دفعات کے مطابق تقسیم کے مختلف امور کی انجام دہی کے لیے ماہرین کی 10 کمیٹیاں قائم کی گئیں:

(1) آرگنائزیشن، ریکارڈ اور سرکاری ملازمین
(2) اثاثہ جات اور مالی واجبات
(3) سنٹرل ریونیو
(4) کرنسی، سکے اور زرِ مبادلہ
(5) اقتصادی تعلقات (i)
(6) اقتصادی تعلقات (ii)
(7) کنٹریکٹس
(8) ڈومیسائل
(9) فارن ریلیشنز
(10) آرمڈ فورسز [1]

ان میں سے ایک کمیٹی بھی لوگوں کی زندگیوں میں اکھاڑ پچھاڑ اور ٹوٹ پھوٹ کا حل نکالنے کے لیے قائم نہیں کی گئی تھی۔ ماحول میں بڑھتی بداعتمادی اور خوف کی فضا کے باوجود لوگوں کے تحفظ پر خاطر خواہ توجہ نہ دی گئی۔ اس کے بجائے سادہ لوح سیاست دان لوگوں کو طفل تسلی دیتے رہے کہ وہ جہاں ہیں وہیں پرسکون رہیں گے تو حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ قبل ازیں اگست 1947ء میں گاندھی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ لوگ گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ''یہ وہ اقدام نہیں جو ہونا چاہیے تھا۔'' بعد ازاں اسی برس نومبر میں انٹرنیشنل ریڈ کراس کمیٹی میدان میں کود

1. After Partition Modern Inda Series, Delhi Publication Division, 1948, pp20-21

MashalBooks.com

پڑی اور کوشش کی کہ لوگ اپنے گھر نہ چھوڑیں۔ بار بار اپیل کی گئی کہ لوگ بالکل محفوظ ہوں گے لہٰذا اپنے اپنے گھروں میں رہیں۔

ان یقین دہانیوں اور تسلیوں کا بہرے کانوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ لوگ جان چکے تھے کہ جانا ٹھہر گیا ہے۔ انھوں نے جو دیکھ لیا تھا کہ راولپنڈی میں بہار میں اور نواکھلی میں کیا ہوا تھا۔ جب یہ کچھ ہو گیا تو نقل مکانی کا عمل سراسیمگی کا شکار نظر آنے لگا۔ تاریخ میں کبھی اس بڑی تعداد میں اور اتنی کم مدت میں لوگوں نے نقل مکانی نہیں کی۔ بس اس کا پیمانہ فریب نظری تھی۔ دونوں طرف سے ایک کروڑ 20 لاکھ افراد نے ہجرت کی۔ اگست اور نومبر 1947ء کے درمیان—— بہ مشکل 3 ماہ کے اندر—— 673 مہاجر ٹرینوں کے ذریعے لگ بھگ 28 لاکھ افراد نے ہندوستان کے اندر اور سرحد پار نقل وحرکت کی۔ صرف ایک مہینے میں لوگوں کی حفاظت پر مامور ''ملٹری ایویکیوشن آرگنائزیشن'' (ایم ای او) نے مشرقی پنجاب سے لوگوں کو نکالنے کے لیے 10 لاکھ گیلن پٹرول استعمال کیا۔ اختتام اگست تک فضائی راستوں سے بھی سرکاری افسروں اور امیر افراد کو منتقل کرنے کی سروس کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ سلسلہ اگرچہ محدود تھا، پھر بھی ہر روز چھ سے سات پروازیں بھارت اور پاکستان کے درمیان چلائی گئیں۔ جن میں سرگودھا، لائل پور، ملتان اور راولپنڈی کے مہاجرین سوار ہوتے تھے۔ یہ پروازیں دہلی، کراچی، لاہور، کوئٹہ اور راولپنڈی کے درمیان چلنے والی پروازوں کے علاوہ تھیں۔ اس طرح نومبر کے تیسرے ہفتے میں 32 ہزار مہاجرین نے دونوں طرف سے فضائی راستے استعمال کیے۔ مثال کے طور پر سندھ میں زیادہ تر کراچی سے براہِ راست سمندری روٹ کے ذریعے مہاجرین نے بمبے کو نقل مکانی کی۔ 21 نومبر تک ایک لاکھ 33 ہزار افراد نے سٹیمر اور بحری جہازوں کے ذریعے سفر کیا۔ یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو سکتی تھی لیکن کراچی بندرگاہ پر حکام نے یومیہ 2 ہزار افراد کو آمد و رفت کی اجازت دے رکھی تھی، کیوں کہ اس سے زیادہ تعداد کو سنبھالنے کی گنجائش نہیں تھی۔[1]

ان غریب لوگوں کے لیے جو ٹرینوں تک رسائی حاصل نہ کر سکے یا ان کے پاس بس وغیرہ کے ذریعے سفر کرنے کے وسائل نہیں تھے، وہ اپنے نئے ملک کی طرف پیدل چل پڑے۔ یہ عظیم ہجرت بڑے بڑے قافلوں کے ذریعے کی گئی۔ تقسیم کے دو ہفتے

1. After partition, pp, 50-55 :

بعد اس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں 30 ہزار ـــــ 40 ہزار افراد پر مشتمل قافلے نظر آئے۔ سب سے بڑا 4 لاکھ نفوس پر مشتمل تھا اور یہ انسانوں کی اتنی لمبی قطار تھی کہ اسے کسی بھی مقام سے گزرنے میں 8 دن لگ جاتے۔ 10 ستمبر سے 22 اکتوبر کے درمیان لائل پور اور منٹگمری سے ہندوؤں اور سکھوں کے 24 قافلوں کے ذریعے تقریباً 8 لاکھ 49 ہزار افراد نے بھارت کو ہجرت کی۔ خیال ہے کہ کم از کم 10 لاکھ افراد نے مغرب سے مشرق کی طرف پیدل سرحد پار کی۔ [1] ہر جگہ چاہے لوگ پیدل تھے یا گاڑیوں، کاروں، بسوں یا ٹرینوں پر سفر کر رہے تھے، حملہ آور ان کے انتظار میں گھات لگائے بیٹھے ہوتے۔ جیسے ہی قافلے دونوں طرف سے سرحد پار کرتے اور مخالف سمت میں جاتے، لوگ جنھیں پہلی نظر میں پہچاننا مشکل ہوتا، قافلے والوں سے پوچھتے کہ وہ مسلمان ہیں یا ہندو ـــــ پھر بھوک اور صدمے سے دوچار لوگ اچانک ایک دوسرے پر حملہ آور ہو جاتے۔ وہ سینکڑوں عورتیں جنھیں اغوا کر کے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا، ان کی اکثریت کو چلتے قافلوں سے ہی اُٹھایا گیا تھا۔ اس سفر کے دوران میں کئی بوڑھے، بچے، ناتواں، معذور اور محتاج افراد بوکھلاہٹ میں پیچھے چھوڑ دیے گئے۔ البتہ کچھ افراد کے پاس اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کے لیے وقت تھا۔ ستمبر میں ایک ناگہانی آفت آن پڑی۔ خلاف معمول بھاری بارشوں سے مواصلات کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ٹرینوں کی رفتار سست ہو گئی۔ سڑکوں سے سفر کرنا دُشوار ہو گیا اور قافلوں میں بارش کی وجہ سے لوگ بیماریوں کا شکار ہونے لگے۔ سڑکوں اور پُلوں کی مرمت کے لیے فوج کو طلب کرنا پڑا، اسی طرح فوج اور پولیس کو پیدل اور ٹرینوں کے ذریعے جانے والے قافلوں کی حفاظت کے لیے ساتھ لگایا گیا۔

لیکن پولیس زیادہ دیر محض پولیس کا کردار ادا نہ کر سکی ـــــ جس کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ امن و امان کا قیام اس کا فرض اوّلین ہے۔ اسی طرح فوج بھی خالصتاً فوج کی اس حیثیت سے زیادہ دیر کام نہ کر سکی ـــــ جو ہر لحاظ سے غیر جانب دار فورس ہو جس کے فرض صرف اس کام کی ادائیگی ہے جو انھیں سونپا گیا ہو۔ تقسیم نے غیر جانب داری اور مقصدیت کی اس دیومالا کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا جو ایک ریاستی

1: 'After Partition,'and H. Bhaskar Rao: The Story of Rehabilitation, Delhe, Department of Rehabilitation, 1967.

فوج کا خاصا سمجھا جاتا ہے۔ تقسیم کے وقت بنائی گئی پولیس میں 60 فی صد مسلمان شامل تھے۔ پاکستان سے ہندوستان جانے والے، اسی طرح بھارت سے ہندوستان جانے والے قافلے اسی صورت میں خود کو محفوظ خیال کرتے جب ان کی حفاظت پر ان کے اپنے عقیدے سے تعلق رکھنے والے سیکورٹی دستوں کو مامور کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ ایک محدود سطح تک ہی ممکن تھا کیوں کہ پولیس اور فوج کے لیے بھی سرحدی حدود کی پابندی لگائی جا چکی تھی۔

پاکستانی حدود میں ''پاکستانی فوج'' جیسا کہ وہ اسے کہتے تھے، مہاجر قافلوں کی نگرانی کرتی اور سرحد کی اگلی طرف بھارتی فوج کنٹرول سنبھال لیتی۔

اگر پولیس فورس میں 60 فی صد مسلمان تھے تو فوج میں یہ شرح الٹ تھی۔ یہاں مسلمان اہل کاروں کی تعداد 30 فی صد جب کہ باقی ماندہ غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔ ایک بار ملک کو تقسیم کرنے کا فیصلہ ہو گیا تو اس میں موجود ہر چیز بھی بانٹی جانی تھی۔ اس میں فوج بھی شامل تھی۔ نہ صرف آلات، ہتھیار، گاڑیاں، ٹینک، رائفلیں اور دیگر سامان بلکہ انسانوں کی بھی تقسیم کی گئی۔ اس طرح فوجوں کو نسلی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا۔ مسلمان فوجی پاکستان، جب کہ غیر مسلم بھارت کو دیے جانا تھے۔ پارٹیشن کونسل نے اس حوالے سے جو رہنما اُصول وضع کیے تھے اس کی شق (ایف) میں مسلح افواج کی تشکیل نو کے بارے میں طریقہ کار اس طرح بتایا گیا تھا:

> افواج کی تقسیم دو مرحلوں میں کی جائے گی۔ پہلا مرحلہ موجودہ تیار فورسز کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم پر مشتمل ہو گا اور اس مقصد کے لیے پلان تیار کیا جائے گا۔ اگلے مرحلے میں مختلف یونٹوں کی رضا کارانہ تبدیلی کی جائے گی۔ تاہم اس رعایت میں ایک استثنا ہو گا۔ بھارت میں تعینات ایسے مسلمان جن کا تعلق پاکستان سے ہو وہ بھارتی مسلح افواج میں شمولیت اختیار نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح پورے بھارت میں کام کرنے والے غیر مسلم فوجی پاکستان کی فوج میں شامل نہیں ہو سکیں گے۔[1]

اس کلاز کے تحت چوائس کی گنجائش موجود تھی۔ لیکن پاکستان میں رہنے والے

---

1. : فوجوں کی تشکیل نو کے بارے میں قائم کمیٹی، تقسیم ہند کے انتظامی امور کی نگرانی کے لیے تشکیل دی گئی 10 کمیٹیوں میں شامل تھی۔

مسلمانوں اور بھارتی علاقوں کے تعلق رکھنے والے سکھوں، ہندوؤں کے حوالے سے اس عنصر کی نفی کی گئی۔ یہ ایک نہایت بھدی منطق تھی، مثلاً اگر آپ لاہور میں فوجی کے طور پر تعینات ہیں تو آپ کو بھارت کی آرمی میں شمولیت کا اختیار نہیں، لیکن اگر آپ لاہور میں تعینات ہیں مگر ہندو ہیں تو آپ کو پاکستانی اور بھارت دونوں فوجوں میں سے ایک منتخب کرنے کا حق تھا۔ گورکھا فوج کو اس فارمولے سے الگ رکھا گیا۔ ان کی تعداد فوج میں 7 فیصد تھی۔ عام طور پر اُنہیں غیر جانب دار تصور کیا جاتا تھا، لیکن بہرحال ان کا تعلق ہندو ملک نیپال سے تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں گورکھا فوج کی دس رجمنٹیں تھیں۔ بھارت اور برطانیہ کے درمیان ایک عبوری سمجھوتے کے تحت چھ رجمنٹیں ہندوستان میں چھوڑ دی گئیں۔ باقی چار برطانوی فوج کے ساتھ بھیج دی گئیں۔ پاکستان سے بھارت آنے جانے والے افراد کے لیے سب سے محفوظ دستہ گورکھا فوج کا سمجھا جاتا تھا۔ اور انھیں ہندو اور مسلم فوجیوں سے زیادہ غیر جانب دار خیال کیا جاتا تھا۔

☆☆☆

پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کچھ ایسے لمحات بھی نظر آتے ہیں جب تمام معاملات انتہائی مضحکہ خیز دھائی دیتے ہیں۔ دو زندگیوں کی تقسیم انتہائی مشکل ہوتی ہے۔ لاکھوں افراد کی تقسیم پاگل پن ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا تقسیم کیا گیا۔ سرحدوں پر عملی لکیریں کھینچنا آسان کام نہیں تھا۔ دونوں طرف بچھائی گئی سڑکیں، ریلوے پٹڑیاں غیر منقسم رہیں۔ انھیں بھلا کیسے تقسیم کیا جا سکتا تھا؟ پانچ دریا ان کے درمیان بہتے رہے اور جو پہلے ایک ریاست کو پانی فراہم کرتے رہے تھے، اب تقسیم کیے جانا تھے۔ ان دریاؤں سے نکالی گئی نہروں سے پنجاب کے کئی حصوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور اپر باری دوآب نہر، جو لاہور اور منٹگمری (ساہیوال) کے اضلاع کو سیراب کرتی تھی، کا ہیڈ ورکس مشرقی پنجاب میں تھا، جب کہ زیر آب پاشی رقبہ مغربی پنجاب میں پھیلا ہوا تھا۔ دیپال پور نہر کو، جو مغربی پنجاب کے علاقوں کو سیراب کرتی تھی، فیروز پور بند سے کنٹرول کیا جاتا تھا اور فیروز پور اب بھارتی علاقے میں شامل تھا۔ ہر سرکاری شعبہ تقسیم کر کے ملازمین کو ہندوستان یا پاکستان میں جانے کا اختیار دیا گیا۔

اب وہ لوگ جو دوسری طرف چلے گئے تھے، ان کو نئے مسائل نے گھیر لیا۔

MashalBooks.com

ان کی پنشنوں کا کیا بنے گا۔ پراویڈنٹ فنڈ یا بنکوں سے لیے گئے قرضوں کی سوچیں بھی انھیں ستانے لگیں۔ بعض لوگوں کے لیے ممکن ہے کسی ایک ملک کا انتخاب آسان ہوا ہو، اکثریت کے لیے ایسا کرنا مشکل کام تھا۔ لیکن جب عملی طور پر منتقلی کا مرحلہ آ جاتا تو یہ کام اتنا آسان نہ رہ جاتا۔ غیر یقینی کی صورت حال بعض اوقات اتنی گمبھیر ہو جاتی کہ لوگوں کو جانے کے لیے کئی ہفتوں بلکہ بعض دفعہ کئی مہینے انتظار کرنا پڑتا۔ نوکریوں کے اس کال میں اُنہیں ملازمتیں کون دے گا؟ ان کی تنخواہیں کون دے گا؟ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا، اب ایک نہ ختم ہونے والی بحث کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا کہ یونیورسٹیوں کو تقسیم کیا جائے یا نہیں۔ ایسے سکالروں کی بھی بڑی تعداد موجود تھی جو اس شورش سے دور بیرون ملک سرکار کے خرچ پر اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اب ان کو بھی کسی ایک ملک کا چناؤ کرنا تھا اور یہ غیر یقینی اپنی جگہ موجود تھی کہ کسی ایک ریاست کی طرف سے جاری ہونے والے وظیفے کو دوسرا ملک کیوں کر برقرار رکھے گا۔ مشرقی پنجاب سے ہنرمند مسلمانوں کی بڑی تعداد کے چلے جانے سے وہاں ہوزری، دھاتی سامان اور ریلوے سے متعلق صنعتوں میں ورکروں کی قلت پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر بٹالہ سے مسلمان ہنرمندوں کے انخلا کے بعد وہاں دھاتوں کی صنعت زوال کا شکار ہو گئی۔ پنجاب کے دونوں حصوں کے درمیان تجارت پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ خام مال، کیمیکل اور مشینی آلات تک رسائی ممکن نہیں رہی تھی جو پہلے کراچی سے دست یاب ہوتے تھے۔ لہٰذا اب خریداروں کو بمبے کا رُخ کرنا پڑا۔ امرت سر کی اہم ترین ٹیکسٹائل انڈسٹری کو اب اندرون بھارت میں نئی منڈیاں تلاش کرنا تھیں۔ شہروں کی ساخت بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ لاہور، جسے پہلے ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل تھی، اس کا وہ مقام باقی نہ رہا۔ امرت سر جو کبھی پنجاب کا دل کہلاتا تھا اور اہم کاروباری مرکز تھا اب واہگہ بارڈر سے پہلے جی ٹی روڈ پر آخری شہر بن گیا تھا۔[1] بھاگنے کی جلدی میں ہر کوئی اپنے پیچھے جائداد چھوڑ گیا۔ نقدی زیورات، ذاتی اشیا، بنک کھاتے، سرمایہ کاری، سیف میں قیمتی چیزیں، پُرانے خطوط، بہی کھاتے... ہر طرح کی اشیا۔ کئی لوگوں کو یقین تھا کہ وہ واپس آ جائیں

1. Navtej purewal, "Displaced Communities': Some Impacts of Partition on Poor Communities" in "International Journal of Punjab Studies" vol,4 No"1 Jan-June 1997, 129-46.

گے، اس لیے انھوں نے زیورات، پیسہ اور سونا زمین میں کسی جگہ دفن کر ڈالا، لیکن یہ سب کیسے دوبارہ وصول کیا جا سکتا تھا؟ اگست 1947 کے بعد کے کئی مہینوں میں دونوں حکومتوں کے درمیان اس بات پر مذاکرات کا طویل سلسلہ چلتا رہا کہ کس کو کیا ملا ــــ یا چھوڑی گئی اشیا کیسے وصول کی جائیں۔ جن لوگوں کی چیزیں اور کھاتے بنکوں میں تھے انھیں وصولی کے لیے ''کسٹوڈین ایویکیوای پراپرٹیز'' (نگران متروکہ املاک) سے رجوع کرنا پڑا تاکہ اپنی اشیا وصول کرنے کی اجازت حاصل کر سکیں۔ جن لوگوں کے پاس نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ، ڈیفنس سرٹیفکیٹ اور اس قسم کی دیگر رقوم تھیں ان کا کلیم دونوں ملکوں کے کسی بھی ڈاکخانے کے ذریعے داخل کیا جا سکتا تھا، جس کے بعد تصدیق کی ضرورت ہوتی اور ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا اور پھر جا کر انھیں اپنی رقوم ملتیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان ہتھیاروں تک کا تبادلہ کیا گیا۔ پہلا تبادلہ فروری 1956ء کو لاہور اور اسی روز جالندھر میں کیا گیا۔ اسی نوعیت کے مزید چار تبادلے کیے گئے، جن کے اختتام پر فروری 1958ء میں بھارت کے حکام کو 1200 ہتھیار ملے، جنھیں ان کے اصل مالکان کو لوٹانا تھا۔ اس دوران میں 1954 سے مئی 1958 تک مجموعی طور زمین میں دبائے گئے خزانوں کی تلاش کے لیے 2200 کھدائیاں کی گئیں اور پاکستان میں ان کارروائیوں کے نتیجے میں 1300 کوششیں کامیاب ہوئیں اور 69 لاکھ مالیت کی رقوم برآمد ہو گئیں۔[1]

برطانوی راج کی نشانیوں میں سے ایک اس کا ایڈمنسٹریٹو نظام اور اس کا ''فائلوں'' پر انحصار تھا ــــ فائلیں جن پر کوئی نوٹ لکھا تھا یا وہ جو کلیئر ہو چکی تھیں، اور وہ جو ابھی التوا کا شکار تھیں ــــ 1947ء میں جب کہ ایک انتظامی سسٹم دو حصوں میں تقسیم ہو گیا یہ ضروری ہو گیا کہ تمام فائلوں کا ڈپلیکیٹ تیار کیا جائے۔[2] ان دِنوں فائلوں کی نقل اتنی آسان نہیں تھی جیسے آج کل ہوتی ہے۔ لہٰذا کئی ماہ تک وہ انتظامی افسر جنھوں نے پاکستان کا انتخاب کیا بھارتی وزارتوں میں ان دستاویزات کی نقول تیار کرتے رہے

1: The Partition of the Punjab: by Kirpal Sngh, Patiala Publications Bereau, 1972.

2: Slected Documents on Prtition of Punjab, 1947, India and Paistan' Punjab Haryana and Himachal-India and Punjab-Pakistan, Delhi, National Bookshop 1991, pp'144-46.

MashalBooks.com

جنھیں وہ ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ میں اکثر یہ سوچ کر حیران رہ جاتی ہوں کہ اگر کسی افسر کو فائل کی نقل تیار کرتے ہوئے نیند آ گئی ہو یا اس سے کوئی غلطی ہوگئی تو اس کے مضمرات کیا ہوئے ہوں گے؟ ان کی تفصیل سے تاریخ بھری پڑی ہے۔

☆☆☆

تقسیم کے منصوبے (partition plan) کے اعلان کے تین ہفتے بعد 30 جون 1947ء کو گورنر جنرل ہند نے پنجاب اور بنگال کے لیے باؤنڈری کمیشن تشکیل دیا۔ دونوں کمیشنوں میں دو مسلمان اور دو ہندو رُکن تھے اور دونوں کا سربراہ سَر سرل ریڈکلف کو بنایا گیا۔ انگلستان سے تعلق رکھنے والے اس قانون دان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ قانون کا زبردست ماہر، ایمان دار اور ''وسیع انتظامی تجربہ'' رکھتا تھا۔ اس باؤنڈری کمیشن کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ مسلمان اور غیر مسلم اکثریتی علاقوں کی بُنیاد پر پاکستان اور بھارت کی سرحدوں کا تعین کرے اور اس عمل کے دوران میں ''دیگر حقائق'' کو بھی مدنظر رکھا جائے—— اور اس موخرالذکر کا کیا مطلب تھا اس کی وضاحت کبھی نہ ہو سکی۔ اس کام کی تکمیل کے لیے صرف پانچ ہفتے کا وقت ملا۔ (ریڈکلف انڈیا میں 8 جولائی 1947ء کو آیا اور ایوارڈ کا اعلان 16- اگست 1947ء کو کر دیا گیا) اور ریڈکلف کو اس سرحد کے تعین کا فریضہ سونپا گیا جس نے 35 ملین آبادی کے صوبے (پنجاب) کے ہزاروں دیہات، شہروں، قصبوں، ایک مربوط، منظم نہری اور مواصلاتی نظام، 16 ملین مسلمانوں، 15 ملین ہندوؤں اور 5 ملین سکھوں، جو مذہبی اختلاف کے باوجود مشترکہ کلچر، زبان اور تاریخ رکھتے تھے، کو تقسیم کرنا تھا۔[1] توقع کی جاسکتی ہے کہ کمیشن کے ارکان کے درمیان ناقابل حل اختلافات ہوں گے اور مختلف سیاسی جماعتیں اپنے اپنے طور پر تشریح کرتی تھیں کہ سرحد کہاں کھینچی جانا چاہیے۔ جہاں مسلمان آبادی کی بُنیاد پر علاقوں کا دعویٰ کر رہے تھے اور وہ مسلمان اکثریتی آبادی کے اضلاع پر حق جتا رہے تھے وہیں غیر مسلم یعنی ہندو ''دیگر حقائق'' کی بُنیاد پر سرحدوں کی تقسیم چاہتے تھے—— وہ چاہتے تھے کہ لاہور مشرقی پنجاب کا حصہ بنے کیوں کہ ''اس شہر کی نہ صرف ہندوؤں اور سکھوں سے تاریخی وابستگی تھی'' بلکہ یہاں کی صنعت و تجارت کی ملکیت زیادہ تر غیر مسلموں کی

1. After Partition' pp,28-29 :

تھی۔ تاہم اگر تقسیم کی لکیر مسلم اور غیر مسلم اکثریتی اضلاع کی بُنیاد پر کی جاتی تو سکھ عین درمیان سے تقسیم ہو جاتے تھے۔ پھر انھوں نے ایک نیا دعویٰ کھڑا کر دیا کہ ان کے تمام مقدس مذہبی مقامات پاکستان میں آ جائیں گے۔ پھر اسی اُصول کی بُنیاد پر ان مسلم اکثریت والے علاقوں کی بات کی گئی جہاں زیادہ تر زمینیں ان کی تھیں اور لینڈ ریونیو بھی وہ ادا کرتے تھے، صاف ظاہر ہے کہ ان متنازعہ دعوؤں پر عمل درآمد بہت مشکل کام تھا، اور آخر کار فیصلہ سرل ریڈکلف پر چھوڑ دیا گیا۔

ریڈکلف کا کام اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے پاس بہت کم وقت تھا، اسے علاقوں اور لوگوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا اور اُس وقت دست یاب مردم شماری کے اعداد و شمار پُرانے اور یقیناً زائد المیعاد ہو چکے تھے۔ عام طور پر سرحدیں جغرافیائی لکیروں ـــــ جیسے دریا، پہاڑ وغیرہ ـــــ کو مدنظر رکھ کر کھینچی جاتی ہیں، جہاں سرحد کے دونوں طرف نفرتیں ہوں وہاں جغرافیائی سرحدیں بھی مشکوک ہو جاتی ہیں۔ (دریا، مثال کے طور پر اپنی گزرگاہ تبدیل کرتے رہتے ہیں اور اس سے صورت حال کشیدہ ہو سکتی ہے) اور مذہبی قربت کسی صورت میں جغرافیائی حوالوں سے میل نہیں کھاتی۔ سکھوں کا مقدس ترین مقام ننکانہ صاحب وسطی پنجاب کے اندر واقع ہے۔ لاہور ایک ایسا شہر تھا جس سے امرت سر کی طرح دونوں مذاہب کے لوگ محبت کرتے اور برابر تعداد میں وہاں رہتے تھے۔ امرت سر نہ صرف اہم تجارتی اور مذہبی مرکز تھا بلکہ سکھوں کے نزدیک مقدس تھا، لیکن کئی مسلمان بھی اسے اتنی ہی محبت کرتے تھے۔ گورداس پور میں مسلمانوں کی آبادی اکثریت میں تھی لیکن سکھ یہاں کاروباری میدان میں چھائے ہوئے تھے۔ وہ لکیر جس نے سرحد کی شکل اختیار کر لی تھی، اس پر مسلمانوں کے لیے کئی متبرک مزار تھے، اور یہاں سینکڑوں سکھ، ہندو اور عیسائی وغیرہ عقیدت مند بھی حاضری دیتے تھے۔ سیاسی طور پر اس بات کی تحریک دی گئی کہ سرحد کے قریبی علاقوں میں ہم مذہب لوگ رہتے ہوں لیکن جغرافیائی حوالے ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ سیاسی تقاضے جغرافیائی حوالوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے لیکن آخر میں سیاست جغرافیے سے جیت گئی۔ قدرتی تقسیم کو نظرانداز کرتے ہوئے ریڈکلف کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایسی پیچیدہ لکیر کھینچیں جو دیہات، صحراؤں، مزاروں ـــــ حتیٰ کہ لوگوں کی زندگیوں میں سے گزرتی چلی جائے۔ اسی طرح

جغرافیائی، ثقافتی، اقتصادی اور تجارتی تقاضوں سے بھی میل نہیں کھاتی۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مذہبی شناخت اور اکنامکس کی بُنیاد پر باہمی اشتراک کو فروغ دیا۔ وہ اپنے اس کردار کا حوالہ دیتے جو انھوں نے لاہور کی صنعت وحرفت کی ترقی میں ادا کیا۔ وہ بڑی تعداد میں بنکاری نظام، انشورنس، فیکٹریوں اور تعلیم کے مالک تھے اور جسٹس مہر چند مہاجن، جو باؤنڈری کمیشن کے ایک رُکن تھے، کے مطابق یہی وہ ''دیگر حقائق'' تھے جسے کمیشن کو زیرِغور لانے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ محض آبادی پر توجہ مرکوز کرنا کافی نہیں تھا۔

آخر میں وہی ہوا جس کی توقع کی جارہی تھی۔ کمیشن ایوارڈ کے فیصلے سے کوئی بھی فریق مطمئن نہ ہوا۔ اصل میں اطمینان بخش تقسیم کا کوئی راستہ تھا بھی نہیں۔ اخبار ''امرت بازار پتریکا'' نے اسے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر برطانوی سامراج کی الوداعی رات سے تعبیر کیا۔ جب کہ ''ڈان'' نے اسے ''ریاستی قتل'' قرار دیا اور لکھا کہ پاکستان کو ایک غیر منصفانہ ایوارڈ سے دھوکا دیا گیا۔ ایک استحصالی فیصلہ، شرم ناک جانب داری کا اقدام جو اس شخص (ریڈکلف) نے کیا جس پر اس لیے اعتبار کیا گیا کہ وہ غیر جانب دار تھا۔[1]

جہاں تک سرل ریڈکلف کا تعلق ہے وہ جانتا تھا کہ وہ خود کو برصغیر میں مقبول شخصیت نہیں بنا سکا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اب دوبارہ کبھی انڈیا نہیں آئے گا۔ اپنے بھتیجے کو خط میں وہ لکھتا ہے: ''پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے لیے میں نے جو ایوارڈ دیا اس کی بنا پر ہندوستان میں کوئی بھی مجھ سے محبت نہیں کرے گا اور اس فیصلے سے 8 کروڑ افراد مصائب کا شکار ہوں گے اور مجھے ڈھونڈتے پھریں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے تلاش کرلیں۔ میں نے ہندوستان میں قیام کے دوران میں کام کیا اور پسینے میں ڈوبا رہا... اوہ، میں ہر وقت پسینے میں شرابور رہا۔'' بعد ازاں ـــــ بہت عرصے بعد ـــــ جب ایک انٹرویو میں اس سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کو زیادہ وقت دیا جاتا تو کیا آپ کچھ مختلف ایوارڈ دیتے اور اس کا جواب تھا: ہاں انڈیا آمد پر میں نے سیاسی رہنماؤں کو بتایا کہ مجھے جو وقت دیا گیا ہے وہ بہت کم ہے لیکن جناح، نہرو اور پٹیل سمیت تمام لیڈروں

1. "After Partition": p,30

نے مجھے بتایا کہ وہ 15-اگست تک یا اس سے پہلے تقسیم کی لکیر چاہتے ہیں، لہٰذا میں نے ان کے لیے ایک لکیر لگا دی۔[1] ریڈکلف کی طرف سے سرحدوں کے تعین سے پہلے ہونے والی سیاسی پیش رفت نے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان جارحانہ رویوں میں اضافہ کر دیا۔ ان نفرتوں کا تعلق صرف مذہب سے نہیں تھا بلکہ زیادہ تکلیف ملازمتوں، گزر اوقات کے ذرائع، جائداد اور مادر وطن چھن جانے کی تھی۔ یوں ایک قسم کے مقابلے کی فضا قائم ہوگئی جو اہم اور ذرا مختلف خطوط پر استوار تھی۔ مثلاً یہ کہ فلاں ملازمت کسی ہندو کو دی جائے یا مسلمانوں کو؟ صرف مذہب کا تصادم جغرافیہ سے نہیں ہوا —— نہ جانے دریا یا پہاڑ یا صحرا کے اس طرف کتنے ہندو یا مسلمان جائداد اور روزگار جیسی چیزوں کے لیے باہم دست وگریباں رہے ہوں گے۔

لیکن جہاں باہمی نفرتیں بڑی آسانی سے پلتی رہیں وہاں فوری طور پر سرحدوں کو قابل عمل نہ بنایا جا سکا۔ نئی سرحد کھینچنے کے باوجود لوگ اِدھر اُدھر آتے جاتے رہے۔ کئی برسوں تک پاکستان اور بھارت کے درمیان پاسپورٹ نظام رائج نہ ہو سکا۔ آج اس ابتدائی دَور کی ''ڈھیل'' الم ناک غلط بیانی محسوس ہوتی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ پاکستانیوں اور بھارتیوں کو دوسرے کے ویزے کے حصول کے لیے سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اگر خوش قسمتی سے ویزا مل بھی جائے تو انھیں دوسرے ملک میں آمد اور جانے سے قبل پولیس کو رپورٹ کرنا پڑتی ہے۔ انھیں دونوں ملکوں میں صرف تین شہروں میں جانے کی اجازت ہوتی ہے۔

ستم ظریفی دیکھیے، سخت مخالفت اور نفرت نے دونوں ملکوں کو بعض مشترکہ مسائل کا سامنا کرنے پر بھی مجبور کر دیا۔ دونوں ملک سخت ترین نفرت اور تلخ باہم انحصار کے تعلقات میں بندھے تھے۔ بڑی تعداد میں جولاہوں، درزیوں، زرگروں اور دیگر ہنرمندوں کی پاکستان منتقلی نے بھارت بالخصوص دہلی میں سخت مشکلات پیدا کر دیں۔ اسی طرح پاکستان میں اکاؤنٹس کلرکوں، بنکروں، وکلا اور اساتذہ کی بھارت روانگی نے اسی قسم مگر ذرا مختلف سطح پر مسائل کھڑے کر دیے۔ ایک نئے ملک کے طور پر پاکستان

---

1. Kirpal Singh, Select of Documents on Partition of Punjab, p'744۔ (مصنف کا ریڈکلف سے انٹرویو)

MashalBooks.com

کے پاس کرنسی نوٹ چھاپنے کا کوئی فوری بندوبست نہیں تھا۔ سکے ڈھالنے والا ''منٹ'' بھی بھارت میں تھا۔ نہ ہی اس کے پاس اپنا کرنسی نوٹ تھا۔ لہٰذا ایک سال تک پاکستانی کرنسی (پاکستان کے اپنے نوٹ کے اجرا تک وہاں بھارتی کرنسی رائج رہی) انڈیا میں پرنٹ ہوتی رہی۔ اسی طرح زیادہ تر سرکاری مواد اور سٹیشنری بھارت میں شائع کی گئی۔ اس مقصد کے لیے شملہ کے مکمل اور علی گڑھ کے گورنمنٹ پریس کے کچھ حصے پاکستان کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے۔ کرنسی کے امور کے لیے پاکستانی افسروں کو کئی ہفتوں تک بھارت میں تربیت دی گئی اور بھارت نے پاکستان کو معاملات چلانے کے لیے اکاؤنٹنٹ مستعار دیے۔ جولائی 1948ء تک سٹیٹ بنک آف پاکستان کے قیام تک ریزرو بنک آف انڈیا دونوں ملکوں کے امور چلاتا رہا۔ اس دوران میں پاکستان نے اپنا کرنسی نوٹ ڈیزائن کر لیا اور اس کے شائع ہوتے ہی بھارتی نوٹ غیر قانونی قرار دے دیے گئے۔ اور جیسا کہ ہر معاملے میں ہوا اس حوالے سے بھی دونوں طرف اختلافات سامنے آئے۔ پاکستان نے بھارت پر الزام لگایا کہ وہ ان بھارتی کرنسی نوٹوں کو کیش نہیں کر رہا جو پاکستان کے زیر استعمال نہیں رہے۔

☆☆☆

یہاں یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ پنجاب میں تقسیم کی وجوہات واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اگرچہ اکثریت سے ذرا کم غیر مسلم (ہندو اور سکھ) اقتصادی طور پر حاوی تھے، صنعتوں، زراعت اور کاروبار کی بڑی تعداد ان کی ملکیت تھی اور کئی غیر مسلم قرضے بھی دیتے تھے۔ اس طرح مسلمانوں نے ان کی برتری اور استحصال کے خوف کے باعث علیحدہ حیثیت کا مطالبہ کیا —— ان کا کہنا تھا کہ اقتدار میں صرف اپنے نمائندے کی موجودگی ہی سے اس قوم کے مفادات کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ تاہم انڈیا بھر میں ان قوموں کو علیحدہ طرز انتخاب کا حق دیا جا چکا تھا جو عددی اقلیت میں تھیں۔ یہاں پنجاب میں اگر مردم شماری کو مدنظر رکھا جائے تو مسلمان تھوڑی سی اکثریت میں تھے۔ لیکن ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں ان کی کمزور معاشی حالت ہی جداگانہ طرز انتخاب کے مطالبے کی اصل وجہ تھی۔ یوں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں میں اس کا ردِعمل منفی ہوگا کیوں کہ سکھ بھی ایک ہی طرح کے سلوک کی لابنگ کر رہے تھے۔ جو

بھی دعوے کیے جا رہے تھے انھیں منصفانہ قرار دینے کی توجیہات بھی پیش کی گئیں اور ایک فریق کا دعویٰ دوسرے کے لیے غیر منصفانہ سمجھا گیا۔

لیکن اختیار اور قانون ساز اسمبلی میں اپنی آواز کی بات ایک الگ چیز تھی۔ اسے ایک وطن اور الگ ملک کے مطالبے میں کیسے بدلا گیا؟ کیسے ــــ اور کب ــــ پاکستان بنانے کا آئیڈیا سامنے آ گیا؟ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی اس موڑ کا یقین کرنا مشکل ہے جب ایک خیال ــــ محض خیال سے بڑھ کر نیا روپ لے لیتا ہے ــــ تقسیم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ کتابوں میں اس موضوع کے حوالے سے اس کا اعزاز چودھری رحمت علی کو دیا جاتا ہے۔ بعض دیگر حوالے اسے شاعر محمد اقبال سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس آئیڈیے کے روح رواں ہندوستانی سیاست دان لالہ لاجپت رائے تھے اور اسے 1940ء میں قراردادِ لاہور (جسے اکثر قراداد پاکستان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے) کے موقع پر جناح نے ایک تصور کو عملی شکل کے طور پر پیش کیا۔ لیکن تصورات کی تاریخ اور جغرافیہ اتنا سادہ نہیں ہوتا۔ حالیہ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ قراداد لاہور کے بعد تک کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان بڑھتی کشیدگی سے قطع نظر محمد علی جناح جنھیں پاکستان کا خالق سمجھا جاتا ہے وہ پاکستان کے آئیڈیے کے حوالے سے متضاد خیالات رکھتے تھے جب کہ کانگریس اس سے اتنی گریزاں نہیں تھی جیسا کہ اس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے۔[1]

زمینی حقائق دیکھیں تو ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہبی اختلاف زیادہ شدید نہیں تھے۔ مورخ سُمِت سرکار نے نشان دہی کی ہے کہ تحریک آزادی اور تقسیم کی سمت بڑھنے والے واقعات دو متضاد عوامل تھے۔[2] کئی احتجاجی تحاریک ایسی تھیں جن میں ہندو مسلم اتحاد بہت نمایاں نظر آیا۔ اسی طرح وسیع سیاسی تناظر میں مختلف اقدامات کا ایسا سلسلہ ہے جس میں کانگریس اور مسلم لیگ نے اتحاد اور علیحدگی کا ایک پیچیدہ کھیل کھیلا۔ اس دوران میں انگریزوں نے محتاط چالیں چلیں۔ کبھی ایک فریق کی حوصلہ افزائی کی، کبھی

---

1 : مثال کے طور پر دیکھیے اعجاز احمد کا مضمون Tryst with Destiny—Free but Devided جو اگست 1997 کو ''دی ہندو'' میں آزادی کی 50ویں سال گرہ پر خصوصی ایڈیشن میں شائع ہوا۔

2 : Sumit Sarkar' "Modern India 1885-1947", Madras, Macmillan, India, 1983, Introduction

دوسرے کو تھپکی دی۔ انھیں زیادہ تر ان معاملات سے غرض تھی جس کا تعلق ان کے ملک سے تھا۔ (1945ء کے انتخابات میں لیبر پارٹی کی جیت) یا بین الاقوامی محاذوں سے متعلق معاملات تھے۔ (1939ء میں جنگ عظیم)

اس آئیڈیے کا پس منظر کچھ بھی تھا، بہرحال 1946ء تک یہ واضح ہو چکا تھا کہ انگریزوں کی رُخصتی اب ناگزیر تھی۔ جولائی 1945ء میں برطانیہ میں لیبر پارٹی بھاری اکثریت سے اقتدار میں آ گئی اور جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد اس حکومت نے بھارت میں انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ اس سے بہت عرصہ پہلے سنائی دینے والی بازگشت میں عالم گیر رائے دہی کی بُنیاد پر انتخابات کے وعدے لیے گئے تھے تاہم کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں کی طرف سے اسے پذیرائی نہ ملی۔ لیکن اس بار انھوں نے بھرپور مہم چلائی اور شان دار جیت سے ہم کنار ہوگئیں اور مسلم لیگ کو پہلی بار اہم ترین ریاست پنجاب میں نمایاں کامیابی ملی۔ اس کے باوجود یونینسٹ پارٹی، کانگریس اور اکالیوں کے درمیان سوچے سمجھے اتحاد کے باعث ایک واضح اکثریت مسلم لیگ کے حلقہ اثر سے باہر رہ گئی۔ لیکن یہ اتحاد بہ مشکل ایک سال سے زائد عرصے تک برقرار رہ سکا اور اس طرح مسلم لیگ کو پنجاب پر مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا، کیوں کہ پنجاب کے وزیراعظم خضر حیات خان ٹوانہ اس دوران میں جون 1947ء میں مستعفی ہو گئے تھے۔ اس بار ووٹنگ کی خاص بات اس کی فرقہ وارانہ (communal) نوعیت تھی، جس کے باعث اس وقت فرقہ وارانہ کشیدگی میں مسلسل اضافہ نظر آتا ہے۔ آریہ سماج اور سنگھ سبھا جیسی انتہا پسند جماعتوں نے پہلے ہی پنجاب میں جڑیں مضبوط کر لی تھیں۔ جب کہ اس دوران میں بعض نئے کردار منظر عام پر آ گئے، جن میں راشٹریہ سیوک سنگھ، مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور اکالی سَینا شامل ہیں۔ ان تمام نے بلا شبہہ مختلف مذاہب کے درمیان کشیدگی کو ہوا دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

اس کے بعد کچھ اور واقعات رونما ہوئے۔ فروری 1947ء میں برطانیہ کے وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے اعلان کیا کہ ''حکومت انگلستان جون 1948ء سے پہلے پہلے برصغیر ہندوستان میں انتقال اقتدار کر دے گی۔'' مسلم لیگ نے پنجاب میں حکومت حاصل کرنے کی ٹھوس کوشش کی اور پنجاب کے وزیراعظم کے استعفا سے یہ خواہش ایک

حقیقت بن گئی۔ 8 مارچ 1947ء کو راولپنڈی کے دیہات میں سکھوں کی اکثریت کے باوجود مسلمان ٹولیوں نے ان پر حملے کیے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کر کے پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا۔

یہاں متعدد ایسی تشریحات ہیں کہ یہ سب بکھرے تانے تقسیم سے کیسے جڑ گئے۔ اس پر ہونے والے مباحث انتہائی جانے پہچانے ہیں جس سے اس دَور کی تاریخ رقم کرنے کا مواد حاصل ہوتا ہے۔ میرا ان بحثوں میں اُلجھنے کا یہاں کوئی ارادہ نہیں کہ کانگریس یا مسلم لیگ میں سے کون قصوروار تھا یا یہ کہ انگریزوں نے اپنی رُخصتی کو کیا رنگ دیا یا پھر یہ کہ کون زیادہ متعصب تھا وغیرہ وغیرہ۔ میں کوئی تاریخ دان ہوں نہ مجھ میں اس کی صلاحیت ہے، نہ ہی بلا شبہہ مجھے ان سوالات کا جواب تلاش کرنے میں کچھ دلچسپی ہے۔ مجھے اس کے بجائے اس وقت کے لوگوں کی تقسیم یا اس کے نتیجے میں لوگوں کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات میں دلچسپی ہے۔ میں نے یہاں چھوٹے کرداروں اور محدود سطح تک کے کھلاڑیوں پر توجہ مرکوز کی ہے۔ جن کی زندگیاں، دیگر تمام لوگوں کی طرح بالواسطہ طور پر وسیع تر سیاسی حقیقتوں سے بُنی ہوئی ہیں۔ میرا کام ان حقیقتوں کے لوگوں کی زندگیوں پر پڑنے والے اثرات سے متعلق ہے۔

اس آئیڈیے نے کب جڑیں پکڑیں، تاہم تقسیم کا نظریہ نیا نہیں۔ مثال کے طور پر متحدہ انڈیا پہلے ہی بنگال کی تقسیم ہوتے دیکھ چکا تھا۔ لیکن کسی صوبے کی اندرونی تقسیم کسی ملک کی تقسیم سے بہرحال بالکل مختلف ہوتی ہے۔ پنجاب میں ابتدائی بحثوں میں ہی یہ کہا جانے لگا تھا کہ تقسیم کے دوران میں اس بات کا امکان ہے کہ صوبے کو مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا کیوں کہ ایک میں ہندوؤں اور سکھوں جب کہ دوسرے حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس حوالے سے تمام سکیموں پر غور کیا گیا۔۔۔ مثلاً انبالہ ڈویژن کو ایک فرقے کی اکثریت یقینی بنانے کے لیے الگ کرنا، اسی طرح راولپنڈی اور ملتان ڈویژنوں (منٹگمری اور ضلع لائل پور چھوڑ کر) کو صوبہ سرحد میں شامل کیا جائے تاکہ وہاں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہو سکے۔

یوں لگا جیسے اس مسئلے کی بُنیاد یہ تھی کہ صوبے میں تینوں مذاہب کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ کسی ایک برادری کو یہاں سے ہٹانے سے توازن تبدیل ہو سکتا تھا۔ اور شاید

اس سے مسئلہ بھی حل ہو جاتا، لیکن معاملات اتنے آسان نہیں تھے۔ انتخابی فتوحات، اقتدار پر محدود گرفت حاصل ہونے کے بعد دونوں پارٹیوں کو پتہ چل گیا تھا کہ اختیارات کو کیسے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کنفیوژن کی کیفیت میں اب وہ ایڈہاک ازم اور ٹال مٹول کی پالیسی پر گام زن تھیں۔ آزادی کی اصل تاریخ کی طرف پیش رفت ماؤنٹ بیٹن نے کی، وہ شخص جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ''جلدی'' میں تھا۔ اور سیاسی رہنماؤں نے بھی اس تیز تر ایجنڈے کی حمایت کی۔ اس طرح لوگوں کو فیصلوں کے لیے سوچنے سمجھنے کا بہت کم وقت دیا گیا۔ 1940ء سے پہلے نہرو سے منسوب ایک بیان میں کہا جاتا ہے کہ آزادی میں کسی تاخیر سے بہتر ہو گا ملک کو تقسیم کر دیا جائے۔ اس دَور میں ملک کی تقسیم کے بارے میں ہچکچاہٹ کے باوجود سیاسی رہنما، بالخصوص کانگریس پارٹی کے اندر، تقسیم کو آزادی کی ضروری قیمت خیال کرنے لگے تھے اور پھر ان اقدامات کی راہ ہموار کی گئی جن پر عمل کر کے وہ کچھ بنایا گیا جو بہ قول سردار پٹیل ''عضوِ بیمار'' تھا۔ جو خون بہایا گیا وہ صرف اس عضو کے زخم کا ہی نہیں تھا بلکہ اس میں ہزاروں جانوں کا ضیاع بھی شامل ہے۔

بعض تناظر میں تقسیم کا بیج اس پس منظر کے حوالے سے بویا گیا جس کا تعلق ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے مابین سماجی اور معاشی اختلافات سے جوڑا جا سکتا ہے۔ تقسیم کی بیشتر یادیں اس عمل سے پہلے کے ایام کو بیان کرتی ہیں، جب ہندو، سکھ اور مسلمان ـــــ دیومالائی طور پر ـــــ رواداری سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ تاہم اب یہ ہم آہنگی ٹھوس مادی اختلافات کی بُنیاد پر قائم تھی۔ روزمرہ کی سطح پر دیکھیں تو چند دیگر اختلافات بھی نظر آتے ہیں۔ بیر بہادر سنگھ نے، جس سے میں نے چند برس پہلے ملاقات کی تھی، مجھے بڑے زوردار الفاظ میں اس کے بارے میں بتایا!

> ''...اگر ایک مسلمان کسی سڑک کے کنارے آ رہا ہوتا اور ہم اس سے ہاتھ ملا لیتے، ہمارے ہاتھ میں فرض کریں کھانے کا کوئی ڈبہ یا اس جیسی کوئی اور چیز ہوتی تو وہ پلید ہو جاتی اور ہم اسے ہرگز نہ کھاتے۔ اگر ہم نے ایک ہاتھ سے کتا پکڑا ہوتا اور دوسرے میں کوئی کھانے کی چیز ہوتی تو ہماری چیز بالکل پاک رہتی، لیکن اگر ایک مسلمان آتا اور ہم سے ہاتھ ملا لیتا تو ہماری

دادیاں اور مائیں کہتیں، 'بیٹا اس چیز کو مت کھانا، یہ پلید ہو چکی ہے،' تو ایسا برتاؤ ہوتا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دو افراد ایک ہی گاؤں میں رہ رہے ہوں، ایک تو دوسرے کو اتنی عزت و احترام دے جب کہ دوسرا اس کو کتے کے برابر اہمیت دینے کو بھی تیار نہ ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا؟ وہ ہماری ماؤں اور بہنوں کو ''دیدی'' کہتے، ہمیں اپنا بھائی، بہن اور باپ کہہ کر پکارتے، جب بھی ہمیں ضرورت پڑتی، وہ ہمیشہ ہماری مدد کو تیار رہتے۔ لیکن جب وہ ہمارے گھروں میں آتے، ہم ان سے انتہائی بُرا سلوک کرتے۔ یہ واقعی بہت خوف ناک ہے اور یہی وہ وجہ تھی جو پاکستان کے قیام کا باعث بنی...''

☆☆☆

یہ ہیں تقسیم کے بعض ''حقائق''۔ عمومی طرز کو چھوڑ کر ان حقائق کو تاریخ میں غیر اہم تفصیلات کی حیثیت حاصل ہے۔ سب کو ہی ان کے بارے میں پتہ ہے اور میرے خیال میں انھیں یہاں دُہرانا ضروری ہے۔ میری دلچسپی چھوٹے کرداروں اور کھلاڑیوں میں ہے۔ حتیٰ کہ اگر میں تقسیم سے متعلق تاریخ پر پیچھے مڑ کر نظر دوڑاؤں تو میرا مقصد ان حقائق کی ''جامعیت'' کا سوال اُٹھانا نہیں ہوگا، بلکہ میرا سوال یہ ہوگا کہ میں ان حقائق کو مطلوبہ حد تک کیسے بیان کرسکتی ہوں؟ کیا ہم وسیع تر سیاسی مذاکرات کے نقطۂ نظر سے تاریخ تقسیم کو یاد کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں؟ تو پھر جن ''حقائق'' کا میں یہاں رونا رو رہی ہوں انھیں کہاں جگہ دی جائے؟ یہ داستانیں، ان کے نیچے اور پیچھے چھپے عنصر کو کہاں لے جاؤں؟ 10 سال تک لوگوں کی یادوں کو سنتے، ان کی کہانیوں کو جمع کرتے، میرے سامنے یہی سوال اُبھر کر سامنے آیا۔ ان کہانیوں سے مجھے کیا کچھ پتہ چلا، اور اپنے سیاق و سباق اور سیاست کے حوالے سے ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے یہ سوال بھی کہ کیا ''وہ'' تاریخ اب بھی کسی اہمیت کی حامل ہے؟ اس حوالے سے کیرولین سٹیڈمین (Carolyn Steedman) نے وہ کچھ بیان کیا جو میں سوچتی ہوں۔ میں کوشش کر رہی ہوں کہ اس عمل کی تشریح ہو جائے۔ (یا تشریحِ نو کہہ لیں) (''حقائق'' ـــــ ایک طے شدہ بات پر دوبارہ غور کرنے کا نام ہے، تاکہ اسے حالات حاضرہ کے معنی دیے جاسکیں) وہ لکھتی ہے، یہ نکتہ ماضی میں، دور کہیں گم شدہ اوراق جب وہ (واقعات)

رونما ہوئے، میں سے جھانکتا ہے۔ واحد نکتہ صرف تشریح میں چھپا ہوتا ہے۔[1] میری غرض ایک مختلف حقیقت، ایک مختلف تشریح سے ہے۔

میں نے اوپر جن حقائق کا ذکر کیا ہے یا وہ اعداد وشمار جن کا میں یہاں احاطہ نہیں کر سکتی، ان کے پس منظر میں انسان ہیں، گوشت پوست کے انسان، جن کی زندگیاں تقسیم سے سخت متاثر ہوئیں۔ کچھ لوگ تو میرے ماموں کی طرح مستقل احساسِ زیاں اور افسوس کے ساتھ زندہ ہیں؟ اور دیگر زیادتی کے زخم لیے زندہ ہیں۔ ہمارا ذہن اغوا جیسے تشدد کو بہت مشکل کے ساتھ آہستہ آہستہ قبول کرتا ہے۔ کچھ کو یہ ندامت ہے کہ انھوں نے ماضی میں قتل کیا... یہ بھی ممکن ہے جب کوئی تقسیم کے ''حقائق'' کے پیچھے دیکھنے کی ہمت کرے، پھر یہ مختلف اور تہہ در تہہ تاریخیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ میں نے جو کہانیاں اس کتاب میں شامل کی ہیں، شاید روایتی تاریخ کی ترتیب سے ذرا مختلف انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ یہ روایتی طریقے جن میں دستاویزات، رپورٹوں اور تقریروں کی مدد لی جاتی ہے ان خاموش تفصیلات کے اندر نہیں جھانک سکتے جن تک پہنچنے کی میں کوشش کر رہی ہوں۔ مثال کے طور پر میں نے کسی تاریخی داخلی نکتے کا ذکر نہیں کیا جس سے مجھے کچھ دیکھنے میں مدد مل سکتی۔ روایتی طریقے پر چلتی تو مجھے اپنے ماموں کی طرح کی کوئی کہانی نظر نہ آتی، کوئی تاریخی دستاویز ان کے دُکھ اور بدبختی کو بیان نہیں کر سکتی، نہ ہی ان کے زخموں کی عکاسی، اور نہ ہی ان کی اُلجھن اور ندامت کا احاطہ ہو سکتا تھا۔ کوئی روایتی طریقہ ان سے متعلق ـــــ یا اس کتاب میں مذکور دیگر افراد کے بارے میں حقائق بتانے سے قاصر ہو گا ـــــ ان لوگوں کے بارے میں جن کے جسموں اور زندگیوں نے کردار ادا کیے، تقسیم پر زیادہ تر تاریخی حوالوں میں لوگوں کی حیثیت محض عددی ہے یا کچھ بھی اسے خوف ناک لفظ ''مخبر'' سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت محض ذرائع اطلاعات کی ہے، لیکن تقسیم کے حوالے سے میرے مطالعے کے دوران میں میرے لیے اہم وہ لوگ ہیں جن سے میں ملی اور جو تاریخ تقسیم کا جزوِ لازم ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ یہی لوگ ہیں جن کی زندگیاں تقسیم کی تاریخ ہیں، زندہ جاوید...!!

پھر اس کتاب میں کہانیوں اور تاریخوں کا تانا بانا بُنا گیا ہے، مجھے اس نکتے کی

1: Carolyn Steedman, Landscape for a Good Woman, London, Virago, 1986, pp:5-6.

وضاحت کرنے کی اجازت دیجیے! میں نے شروع میں تاریخ کے حقائق میں مسلح افواج کی تقسیم سے متعلق نکتہ بیان کیا ہے۔ منقولہ اور غیر منقولہ جائدادیں بانٹی گئیں، لوگوں کو پاکستان یا بھارت میں سے کسی ایک ملک کی فوج میں شمولیت کا اختیار دیا گیا۔ بہ ظاہر یہ ایک عام سی معلومات لگتی ہیں، لیکن مجھے اس میں کافی دلچسپی محسوس ہوئی: وہ کیا چیز تھی جس نے لوگوں کو فیصلہ کرنے میں رہنمائی فراہم کی ہوگی کہ وہ کسی ایک ملک کا انتخاب کریں؟ کیا یہ صرف مذہب ہوگا؟ اس کی تقسیم نے ان کی زندگیوں پر کیا اثر ڈالا ہوگا؟ عبدل شدل (Abdul Shudul) جو اس وقت برطانوی فوج میں سب سے کم رینک پر خدمات سرانجام دے رہا تھا کو بھی دیگر ساتھیوں کی طرح اس فیصلے کا اختیار دیا گیا۔ ایک بھارتی اور ایک پاکستانی فوجی افسر کے بورڈ کے روبرو پیش ہونے پر عبدل شدل نے تصدیق کی کہ وہ بھارت میں ہی رہنا چاہتا ہے۔ اس کا گھر اور خاندان یہاں ہے اور اگرچہ دہلی کے نواح میں واقع اس کے گاؤں بیگم پورہ میں کچھ گڑ بڑ ہوئی تھی، اس کے باوجود اس کا خیال تھا کہ اسے اپنے ہمسایوں سے کوئی خوف نہیں۔ اس نے بہت اچھی طرح ملازمت کی۔ اپنے خاندان کے ساتھ نیا آغاز کیا اور اس کے لیے وہاں قیام کرنا بہت آسان ثابت ہوا۔ لیکن پھر اچانک اس کی زندگی میں ایک موڑ آ گیا۔ کسی ممکنہ مشکل کی تشویش لاحق ہونے پر اس نے اپنی بیوی اور دو ماہ کی بیٹی کو اپنے بھائی ـــــ جس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تھا ـــــ کے پاس بھیج دیا۔ بھائی کے پاکستان جانے سے پہلے وہ دہلی کے ایک طرف مقیم اپنے سسرالیوں کے پاس روانہ ہوگئیں۔ لیکن رستے میں ہی ان کا سامنا مصیبت سے ہوگیا۔ انھوں نے اس گھر میں رہنے کے بجائے پُرانے قلعے میں قائم پناہ گزین کیمپ میں قیام کر لیا ـــــ تاکہ انھیں پاکستان بھیج دیا جائے۔ اس کیمپ میں جانے کے ایک ہفتے بعد وہ پاکستان کی جانب روانہ ہوگئے۔ اس صورت حال سے بے خبر عبدل شدل ایک دن سسرال سے اپنے کنبے کو لینے چل پڑا، لیکن اسے پتہ چلا کہ وہ تو وہاں پہنچے ہی نہیں تھے۔ پھر وہ کسی طرح پرانا قلعہ گیا تو اسے پتہ چلا کہ اس کے اہل خانہ تو ایک ہفتہ پہلے پاکستان جا چکے ہیں۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں انھیں ہلاک ہی نہ کر دیا گیا ہو۔ اس نے بتایا: ''میں جانتا تھا کہ پاکستان کو جانے والی ٹرینیں روک کر ان کے مسافروں کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا میرے خاندان سے بھی ایسا

سلوک کیا گیا ہوگا۔'' مایوس ہو کر وہ واپس گھر چلا آیا اور اکیلے زندگی گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ کچھ ہفتے بعد، بالکل اتفاق سے اسے اپنے بھائی کے صندوق سے ایک پتہ ملا، یہ پشاور کی وہ جگہ تھی جہاں اس کے بھائی نے رہنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ عبدل نے بھی وہاں جانے کی تیاری کر لی۔ اس نے بتایا، ''اس وقت کوئی پاسپورٹ کا نظام نہیں تھا، اس لیے جانا مشکل نہیں تھا۔'' اکتوبر 1947ء کو وہ پاکستان روانہ ہو گیا۔

اس کا پہلا پڑاؤ راولپنڈی آرمی ہیڈکوارٹرز تھا، یہاں خوش قسمتی سے اس کی بھارت میں اپنے پُرانے افسر سے ملاقات ہو گئی جس نے وعدہ کیا کہ اسے نوکری پر بحال کر دیا جائے گا۔ اس نے عبدل سے پوچھا، ''کیا واقعی تم پاکستان میں رہنا چاہتے ہو؟ کیوں کہ پہلے تم نے بھارت کو ترجیح دی تھی۔'' تاہم عبدل نے اسے یقین دلایا کہ وہ پاکستان میں ہی رہنا چاہتا ہے، کیوں کہ اس کی فیملی اب یہیں ہے، اور بھارت میں ایسی کوئی چیز نہیں جس کے لیے وہ وہاں قیام کر سکے۔ افسر نے کہا، وہ جو کچھ ہو سکا کرے گا۔ اگلے چند ماہ انڈیا میں آرمی ہیڈ کوارٹر کو چٹھیاں اور مراسلے بھیجتے گزر گئے اور درخواست کی گئی کہ عبدل شدل کی فائل پاکستان بھیج دی جائے کیوں کہ وہ اب پاکستان میں رہنا چاہتا ہے اور اس کا باضابطہ تبادلہ کیا جائے۔ وہ افسر جو خود بھی مہاجر تھا اکثر ہجرت کر کے آنے والوں کی مدد کے لیے تیار رہتا، اور یقیناً یہ بات ان افسروں کو پسند نہیں تھی جو مہاجر نہیں تھے، اس لیے عبدل کو شک گزرا کہ انہی کلرکوں میں سے کوئی ایک ہے جو انڈیا سے آنے والی اس کی ڈاک دبا کر رکھے ہوئے ہے، یا پھر شاید بھارت نے اس سے متعلق کاغذات ارسال کرنے کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ بہرحال اس کے کاغذات نہ آ سکے۔ پاکستان میں آرمی ہیڈکوارٹرز میں عبدل کے مطابق ایک عام تاثر یہ پایا جاتا تھا کہ انڈیا ان فوجیوں کا ریکارڈ بھجوانے میں سنجیدہ نہیں جنھوں نے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی تھی اور اس راہ میں تمام رکاوٹیں اور پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ اس طرح وہ بے چارا دونوں ملکوں کے درمیان رقابت میں ایک مذاق بن کر رہ گیا۔

اس دوران میں اس نے اپنے بھائی اور فیملی کو تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ وہ اسے لینے آ گئے اور وہ کچھ دیر کے لیے پشاور چلا گیا۔ عبدل نے کہا: ''لیکن ہم خوش نہیں تھے، ہم کسی کو جانتے نہیں تھے، لوگ مہاجروں سے زیادہ گھلتے ملتے نہیں

تھے اور میری بیوی کہنے لگی، چلو بھارت واپس چلیں۔ لہٰذا میں نے سوچا اب جب کہ مجھے ملازمت نہیں مل رہی، میں انڈیا واپس جا سکتا ہوں اور شاید مجھے پُرانی ملازمت بھی دوبارہ مل جائے۔'' فروری 1948ء میں وہ واپس انڈیا چلے گئے۔ بیگم پورہ میں ان کے گھر پر اب ایک ہندو مہاجر کا قبضہ تھا۔ انھوں نے اسے واگزار کرانے کی درخواست دی۔ عبدل واپس اپنے پُرانے دفتر گیا اور پوچھا کیا وہ دوبارہ اپنی ملازمت حاصل کر سکتا ہے؟ اس کے لیے اس نے کئی ماہ تک درخواستیں دیں۔ آخرکار 9 ماہ بعد اسے نوکری پر بحال کر دیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد اس کا گھر بھی خالی کر دیا گیا۔ ''اصل میں ہم نے ان لوگوں کو گھر خالی کرنے کو کہا تھا، لیکن وہ خود بھی کوئی مکان ملنے کے منتظر تھے، لہٰذا انھوں نے درخواست کی کہ ہم کچھ عرصہ انتظار کر لیں کیوں کہ وہ گھر ڈھونڈ رہے ہیں۔ انھوں نے گھر لوٹانے کا وعدہ کیا تھا اور پھر انھوں نے وعدہ پورا کیا۔'' آج عبدل شدل بیگم پورہ میں اپنے گھر میں رہ رہا ہے۔ اس کے ساتھ اب اس کی تیسری نسل بھی مقیم ہے۔ لگ بھگ وہ گاؤں کی واحد مسلم فیملی ہے، اس نے کہا: ''لوگ بدل گئے ہیں، پُرانے جاننے والوں میں سے اکثر چلے گئے ہیں، لیکن ابھی تک ہمیں کسی مشکل کا کوئی سامنا نہیں۔''

عبدل کی رام کتھا میں بظاہر ملک یا قوم کی اہمیت بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ اہم بات تھی کہ اس کی ملازمت کہاں تھی اور خاندان کہاں تھا۔ اگر یہ اسے پاکستان میں ملا تو وہ چلا گیا اور جب یہی چیز اسے واپس انڈیا لے آئی تو وہ چلا آیا۔ میں نے بار بار اس سے پوچھا کہ اس نے بھارت واپس آنا کیوں پسند کیا اور پاکستان میں اسے کس قسم کی زندگی درکار تھی؟ یہ سوال میں نے اس اُمید پر کیا کہ شاید اس کے اندر سے کہیں قوم پرستی اور حب الوطنی کا عنصر سامنے آ جائے، لیکن اس کا جواب، واضح تھا: ''میں اس لیے واپس آیا کیوں کہ وہاں مجھے اپنی ملازمت دوبارہ ملنے کا کوئی چانس نہ ملا۔ انڈین حکومت میرے کاغذات پاکستان نہیں بھجوا رہی تھی اور میری بیوی نے سوچا، 'آؤ واپس اپنے پُرانے گھر چلے جائیں۔' کم از کم ہمارے پاس رہنے کی کوئی جگہ تو ہے۔ لہٰذا ہم نے ایسا کر لیا۔'' اس طرح کی کہانیاں جیسی عبدل کی ہے وہ تقسیم کے ''حقائق'' کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں اور یہی کہانیاں ہیں جو ہمیں حقائق کے انکشاف کے اندر جھانکنے کے قابل بناتی

ہیں۔ بہرحال کسی ایک یا دوسرے ملک کی مسلح افواج میں شمولیت کے اختیار کا فیصلہ اتنا آسان نہیں تھا، اور یہ فیصلہ کرنا کسی کہانی کا اختتام نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ صرف ایک آغاز ہوتا۔ میرے ماموں کی کہانی، عبدل شدل کی زندگی، وہ کہانیاں جو آپ آگے چل کر کتاب میں پڑھیں گے—— میرے لیے یہ ہی تجربات ہیں، ان کے نتائج، احساسات، انکشاف، تقسیم کے معانی کی بناوٹ، سب کچھ ہے۔ جہاں پر آج میں کھڑی ہوں وہاں سے—— تقسیم کے بعد کے دَور کی پیدائش ایک خاتون، مہاجر والدین کی اولاد، حقوق نسواں کی علم بردار، جمہوریت اور سیکولرازم کی قائل مڈل کلاس بھارتی عورت ہونے کے ناتے یہی خیالات اور تاریخ ہے جو مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے اور ایک مختلف نقطہ نظر، ایک مختلف تشریح پیش کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ یہ وہ ہے جس طرح تاریخ نظر آتی ہے۔ میرے نزدیک جب آپ وسیع سیاست کے بجائے لوگوں کو شامل کرتے ہیں تو آپ گویا انھیں مرکزی اہمیت دیتے ہیں۔ اس کا مزید انکشاف مجھے بھارتی تاریخ کے تین اہم ترین کرداروں کے مطالعے سے ہوا: خواتین، بچے اور ہریجن—— جو ہندو معاشرے میں ادنیٰ ترین طبقہ ہے۔

☆☆☆

MashalBooks.com

حصہ دوم

راجندر سنگھ

کون سا نگر؟ کس جانب؟ کس سمت؟

راجندر سنگھ دہلی میں آٹو رکشا چلاتا ہے۔ سدیش اور میں نے 1990 میں اس سے بات چیت کا آغاز کیا۔ ہم شہر کے ایک حصے سے دوسری جگہ جانے کے لیے اس کے رکشے پر سوار ہوئے۔ رستے میں ایک جگہ اس کی عمر دیکھتے ہوئے ہم نے اس سے پوچھا: آپ کہاں سے آئے تھے؟ اس نے تجویز پیش کی کہ ہم اس کے گھر جائیں، جہاں وہ ہمیں اپنی کہانی سنائے گا۔ یہی کہانی ہمیں دہلی کے نواحی علاقے گاندھی نگر میں لے گئی، جہاں ایک طویل، تنگ، گنجان آباد گلی میں اس کا چھوٹا سا گھر تھا، جس میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہ رہا تھا اور دیگر تمام فیملیوں کی طرح، جن سے ہم نے رابطہ کیا، راجندر کے اہل خانہ نے بھی ہمارا خیر مقدم کیا، گویا ہم وہیں کے رہنے والے ہوں، راجندر سنگھ اور اس کے بھائی من موہن سنگھ کے ساتھ انٹرویو کے کئی ادوار کے دوران میں گفتگو میں بار بار ہمسایوں کی آمد و رفت سے رُکاوٹ پڑی۔ یہ لوگ متجسّس تھے کہ کیا ہو رہا ہے اور ان کی اپنی کہانیاں بھی تھیں جو وہ سنانا چاہتے تھے۔ کہانیاں شروع ہو گئیں لیکن لوگوں کی مداخلت سے ادھوری رہ گئیں۔ بعض اوقات اپنی داستان سناتے ہوئے راجندر اور من موہن کے خیالات کا سلسلہ کوئی اچانک سوچ آ جانے سے منقطع ہو جاتا اور وہ خود سے پوچھتے کہ یہ بات بھی بتا دی جائے۔ جیسا کہ عام طور پر گھریلو ماحول میں ہوتا ہے، ہمیں بیویوں سے بات چیت کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ ماسوائے ان چند مخصوص لمحات کے جب کبھی وہ ہمیں اکیلی مل گئیں۔ اس حوالے سے ہم ابتدا میں کچھ فکر مند ہوئیں، پھر ہم نے

فیصلہ کر لیا کہ مرد و خواتین سے بہ یک وقت بات نہیں کریں گی بلکہ علیحدگی میں رابطہ کیا جائے گا۔

تقسیم کے معانی مختلف لوگوں کے لیے مختلف تھے۔ راجندر سنگھ کے لیے اس کی زبردست یادداشت نہ صرف ایک واقعہ ہے بلکہ ایک ایسا معاملہ ہے جو تقسیم سے چند ماہ قبل رونما ہوا جب وہ ایک لڑکا تھا۔ وہ گھر سے بھاگ کر ہیرا منڈی لاہور میں گلوکاروں اور طوائفوں کے ایک گروپ میں شامل ہو گیا۔ گم شدگی کے چار برس بعد اس کے والد نے اسے تلاش کر لیا اور ''کوٹھے'' سے گھر واپس لے جانے کے لیے وہاں آ گیا۔ راجندر نے کوٹھے کی چھت پر کھڑے ہوئے اپنے والد کو بازار میں سے گزرتے دیکھا۔ وہ بوڑھے باپ پر کسے جانے والے فقرے اور طنزیہ فقرے سنتا رہا اور پھر اس نے دیکھا کہ ''گھر'' کی سیڑھیوں کے پاس ایک گل فروش اس کے باپ کے نزدیک آیا اور جان بوجھ کر اسے ٹھوکر لگائی۔ بوڑھا آدمی نیچے گرا تو سکھ مذہب میں عزت و احترام کی نشانی اس کی پگڑی کھل کر زمین پر آ رہی۔ احساسِ ندامت کے ساتھ اس نے خود کو سنبھالا اور پگڑی باندھ کر واپس چل دیا۔ اس جگہ (کوٹھا) جہاں وہ رہنا چاہتا تھا کی محبت اور باپ سے ہمدردی کے جذبات سے وہ ذہنی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا اور بے اختیار باپ کے پیچھے ریلوے سٹیشن کو چل دیا اور پھر اپنے گھر چلا گیا جہاں اس نے ڈسکہ میں ظروف سازی کے کارخانے میں ملازمت اختیار کر لی۔

یہی وہ موڑ تھا جب میرا واسطہ تقسیم کے بعد تقسیم کے شواہد سے پڑا اور وہ نمایاں ہو کر میرے سامنے آئے۔ کسی فیکٹری کا ہندو مالک سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں سب کو ملازمتیں دیتا تھا لیکن جیسے جیسے تقسیم کا وقت قریب آتا گیا ان کے درمیان جنگ سی چھڑ گئی۔ راجندر اپنے ساتھی مسلمان مزدوروں کے لیے دُشمنی اور نفرت کے کوئی جذبات نہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی داستان سنائی ــــ جس کا کچھ حصہ میں نے یہاں پیش کیا ہے ــــ تاہم اس میں حقائق اور سچائی کا ہر ممکن خیال رکھا گیا ہے۔ دیگر کئی لوگوں کی طرح جن کا کوئی پیشہ نہیں تھا راجندر نے بھی انڈیا آ کر مختلف کام شروع کیے۔ پہلے وہ امرت سر میں حلوائی کی دُکان پر کام کرتا رہا، پھر حلوائی کی اپنی

دُکان کھول لی۔ کچھ عرصہ تانگہ چلایا اور جب ہماری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنا سکوٹر رکشا چلا رہا تھا۔ میں نے کتاب میں راجندر کے انٹرویو کا ایک حصہ اس لیے شامل کرنا مناسب سمجھا کیوں کہ اس نے بتایا کہ وہ خود اور اس کا خاندان کس طرح پیدل ایک قافلے کے ذریعے روانہ ہوا اور کس طرح دیگر مہاجرین قافلے میں شامل ہوتے گئے۔ مخصوص فاصلے تک قافلے کی حفاظت پاکستانی فوج نے کی۔ پھر اسے بھارتی فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے کہا کہ اس نے آج تک کسی کو اصل کہانی نہیں سنائی۔ اس کے پوتے پوتیاں بہت چھوٹی تھیں جب کہ بچے اپنے کام کاج میں مصروف تھے اور انھیں کچھ سننے کی فرصت نہیں تھی۔ اس طرح ہم اسے سننے کے لیے بیٹھ گئے، افرادِ خانہ بار بار آتے۔ ہم سے بھی ایک سوال کبھی دوسرا سوال پوچھتے اور جواب دینے کو کہتے۔ وہ ایسے کہتے جیسے ٹیپ ریکارڈر میں ان کی آواز زیادہ اہمیت کی حامل ہو۔ راجندر نے جو تفصیلات یہاں بیان کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ کیسے عجلت میں لوگوں کو اپنے گھروں سے روانہ ہونا پڑا۔ انھیں ایسا کرنے کے لیے کیسے قائل ہونا پڑا اور جب ایک بار انھوں نے ایسا کر لیا تو انھیں راستے میں کتنی دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ہمیں ایک عورت کے بارے میں بتایا جس نے دریائے ڈیک (نالہ ڈیک) کے کنارے ایک بچی کو جنم دیا۔ (اور اس کی ماں نے بتایا کہ اس بچی کو زندگی بھر ''ڈیکو'' کے نام سے پکارا گیا) ایک بوڑھے کی بھی کہانی بتائی جس نے اس عورت کو مدد کی پیش کش کی کیوں کہ وہ بے چارا اپنی پوتی کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس پوتی کو اغوا، یا قتل کیا گیا یا پھر جانے دیا گیا۔ لیکن حاملہ عورت سے ہمدردی کے اظہار سے ایک قسم کے احساس تلافی کا گمان ہوتا ہے۔ جیسے جیسے قافلے والے آگے بڑھتے چلے گئے، مجھے لگا راجندر کا بیان بھی اسی طرح آہستگی اور لاچاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جیسا کہ اس نے کہا کہ اَن جانے مستقبل کی جانب لوگوں کی زندگیاں ان قوتوں نے منتشر کیں جو ان کے کنٹرول سے باہر تھیں۔ اس کے الفاظ میں، ''ہمارے دل خوف سے بھرے ہوئے تھے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہماری منزل کہاں ہوگی؟— یہ وہ سوال ہے جو تقسیم کے حوالے سے ہر کہانی میں دوڑتا نظر آتا ہے۔

راجندر سنگھ

میری بوا کے بڑے بیٹے کے سسرالی رشتہ دار ایک گاؤں رجادے (Richade) میں رہتے تھے۔ میرا بھائی بوا کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ وہاں گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمیں بہرصورت یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ لہٰذا آؤ ہم سب ایک ایک کر کے روانہ ہوں تا کہ سب ایک ہی وقت میں نہ مارے جائیں۔ ہمیں ایک گونہ خوف تھا کہ ہمیں بالآخر مرنا پڑے گا۔ لیکن ہم نے سوچا اگر ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو شاید ہم ایک دوسرے کو کبھی مل سکیں اور ہم میں سے کوئی بچ بھی جائے۔ میں اپنی بیوی کو لینے چلا گیا... لیکن مجھے یہ پریشانی تھی کہ میرا بھائی پیچھے اکیلا رہ جائے گا۔ پھر ہم سب ایک جگہ جسے ''بابا مکھن'' کہتے تھے پر آ گئے۔ ہم وہاں گئے تو اس گاؤں کے لوگ وہاں کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم تو تعداد میں کم ہو، تم اس گاؤں کے لوگوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں ملا لیتے۔ یہاں کئی سکھ بھی ہیں، انھیں ساتھ لے لو، ہمارا قافلہ بڑا اور مضبوط ہو جائے گا۔ جب کہ گاؤں والوں کی تعداد کم ہے۔ ہم انھیں ساتھ ملا کر قافلے کا حجم کیوں نہ بڑھا لیں؟ اس طرح سے ہم نے ترقی کی۔ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہوتے رہے اور قافلہ بڑا ہوتا چلا گیا۔ اس کے بعد ہم ایک روز گاؤں گئے۔ دیکھا کہ تمام لوگ سکون سے سو رہے ہیں۔ یہ رات کے 9 بجے کا وقت تھا۔ وہ سب سوئے ہوئے تھے اور ان کو کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔ ہم ان کے پاس گئے اور انھیں بھی ساتھ چلنے کی پیش کش کی۔ انھوں نے کہا، ''نہیں! کیا ایسے واقعات پہلے کبھی ہوئے ہیں؟'' میں نے انھیں بتایا کہ اگر کبھی کچھ نہیں ہوا تو آج ہو سکتا ہے۔ اگر تمھارا خیال ہے کہ ایسے واقعات نہیں ہوں گے تو تم لوگ غلطی پر ہو، اب ایسا ہو کر رہے گا۔ میری بات سن کر بعض بزرگوں نے توجہ دینا شروع کر دی۔ انھوں نے نے پوچھا کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا، بالکل۔ باہر نکلو اور دیکھو، بابا مکھن جا کر دیکھو، وہاں بہت سے لوگ جمع ہیں اور انتظار کر رہے ہیں... جب ہم واپس بابا مکھن آئے تو ہمیں وہاں دو مزید گاؤں کے لوگ کھڑے نظر آئے۔ اب وہاں ایک ہزار کے لگ بھگ لوگ جمع تھے... پہلے وہاں صرف چار یا پانچ سو افراد تھے۔ ہندو، سکھ... وہ جو کچھ اٹھا سکتے تھے، بڑی یا چھوٹی چیز،

MashalBooks.com

اُٹھالی۔ انھوں نے اپنے کپڑوں کے اوپر کئی کپڑے پہن رکھے تھے اور کندھوں پر کھیس یا چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ جو کچھ اٹھا سکتے تھے، اٹھا لیا اور قافلے میں شامل ہو گئے۔ بھاری سامان بھلا کون اُٹھا سکتا تھا؟ اور پھر قافلہ روانہ ہوا۔ رستے میں اگلا گاؤں کھٹیانہ تھا۔ وہاں ایک شادی ہو رہی تھی۔ مسلمان کی شادی اور وہاں کافی آتش بازی اور ہلّا گُلّا جاری تھا۔ ہم نے سمجھا کہ وہاں فائرنگ ہو رہی ہے، اس لیے ہم نے قافلے کو گاؤں سے کچھ پیچھے روک لیا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ آگے جا کر صورت حال کا پتہ چلاتے ہیں... جب وہ جانے لگے تو لوگوں نے انھیں احتیاط برتنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ منہ اٹھا کر وہاں نہ جانا، ایسا نہ ہو کہ تم وہاں معلومات حاصل کرنے جاؤ، اور مارے جاؤ... وہ وہاں گئے اور موسیقی کی آواز سُن کر انھوں نے اندازہ لگایا کہ وہاں شادی ہو رہی تھی۔

اسی دوران میں دن چڑھ آیا۔ یہ راستے میں ہماری پہلی رات تھی جو اب صبح میں ڈھل چکی تھی اور جیسے ہی سورج طلوع ہوا بارش شروع ہو گئی۔ بارش بڑی زوردار تھی اور پانی میں بھیگ کر لباس بڑے وزنی ہو گئے تھے... حتیٰ کہ ہم انھیں اُٹھا بھی نہیں سکتے تھے، کپڑے بہت زیادہ گیلے ہو چکے تھے، لہٰذا لوگوں نے اُتار کر وہیں چھوڑ دیے۔ ہمارے پیٹ خالی تھے، ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ ہمارے کپڑے گیلے اور جسموں سے چپکے ہوئے تھے۔ دِلوں میں خوف بھرا ہوا تھا۔۔۔ ہم کہاں پہنچ گئے تھے؟ ہماری منزل کیا تھی؟ ہمارے دِل میں سخت رنج بسا ہوا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ ہم کہاں جائیں گے؟ تو صورت حال ایسی ہی تھی جیسے آپ گھر سے نکلے ہوں اور جانتے ہوں کہ آپ گاندھی نگر جائیں گے، لیکن ہمیں تو یہ تک معلوم نہیں تھا، کون سا نگر، کون سی منزل، کون سی سمت... ہمیں کھانے کی خواہش تھی نہ وہاں کھانے کو کچھ تھا، کیوں کہ گھروں سے نکلتے وقت ہم ساتھ آٹا نہ لا سکے تھے۔ ہم توے پر رکھی روٹی بھی نہ لا سکے۔ ہم نے سوچا تک نہیں تھا کہ ہم آٹا ساتھ لے جائیں، اسے گوندھیں اور پکا لیں۔ ہم ویسے بھی خالی ہاتھ تھے اور اسی طرح نکل پڑے۔ پھر کچھ لوگ بیمار ہو گئے۔ کچھ تو دُکھ وصدمے سے بیمار پڑ گئے تھے، کسی کو ہیضہ ہو گیا تو کسی کو بخار... کئی لوگوں کو اچانک روانہ ہونا پڑا تھا۔ وہ مکمل طور پر تندرست نہیں ہو سکتے تھے، کچھ تو پہلے سے ہی علیل تھے، کچھ کو صدمے سے بیماری لگ گئی۔ پھر کبھی بارش ہوتی، کبھی دھوپ نکل آئی، سرد و گرم کیفیت نے لوگوں کے

بدنوں کو کسل مند کر ڈالا اور ان تبدیلیوں سے لوگ بیمار پڑ گئے۔ جس وقت دوپہر ہوئی ہم بٹیانہ میں تھے۔

ہمارے ساتھ ایک حاملہ عورت تھی اور اس کی زچگی کا وقت قریب تھا، پورا قافلہ چلنے لگا تو اس نے کہا میں نہیں چل سکتی تم لوگ آگے چلو، میں مرنے کو تیار ہوں، میرا کوئی نہیں جسے میں بلا سکوں، اپنی تکلیف میں خود برداشت کروں گی۔ تم میرے لیے فکر نہ کرو... میرے ساتھ جو بابا تھا، میں نے اس سے کہا، کچھ لوگوں کو بھلائی کرنے کی توفیق ہوتی ہے، تمھاری پوتی تمھارے ساتھ تھی، لیکن تم نے میرے ساتھ آنے کو ترجیح دی۔ میں نے کہا تم پریشان کیوں ہو رہے ہو... اس بے چاری عورت کی طرف دیکھو، اس کا بچہ ہونے ہی والا ہے۔ یہ ایک جوان عورت ہے اور دیکھو سڑک کنارے پڑی ہے... آؤ کچھ نیکی کا کام کریں۔ ہم سب بہت غم زدہ تھے اور سب رو رہے تھے۔ اس نے کہا، یہ کیا ہے؟ میں بولا: اس لڑکی کو دیکھو، اس کا کوئی بھائی ہے نہ باپ، یہ بالکل اکیلی ہے، اس کا شوہر قتل ہو چکا ہے اور اس کو بچہ ہونے ہی والا ہے۔ اس کے قریب بعض دیگر خواتین بیٹھی تھیں اور جیسے ہی قافلہ چلا وہ بھی چل دیں۔ میرے ساتھ والا بابا اس لڑکی سے مخاطب ہوا: بیٹی تم میرے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ، جب کہیں بھی کوئی مدد دینے والا ملا، ہم تمھیں اس کے پاس لے جائیں گے۔ لیکن شاید خوف کے مارے اس نے وہیں بچے کو جنم دے دیا۔ وہ ایک بچی تھی، خوف سے بے نیاز۔ کسی کے پاس کوئی چاقو یا ایسا کوئی آلہ نہیں تھا۔ تم جانتی ہو کہ ناڑو کاٹنے کے لیے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں ایک شخص تھا جس کے پاس تلوار نما ایک چیز تھی۔ ہم نے بابا سے کہا یہ لو اور ہماری مدد کرو۔ اس طرح وہ تلوار عورتوں کو دی گئی جنھوں نے ناڑو کاٹ ڈالا۔ ہم نے قافلے کو پون گھنٹے تک روکے رکھا۔ ہم نے انھیں کہا تم لوگ اپنی آبرو پیچھے چھوڑ کر نامعلوم لوگوں کے گھروں کی طرف جا رہے ہو، اگر فرضِ محال تم کو وہاں دیر ہو جائے تو اس کا کیا مطلب لیا جائے؟ رستے میں ایک گاؤں پسرور بھی تھا، ہمارے ساتھ بلوچی فوج (مراد بلوچ رجمنٹ ہے: مترجم) حفاظت کے لیے آ گئی۔ انھوں نے ہمیں ایک سکول میں ٹھہرایا۔ انھوں نے خبردار کیا کہ جو کوئی اس چاردیواری سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا اس کو کاٹ کر رکھ دیا جائے گا۔ انھوں نے ہمارے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے کی کوشش

کی لیکن ہمارے پاس کھانے پینے کو کچھ نہیں تھا... اس لیے کچھ لوگ باہر گئے۔ انھوں نے ایک دُکان میں نقب لگائی اور مونگ پھلی کی چند بوریاں نکال لائے۔ ہم نے اسے بھونا اور کھا گئے۔ ہم اور کر بھی کیا سکتے تھے؟ کسی کے ہاتھ کچھ لگا، کسی کے ہاتھ کچھ، پھر کسی نے ہمت کی اور دیوار پھلانگ کر قریبی کماد کے کھیت میں گھس گیا تا کہ گنا چُرا سکے۔ فوج کے لوگوں نے ان میں سے بعض کو ہلاک کر دیا۔۔۔ ہماری آنکھ کے سامنے انھوں نے ایک جاٹ کو مار ڈالا۔ اس کے خاندان کے پاس ایک چھکڑا تھا، انھوں نے سامان اور دیگر اشیا اس پر لاد دیں اور لے آئے اور اسے آگ لگا کر اپنے مقتول رشتہ دار کی چتا جلائی...

نارووال کے بعد مدراسی فوج قافلے سے آن ملی... انھوں نے بلوچی فوجیوں سے کہا کہ اب وہ جا سکتے ہیں، کیوں کہ ان کی ڈیوٹی ختم ہوگئی ہے اور اب انھیں چلے جانا چاہیے... اس معاملے پر دونوں فوجیں ایک دوسرے سے اُلجھ گئیں۔ ایک نے کہا کہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔ دوسرے کا کہنا تھا، نہیں یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔ تمھارا فرض ختم ہو چکا، تم چلے جاؤ... کنوؤں میں ادویات اور زہر پھینک دیا گیا تھا۔ پھر ان میں مردے پھینک دیے گئے تھے۔ پینے کے لیے وہاں پانی نہیں تھا۔ ہم بھوکے، پیاسے تھے... کھانے کو کچھ تھا نہ پینے کو کچھ! پھر ہماری فوج نارووال میں دو ٹرک لے کر پہنچ گئی۔ انھوں نے ایک ترپال پھیلا کر آٹا رکھا اور کہا جس کو جتنا آٹا چاہیے لے لے۔ انھوں نے ہمیں مکئی بھی دی اور کہا اسے کھاؤ اور ان کے کھیت تباہ کر دو۔ مدراسی فوجیوں نے واقعی ہماری مدد کی، ہر کوئی صدمے سے دوچار تھا۔ کسی کی ماں مر گئی تھی، کسی کا باپ دُنیا چھوڑ کر جا چکا تھا۔ کسی کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا تھا... پھر ہم آگے روانہ ہوئے، تم جانتی ہو نا! تم کسی لاش کی موجودگی کا خوف محسوس کر سکتی ہو نا، بہرحال اب ہمیں کوئی خوف نہیں تھا... وہاں سے ہم دریائے راوی کے پُل پر آ گئے، وہاں انھوں نے بتایا کہ یہ دونوں ملکوں کے درمیان ہماری آخری حد ہے۔ ہم یہاں سے واپس ایک اور قافلے کی حفاظت کے لیے جا رہے ہیں جو ڈسکہ سے آ رہا ہے۔ ہم نے ہندوؤں سے بھری ایک ٹرین کو دیکھا جنھیں ہلاک کر دیا گیا تھا اور ڈیرہ بابا نانک میں مسلمانوں کی ایک ٹرین بھی ہم نے دیکھی ان سب کو قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ لوگ لدھیانہ سے آ رہے تھے کہ سب کے سب قتل کر دیے گئے... انھوں نے ایک دوسرے کے لوگوں کو مار

ڈالا تھا۔ ہم نے مسلمانوں کی لاشیں دیکھیں، برتن کیچڑ میں پڑے دیکھے، کپڑے... کچھ لوگ کپڑوں کے نیچے دفن تھے۔ بیماریاں اور امراض ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ جب ہم ڈیرہ بابا نانک پہنچے تو انھوں نے ہم سے کہا، تم اپنے گھر پہنچ چکے ہو، لیکن ہم نے سوچا، ہمارا گھر تو پیچھے رہ گیا ہے، یہ ہمارا گھر کیسے ہوسکتا ہے؟



MashalBooks.com

4
عورتیں

MashalBooks.com

MashalBooks.com

دمینتی سہگل

''سنانے کو بے شمار کہانیاں...''

پہلی مرتبہ میں دمینتی سہگل سے 1989ء میں ملی۔ اس وقت وہ 80 برس کی تھی ـــــ منحنی سی، چھوٹا قد، بچوں کی طرح شرارتی انداز میں مسلسل آنکھیں گھماتی توانا خاتون۔ مجھے دمینتی سے اس کی بھانجیوں لِینا اور ڈھینگرا نے متعارف کرایا۔ ایک روز میں جب تقسیم کے حوالے سے اپنے کام کی باتیں کر رہی تھی تو لِینا نے کہا، ''میری خالہ سے مل لیں۔ اس کے پاس سنانے کو بہت سی کہانیاں ہیں۔'' لیکن دمینتی اس حوالے سے زیادہ پُر جوش نہیں تھی۔ ''تم مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتی ہو؟ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں، کچھ اِدھر اُدھر کی بے ڈھنگی کہانیاں ہیں۔'' میں نے پھر اصرار کیا، ''کہانیاں چاہے بے ڈھنگی ہیں یا جیسی بھی، میں ضرور سنوں گی'' ـــــ اور جھجکتے ہوئے بالآخر وہ سنانے پر مان گئی۔

اس فیصلے کے بعد وہ میرے پراجیکٹ میں بھرپور طریقے سے شامل ہوگئی۔ اس نے میری یہ تجویز مسترد کر دی کہ میں اس کے گھر جا کر اس سے ملوں۔ اس کے بجائے اس نے کہا، وہ خود میرے پاس آئے گی۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ ''وہ میرے ساتھ کافی پیے گی، کھانا کھائے گی اور گپ شپ لگائے گی۔'' اور ہم نے پھر گپ شپ لگائی۔ یہ میرا پہلا اور آخری انٹرویو تھا جو پورے کا پورا میں نے اپنے گھر میں کیا۔ عام طور پر ہم نے لوگوں کو اس ماحول میں ملنے کو ترجیح دی جس میں وہ خود کو آرام دہ محسوس کریں اور اس لحاظ سے زیادہ تر ملاقاتیں لوگوں کے اپنے گھروں میں کی گئیں۔ بعد میں مجھے یہ سمجھ آئی کہ دمینتی کا میرے گھر پر ملاقات کے لیے اصرار دراصل طویل

عرصے سے اس کے لاشعور میں احساس بے گھری کا نتیجہ تھا کیوں کہ دُنیا میں کوئی بھی ایسا گھر نہیں تھا جسے وہ اپنا گھر کہہ سکے۔ جیسا کہ اس نے مجھے بتایا، ''ہاں تم ہر دوار میں میری چھوٹی سی جھونپڑی کو گھر شمار کر سکتی ہو۔''

پہلے دن جب ہم ملنے والے تھے، دمینتی اپنی بہن کملا بلاون ڈھینگرا اور اپنی بھانجی لِینا کے ساتھ آئی جب کہ میرے ساتھ میری دوست—— اور سفر میں ہمیشہ کے لیے میری ساتھی—— سدیش وید تھی۔ یہ طویل انٹرویو کئی مرحلوں اور کئی ماہ میں مکمل ہوا اور میرے دیگر انٹرویوز جن میں اکثر انفرادی کے بجائے اجتماعی تھے اور ہر کوئی گفتگو میں اپنی بات کرنے کے لیے تیار رہتا یہاں بھی ایک جگہ دمینتی کے انٹرویو کے دوران میں اس کی بہن اس سے کہتی کہ تم نے فلاں، فلاں بات کیوں نہیں کی۔ ایک اور جگہ کملا خود ہی کہانی سنانے لگی اور ابھی اس کی گفتگو جاری تھی کہ کچھ لوگ ہمارے کمرے میں آ گئے اور گفتگو کا سلسلہ نامکمل رہ گیا اور پھر نامکمل ہی رہا۔

جو انٹرویو آپ یہاں دیکھ رہے ہیں اس میں یہ عناصر شامل ہیں۔ اس انٹرویو کو ایک ترتیب دی گئی ہے—— یا یوں کہہ لیں کہ ایڈیٹ کر کے—— مسلسل بیانیہ شکل دی گئی۔ اگرچہ میں نے انٹرویو کی ترتیب برقرار رکھی ہے، میں نے آگے آنے والے انٹرویوز کی طرح نہایت احتیاط سے اور ارادتاً ان سوالوں کو جو میں نے اور سدیش نے کیے، اصل اقتباس سے ہٹا دیا۔ اسی طرح مختلف مداخلتوں اور اتفاقی ڈائیلاگ اور گفتگو کو بھی یہاں بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ البتہ دو مقامات پر میں نے دمینتی اور کملا کے درمیان بات چیت کو برقرار رکھا کیوں کہ میرے خیال میں اسے پیش کرنا ضروری تھا اور اسی حالت میں رکھنا مناسب تھا اور شاید ایسا کرنا ضروری بھی تھا کہ ان لمحات کو گرفت میں لے لیا جائے۔

میں نے جب دمینتی کے انٹرویو کے مسودے کو دوبارہ پڑھا (اس میں سے ایک حصہ قارئین اس مرحلے میں پڑھیں گے) تو میرے نزدیک اسے چار وسیع اور باہم منسلک حصوں میں تقسیم کرنا مناسب تھا۔ پہلے حصے میں دمینتی کا اپنی ذات کے حوالے سے بیان، تقسیم سے قبل اس کی زندگی، اس کی تنہا اور انتہائی لاچارگی و مفلسی میں اس جگہ جو پاکستان بن گیا، سے بھارت کو روانگی۔ اس حصے کو آپ یہاں پڑھیں گے۔ ذرا

آگے جا کر دوسرے حصے میں وہ سوشل ورک میں اپنی کم رفتار بلکہ آغاز میں جھجک سے بھرپور شمولیت پر لب کشائی کرتی ہے۔ جب کہ اسی باب کے آخر میں اپنے تیسرے اور چوتھے مرحلے میں اس کے اس کام کی تفصیل بیان کی گئی ہے جس کا تعلق پاکستان میں اغوا اور زیادتی کا شکار ہونے والی عورتوں کی ''تلاش'' ان کی ''مدد'' اور بحالی سے ہے۔ ان حصوں کی مخصوص نشان دہی نہیں کی گئی بلکہ ایک حصہ خود بخود دوسرے میں شامل ہوتا چلا جاتا ہے۔ تیسرا اور چوتھا حصہ، دوسرے حصے کا تسلسل ہے اور بعض طرح سے بالکل ایک ترتیب اختیار کرتے ہوئے اصل کام میں ضم ہو جاتا ہے۔ پہلے تلاش، پھر تلافی اور پھر بحالی، پہلی اور دوسری نوعیت کا کام ذرا خطرناک نظر آتا ہے۔ جب کہ تیسرا نسبتاً ''محفوظ'' ہوتا ہے۔ تاہم خواتین اور سماجی کارکنوں کے لیے بحالی کی سرگرمیاں بھی اکثر پُرخطر ہوتی ہیں۔ دمینتی نے اپنی پوری کہانی کے دوران میں ایک نئی مملکت کے ملازم ایک سماجی کارکن اور ذرا وسیع تناظر میں اپنے بھگوان یعنی ٹھاکر کی خادمہ کی حیثیت اور ایک عورت ہونے کے ناتے دوسری عورتوں کے لیے جذبات کی کیفیت کے درمیان میں ایک گونہ تناؤ کا ذکر کیا ہے۔ کئی خواتین نے مدد کرنے کے اس عمل کی مزاحمت کی تو دمینتی نے اپنے کام میں نجی قسم کی بغاوت برپا کر دی، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے ان دونوں میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ یہ حقیقت کہ اسے اپنی اس مخصوص بغاوت میں جو کامیابی ملی اس سے یقیناً اسے اپنی کلاس کے لیے کچھ کرنے اور اس تک رسائی کی راہ ہموار ہوئی۔ (یہ بات اس کی پاکستان میں ایک بڑے افسر اور بعد ازاں ایک ڈپٹی مجسٹریٹ سے تلخ کلامی کے واقعہ سے ثابت ہوتی ہے، جس نے ان خواتین کی عمر کی تصدیق کرنا تھی جن کے حوالے سے دمینتی کام کر رہی تھی۔

میرے نزدیک سدیش اور میں نے جو انٹرویو کیے ان میں دمینتی کا انٹرویو سب سے اہم ہے۔ کئی ماہ تک ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کے بعد ہم دوست بن گئیں۔ اس نے اصرار کیا کہ ہم اسے ''دانتی'' کہا کریں اور اگر مناسب سمجھیں تو اس کے ساتھ ''ماسی'' یا ''آنٹی'' کا اضافہ کر لیں۔ جس وقت ہماری اس سے ملاقات ہوئی، یا اس سے کچھ وقت پہلے یا بعد میں کہہ لیں، دمینتی نے اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ دہلی کے حوالے سے ہے، جہاں اس نے اپنی بہن کملا کے فلیٹ پر رہائش

اختیار کی جب کہ دوسرا ہردوار میں اس کی اپنے جھونپڑے یا کمرے میں سکونت کے حوالے سے ہے۔ آہستہ آہستہ اس نے ہردوار میں زیادہ عرصہ رہنا شروع کر دیا اور دہلی کا بہت کم چکر لگاتی تاوقتیکہ اس نے ہردوار سے آنے سے بالکل انکار کر دیا۔۔۔ اور آخرکار تنہائی کے عالم میں وہیں جان دے دی۔

دمینتی کی داستان بعض دیگر وجوہات سے بھی اہم ہے۔ تقسیم نے دمینتی کی طرح کئی ہزار عورتوں کو تنہا کر دیا تھا۔ اس دور نے خواتین کو اکثر ان کی شادی کی عمروں میں ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار کر دیا، اور انھیں ایک نارمل زندگی کے اُمور، جیسے شادی وغیرہ سے دور کر ڈالا۔ کرشنا سوبتی جو مشہور مصنفہ اور تقسیم کے اس دور کی عینی شاہد ہیں وہ بارہا ایسی عورتوں کا ذکر کر چکی ہیں جن کی زندگیاں تقسیم سے تباہ ہو گئیں۔ مہاجر خاندانوں میں کنبے کے تمام افراد ٹوٹے گھر کو بنانے اور تعمیرِ نو کے کام میں جُت پڑے۔ لڑکیوں اور نوجوان خواتین کو گھریلو اور پیشہ وارانہ کاموں کی انجام دہی کے لیے گھروں سے باہر نکلنا پڑا۔ جیسے جیسے حالات معمول پر آتے چلے گئے ان کی موجودگی بھی دھندلی ہوتی گئی۔ کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض خاندانوں میں خواتین پر اتنا انحصار کیا گیا کہ ان بے چاریوں کی اپنی خواہشات اور امنگیں پس منظر میں چلی گئیں۔ کچھ ایسے بھی واقعات ہیں کہ انھیں الگ تھلگ اور تنہا کر کے چھوڑ دیا گیا۔ دمینتی بھی ایسی ہی عورتوں میں شامل ہے۔ یوں کہہ لیں کہ وہ بے گھر ہی تھی اور سماجی سرگرمیوں کی طرف اسے اس کی آنٹی پریم وتی تھاپڑ نے راغب کیا۔ لیکن اس کا اپنے افراد خانہ سے تعلق برائے نام تھا۔ اس طرح خاندان والوں کو بھی اس بات سے بہت کم دلچسپی تھی کہ دمینتی کہاں ہے اور ایک بار جب وہ سوشل ورک کے شعبے میں آ گئی تو پھر اس میں اپنی زندگی کے کئی برس صرف کر دیے۔ خاندان کی طرف سے نظرانداز کیے جانے اور تنہائی کے احساس نے دمینتی کو سماجی کام کی دُنیا میں قدم رکھنے اور زندگی میں کچھ کرنے کی تحریک دی۔ جہاں تقسیم نے خواتین کی ایک پوری نسل کو تباہ کیا وہاں کئی عورتوں کو عوامی سطح پر کام کرنے کا موقع بھی فراہم کیا۔

میں اکثر حیران ہو جاتی ہوں کہ دمینتی اپنی تنہائی کو کیسے محسوس کرتی ہو گی۔ اپنے انٹرویو کے ابتدائی حصہ میں وہ پُرکشش نظر آنے کی خواہش کا اظہار اور شادی کے

بارے میں باتیں کرتی ہے... لیکن جس وقت تقسیم ہوگئی، یہ سب خواہشات کہیں کھو کر رہ گئیں۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس وقت اس کی عمر بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ (تقسیم کے وقت وہ 40 برس کی تھی) لیکن میرے خیال میں یہ عمر بہرحال سپنے دیکھنے کے لیے زیادہ نہیں تھی۔ بہرحال اس نے اپنا کام جاری رکھا، لیکن غالباً اس میں کسی قسم کا جذبہ شامل نہیں تھا۔ اس نے یہ کام اس لیے کیا کیوں کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔

مجھے کئی دیگر وجوہات کی بنا پر بھی دمینتی کا انٹرویو کافی اہم لگا۔ ایک تو یہ کہ اس کا اپنا یہ کہنا تھا کہ وہ حقیقت میں پہلی بار تفصیل سے اپنی داستان سنا رہی ہے، اور پہلی بار کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا ہے اور پہلی مرتبہ ہی وہ کسی کے کہنے پر اپنی یادوں کو جمع کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی بہن اور بھانجی نے بھی تصدیق کی کہ دمینتی نے جو واقعات اب سنائے ہیں وہ ان کے لیے بھی نئے تھے۔ ایک مقام پر کملا نے دمینتی سے پوچھ بھی لیا کہ اس نے یہ کہانیاں اسے پہلے کیوں نہیں سنائیں۔ اس طرح ان کو سنتے ہوئے میرے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہو گیا کہ کیا اتنے قریب رہتے ہوئے بھی لوگ ایک دوسرے کے بارے میں اتنے بے خبر اور لاتعلق رہ سکتے ہیں—— کہ انھیں دوسروں کی زندگیوں میں رونما ہونے والے واقعات کا ٹھیک طرح سے پتہ تک نہیں چلتا۔ میرے خیال میں دمینتی کو بھی اس بات کا اندازہ تھا اور ہم سب سے زیادہ اس عدم توجہی کا تجربہ تھا، کیوں کہ وہ تقسیم اور اس کے بعد کی دُنیا میں زندہ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہی وجہ ہو گی جس کی بنا پر اس نے کئی حوالوں سے بعد کے حالات میں تنہا زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ اسی طرح کئی حوالوں سے اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والے لوگوں سے تعلق قائم رکھا لیکن دوسری طرف وہ کئی حوالوں سے تنہا اور الگ تھلگ بھی رہی۔

میں مسلسل یہ سوچتی رہی کہ مغوی عورتوں کے بارے میں کچھ بیان کرتے ہوئے جب وہ یہ کہتی کہ یہ عورتیں تنہائی کا شکار ہو گئیں تو دراصل وہ اپنی داستان بیان کر رہی ہوتی تھی۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ جب ایک وقت میں اس نے اپنے اہل خانہ سے دوبارہ رابطہ کر لیا تو بھی دمینتی تنہائی کا شکار رہی۔ اپنی موت سے کچھ دیر پہلے وہ علیل ہوئی تو اس وقت وہ ہردوار میں تھی، لیکن اپنی بہن اور بھانجی کے بے حد اصرار کے باوجود اس نے دہلی آنے سے انکار کر دیا حالانکہ وہاں اسے صحت کی بہتر سہولتوں تک

رسائی ہوسکتی تھی۔ اپنی زندگی کی طرح اس کی موت بھی تنہائی میں ہوئی۔ بعد ازاں اس کے ''بیٹوں'' میں سے ایک ـــــ جو تقسیم کے دوران میں یتیم ہو گیا تھا اور دمینتی نے اسے ماں کی طرح پالا پوسا ـــــ اس کی لاش آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے دہلی لے آیا۔

دمینتی کے بیان کی اہمیت کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ اس نے کئی سال تک بھارتی حکومت کے ریکوری اور ریلیف آپریشن میں حصہ لیا۔ اسے اکثر پاکستانی پولیس کے اہل کاروں کی معیت میں سفر کرنا پڑا، جو اکثر نہ صرف اس کے اپنے ساتھ بلکہ اس تمام آپریشن کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کرتے رہتے۔ مجھے کسی کتاب سے زیادہ دمینتی کی گفتگو سے متاثرہ خواتین کی تلاش اور بحالی کے کام سے متعلق معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ خواتین سے زیادتی، جبری، اغوا اور شادیوں سے متعلق تشدد کے حوالے سے مجھے اس سے گراں قدر معلومات حاصل ہوئیں۔ حکومت کی طرف سے ایسے واقعات سے متاثرہ خواتین کی امداد کا آپریشن کیا گیا تھا۔ اس معاملے کو دیکھتے ہوئے ایک محقق کو مختلف قسم کی اُلجھن کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ بھلا تشدد کے تجربات سے گزرنے والی عورتوں کے خیالات کو کیسے منظر عام پر لاسکتی تھی؟ کیا اس نے تفصیلات حاصل کرنے کے لیے عورتوں کو تلاش کرنے کی سعی کی ہوگی؟ اس طرح میرے نزدیک دمینتی کا مغوی عورتوں کی ناراضی سے آگاہ ہونا دوہری اہمیت کا حامل تھا۔

ان تمام وجوہات کی بنا پر میں نے ارادتاً دمینتی کی رام کتھا سے اس باب میں اغوا اور زیادتی کا نشانہ بننے والی خواتین کی داستانوں کے تانے بانے کا کام لیا۔

دمینتی سہگل

تقسیم کے وقت میں اپنے گاؤں کوٹرا میں تھی۔ یہ گاؤں ملتان روڈ پر لاہور سے 20 کلومیٹر دور رائے وِنڈ سٹیشن کے قریب واقع ہے۔ ہمارا سب کچھ وہیں تھا۔ ہمارا ایک کارخانہ بھی تھا۔ چونکہ میں نے شادی نہیں کی تھی اس لیے میں اپنے والد کے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ میری ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ میں ہی اپنے والد کی مونس وغم خوار تھی، جو کچھ ہوا... میرے والد کا خیال تھا چونکہ ان کی تمام جائداد یہیں ہے اس لیے کوئی مسئلہ

درپیش بھی آیا تو ان کے ملازمین ان کی مدد کریں گے۔ انھیں ان پر کتنا بھروسا تھا... میرے چچا پی این تھاپڑ اس وقت لاہور ڈویژن کے کمشنر تھے۔ انھوں نے ہماری طرف اپنا ایک آدمی بھیجا جس نے بتایا کہ سکھوں نے جنڈیالہ کے ایک گورودوارے میں جمع ہو کر حلف اٹھایا ہے کہ وہ مسلمانوں سے راولپنڈی (میں سکھوں کے قتل عام) کا بدلہ لیں گے اور قسم اُٹھائی ہے کہ فلاں دِن ـــــ تاریخ مجھے یاد نہیں آ رہی ـــــ مسلمانوں کا قتل عام کیا جائے گا، لہٰذا میرے انکل تھاپڑ نے پیغام بھیجا کہ تم لوگوں کو یہاں سے چلے جانا چاہیے، کیوں کہ مجھے امرتسر کے نزدیک جنڈیالہ گاؤں کی خفیہ رپورٹ ملی ہے کہ سکھوں نے گورودوارے میں وہاں جمع ہو کر حلف اُٹھایا ہے کہ فلاں فلاں دِن وہ مسلمانوں پر زمین تنگ کر دیں گے اور لازماً اس کا بھی ردِعمل ہوگا۔ مسلمان ہندوؤں کو مار ڈالیں گے۔ سکھوں کا کہنا ہے، ''پنڈی میں ہماری عورتوں سے جو کچھ ہوا (اس کا ذکر بعد میں تفصیلاً آئے گا: مترجم) ہم اس کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہ سکتے... میرے والد نے کہا، لو، یہ تھاپڑ تو بہت بزدل ہے... ہم بھلا سب کچھ یہاں چھوڑ کر کیسے چل دیں؟ میرے کئی ملازم ہیں، وہ میری حفاظت کریں گے، کچھ دِنوں تک شور شرابا ہوگا، پھر سب کچھ معمول پر آ جائے گا۔ اس طرح انھوں نے جانے سے انکار کر دیا، پھر دوسرا پیغام آیا، انکل نے کہا تمھارا باپ ضد کر رہا ہے، لہٰذا کم از کم تمھیں ضرور چلے جانا چاہیے، تمھارا باپ تو زیادہ سے زیادہ قتل کر دیا جائے، لیکن تم، تمھارے ساتھ وہ انتہائی بُرا سلوک کریں گے... اور یہ چیز برداشت کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ وہ تمھارا حشر کر دیں گے... لہٰذا تمھیں فوراً نکل جانا چاہیے۔

میرے والد نہ مانے... فیکٹری میں مختلف برادریوں... جاٹ، ہندو... کے لوگ کام کرتے تھے تاہم علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے زیادہ ورکر مسلمان ہی تھے... اس وقت تک وہ بہت مؤدب اور تابع دار نظر آئے اور بہت بے ضرر بھی... جب میں نے والد صاحب کو دلائل دینے کی کوشش کی تو بولے، ٹھیک ہے اگر تم خوف محسوس کر رہی ہو تو تم چلی جاؤ، میں نے کہا، لیکن باؤ جی!... انھوں نے کہا: نہیں بی بی، اگر تم ڈر رہی ہو تو تم چلی جاؤ، لیکن میں کہاں جاتی؟ پھر میں لاہور آ گئی۔ مجھے یاد ہے میں پوچھتی رہی، مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے کہاں جانا چاہیے، میرے والد نے جانے

سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے بتایا گیا، اس وقت محفوظ ترین ہندو علاقہ ... معلوم نہیں اب اسے کیا کہتے ہیں، کملا بہن بتانا ذرا اس کا نام کیا تھا، وہ... بیسا کے شمال میں ... دیکھ لو میرا ذہن اب کتنی تیزی سے بھولتا ہے، ہاں یاد آ گیا، کُلّو، اس پورے علاقے کو کُلّو منالی کہتے تھے۔

تقسیم کا عمل شروع ہو چکا تھا، میں اکیلی ہی امرت سر چلی گئی تو وہاں فسادات ہو رہے تھے... میں تنہا ہی گئی، ہمارے ساتھ ایک چھوٹا لڑکا رہا کرتا تھا، مجھے اس کا نام ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا، ڈیپو یا ٹیپو، چھوٹا سا لڑکا تھا۔ باؤ جی نے کہا تم اس لڑکے کو اور کچھ رقم اپنے ساتھ لے جاؤ... جتنی بھی رقم تھی، دو یا تین سو روپے، جو کچھ بھی، گھر میں تھا، انھوں نے مجھے تھما دیا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، اور انھوں نے مجھے کہا کہ کُلّو میں پہنچ کر تم ڈاکٹر دیوی چند سے ملنا، دیوی چند نے مجھے بتایا ہے کہ وہاں ان کا ایک گھر ہے، اور یہ کہ تمھیں وہاں جانا چاہیے۔ تم وہاں بالکل محفوظ ہو گی اور جب گڑبڑ ختم ہو جائے گی تم واپس چلی آنا... لہٰذا میں اس ملازم لڑکے اور کچھ روپوں، دو یا تین سو روپے تھے، معلوم نہیں کتنے تھے! شاید ایک سو روپیہ تھا، جب ہم امرت سر کے قریب پہنچے تو ہمیں پتہ چلا کہ انھوں (مسلمانوں) نے ریل گاڑیوں کو روکنا شروع کر دیا ہے، اور ان میں سوار لوگوں کو مار دیا جاتا ہے، لیکن ہم خوش قسمت ثابت ہوئے، ہر کوئی کہہ رہا تھا، اپنی طرف والی کھڑکیاں بند کر لو، وہ لوگوں کو کاٹ رہے ہیں۔

ٹرین، ٹرین۔ ہر کوئی خوف زدہ تھا... وہ کہتے رہے، اپنی کھڑکیاں چڑھا لو، کھڑکیاں بند کر لو، امرت سر قریب آ رہا ہے اور وہ لوگوں کو کاٹ رہے ہیں، ہم نے کھڑکیاں بند کر لیں، خدا جانے وہ باہر کیا کر رہے تھے، ہم اتنے خوف زدہ تھے کہ باہر تک نہ دیکھ پا رہے تھے، ہم دعا کرتے کہ ہماری ٹرین سٹیشن پر نہ رُکے اور ہماری ٹرین وہاں سے سیدھی نکل گئی... ہم نے سنا وہاں قتل عام اور لوٹ مار شروع ہو چکی ہے اور یہ کہ مسلمانوں نے بھی ہتھیار اُٹھا لیے ہیں اور اسی طرح سکھوں نے بھی۔ بہرحال ہم وہاں سے چلے گئے اور سیدھے کُلّو پہنچ گئے۔ اور کچھ دِن دیوی چند دُہرہ کے گھر قیام کیا۔ وہ چھوٹا لڑکا، ہمارا ملازم میرے ساتھ ہی تھا، اس کے بعد میں اس گھر سے نکلی اور وہاں چلی گئی ـــــ کملا وہ کون سی جگہ تھی، تمھارا نگر؟ میں وہاں بھی گئی تھی، منالی بھی گئی،

اس علاقے میں کئی جگہ گھومتی رہی اور بعض اوقات ریسٹ ہاؤسوں میں قیام کیا، جہاں رہنے کے لیے کچھ دِنوں کی اجازت ہوتی ہے—— وہ آپ کو صرف 8، 10 دِن وہاں رہنے دیں گے۔ میں وہاں گئی تو آمد کے فوراً بعد مجھے وِزیٹر بک پر دستخط کرنا پڑے۔ اور پھر کچھ دِنوں بعد چپڑاسی نے آ کر بتایا آپ کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ آپ کو اب جانا پڑے گا۔ اس کے بعد ہمیں ریسٹ ہاؤس کے واجبات ادا کرنا تھے۔ ان کے ریسٹ ہاؤس میں قیام کے تھوڑے عرصے بعد انھوں نے مجھے نگر بھیج دیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اپنے گھر سے روانہ ہوئی تھی، بلکہ وہاں سے بھاگ نکلی تھی، تو میرے پاس ایک یا دو ساڑیاں تھیں، ہاں میرے باپ نے کہا تھا کہ وہاں آمد پر مجھے کرائے کا مکان لینا چاہیے، اور پھر انھیں ٹیلی گرام یا خط کے ذریعے اطلاع کر دوں، وہ بھی آ جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ میں ایسی حالت میں نہیں آنا چاہتا، میں بوڑھا آدمی ہوں تم کہاں مجھے سنبھالتی پھرو گی؟ میں ایسی حالت میں نہیں جانا چاہتا، ہاں جب تم کچھ رہائش کا بندوبست کر لو گی مجھے اطلاع کر دینا، میں آ جاؤں گا۔ لیکن وہاں بندوبست کرنے کو تھا ہی کیا؟

سب سے پہلے میں دھرم شالہ گئی، چھوٹے لڑکے نے محسوس کر لیا کہ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں بچا، وہ 10 دِن یا شاید ایک ماہ میرے ساتھ رہا، پھر میرے اپنے کھانے کے لیے رقم باقی نہ رہی۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ لڑکے نے سوچا اس کے پاس تو اب کچھ باقی نہیں بچا اور پھر خاموشی سے بھاگ نکلا۔ وہ کانگڑہ چلا گیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں گیا تھا، اگلے دن میں ڈیپو، ڈیپو پکارتی رہی، تاہم وہ کہیں نظر نہ آیا۔ پھر ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے پیسوں کا تقاضا کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں، لیکن میرا تعلق ایک اہم خاندان سے ہے، میں دستخط کر کے نیچے اپنا نام لکھ دیتی ہوں... میں اپنے گھر سے بھاگی ہوئی ہوں اور واپس نہیں جا سکتی۔ ریڈیو اور اخبارات میں آ رہا ہے کہ قتل و غارت کا بازار ہر طرف گرم ہے، مجھے معلوم نہیں میرے رشتہ دار کہاں ہیں، جیسے ہی مجھے کوئی خیر خبر ملے گی میں تمھیں پیسے دے دوں گی۔ وہاں سے میں نگر چلی گئی اور پھر واپس آ گئی... وہ کون سی جگہ تھی، یاد نہیں آ رہا۔ یہ کوئی اور مقام تھا، یہاں بھی ہر طرف قتل عام ہو رہا تھا... وہاں گوجر تھے، جنھوں نے

مسلمانوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا تھا۔ جَن سنگھیے قتل کرنے کے عادی تھے، وہ شراب پیتے اور پھر قتل کرنے لگتے۔ ہندو ایسا نہیں کر سکتے تھے، وہ ڈرتے تھے، نوجوان لڑکے شراب میں مدہوش ہو جاتے اور پھر مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیتے۔ وہاں ایک نوجوان لڑکا تھا، چھوٹا لیکن پٹھانوں کی طرح مضبوط اور خوب صورت تھا۔ اس وقت میں ڈاکٹر دیوی چند کے گھر پر تھی۔ میں وہاں کھڑی تھی کہ وہ چیخنے چلانے لگے۔ ''وہ اسے جان سے مارنے لگے ہیں، وہ اسے مارنے والے ہیں،'' پھر لوگ التجا کرنے لگے، ''اسے مت مارو، اسے نہ مارو، یہ بہت چھوٹا ہے...'' اور انھوں نے جواب دیا، ''ہم اسے کہہ رہے ہیں ہندو بن جائے... اگر یہ ہندو بن جاتا ہے تو ہم اسے چھوڑ دیں گے، ورنہ اسے نہیں چھوڑا جائے گا۔'' ہم نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی، ہم نے کہا، ''بچے، ہندو بن جاؤ،'' لیکن وہ دھاڑا: ''میں ہندو ہرگز نہیں بنوں گا۔ یہ میری گردن کاٹ سکتے ہیں لیکن میں ہندو نہیں بن سکتا۔'' اس نے ایسی جرأت دکھائی تھی، میں اپنی گردن کٹوا لوں گا اور اسے چیختے ہوئے ساتھ لے گئے۔ میں نہیں جانتی کہ انھوں نے اسے قتل کر دیا تھا کہ نہیں۔ حالات بدتر ہو چلے تھے، ہر طرف لاشیں پڑی ہوتیں، دریائے بیاس میں طغیانی آ گئی... بہت زیادہ بارش ہوئی تھی۔ میں نے اس طرح کی بارش کبھی نہیں دیکھی تھی، دریا نے بند توڑ ڈالے، لاشیں ساتھ بہا لے گیا... میرے پاس کوئی پیسہ نہیں تھا، کوئی لباس بھی نہیں تھا، صرف چند چیتھڑے تھے، کسی طرح میں نے ایک تھالی خرید لی۔ میں اس پر کچھ آٹا گوندھ کر اس پر کھانا تیار کرتی... حالات بہت بگڑ چکے تھے...

ایک دن میں دریا کے کنارے چہل قدمی کر رہی تھی... میرے ہاتھ میں ایک مالا تھی۔ جیب میں کوئی رقم نہیں تھی... تم نے دیکھا، ایک دور میں مَیں تقریباً جوگن بن گئی تھی۔ جب میں کوٹرا میں تھی، جب میں نے فیصلہ کیا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی، اس کے بعد میں نے اپنے بھگوان سے، اپنے ٹھاکر سے شادی کر لی۔ میں نے صرف اسی سے محبت کی، یہی وجہ ہے کہ میں نے پہلی والی زندگی تقریباً ختم کر دی۔ میرے ہاتھوں میں اب مالا ہوتی اور ہونٹوں پر صرف اس کا نام رہتا...

پہلے تو میرا یہ حال تھا کہ میں اچھے کپڑے پہننے کی دلدادہ تھی۔ اپنے جسم کا

بہت خیال رکھتی، میری بہنوں کا رنگ کھلتا ہوا تھا، جب کہ میرا رنگ ذرا سانولا تھا، لیکن میں ہمیشہ اپنے جسم کی بناوٹ پر مغرور رہتی اور ہمیشہ ٹیپ سے اس کی پیائش کرتی رہتی... یہاں سے کتنا ہے، وہاں سے کتنا ہے... اور وہ تمام چیزیں، تم جانتی ہو نا، انگور کھاتی تا کہ چھاتیاں بڑی ہو جائیں اور یہ کہ اسے ایسے ہونا چاہیے یا اس طرح ہونا چاہیے۔ اس طرح میں اپنے جسم کا معائنہ کرنے میں مصروف رہتی... جسم اس طرف سے کتنا اندر ہے، یہاں سے کتنا باہر نظر آتا ہے، گھنگریالے بال فیشنی انداز میں بنا رکھے تھے اور ہمارا خیال تھا کہ بالوں میں مخصوص قسم کے پتے رکھنے سے یہ گھنگریالے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میں بالوں کے اندر پتے چھپا کر رکھتی، پھر کسی نے کہا تم غلط کر رہی ہو، تمھیں بیری کے پتے استعمال کرنا چاہئیں۔ پھر کسی نے مشورہ دیا تمھیں مٹی کا تیل استعمال کرنا چاہیے... اور میں تمھیں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنے عرصہ تک کیروسین تیل بالوں میں ڈالتی رہی... میرا خیال تھا اس طرح بال سفید نہیں ہوں گے۔ یقیناً بال ویسے ہو گئے جیسا کہ انھیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن میں صرف تمھیں بتا رہی ہوں... ناخن، کمر... اور پھر، جب بھگوان نے مجھ پر کرم کیا... کیوں اور کب؟ یہ مجھے معلوم نہیں، لیکن اس کے بعد میرا تمام وقت ہردوار میں گزرنے لگا۔ دریائے جمنا کے کنارے۔ میں ہر وقت اپنے بھگوان کے بارے میں سوچتی رہتی۔ اور پھر انھوں نے کہا، میرے بابو جی نے سمجھا میرا ذہنی توازن شاید بگڑ گیا ہے اور پھر اکیلے گھومنا اور مالا جپتے رہنا میرا معمول بن گیا۔ اس کیفیت کے دوران میں ملک تقسیم ہو گیا...

ریسٹ ہاؤس میں ایک بوڑھا چوکیدار تھا۔ میں نے ایک یا دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بہرحال کسی کے پاس پیسے ہوں گے تو وہ کچھ کھائے گا نا! ٹھیک اس دوران میں ایک افسر آ گیا۔ اس نے پوچھا، ساتھ والے کمرے میں کون رہ رہا ہے؟ چوکیدار بولا، مجھے پورا تو علم نہیں، اور میں مکمل طور پر سمجھ نہیں سکا۔ وہ ایک عورت ہے ـــــ اس وقت میں بہت صحت مند تھی۔ گال سرخ ـــــ چوکیدار نے کہا وہ (یعنی میں) دروازہ بند رکھتی ہے، کچھ کھاتی پیتی بھی نہیں۔ وہ گزشتہ دو تین روز سے اندر ہی ہے۔ کھانے کے لیے بھی باہر نہیں آتی۔ پھر اس افسر نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ میں ایک افسر ہوں اور یہاں ڈیوٹی پر آیا ہوں۔ تم کہاں سے آئی ہو؟ میں نے

اسے تمام تفصیل بتائی۔ اس نے کہا، تمھارے کھانے پینے کا کیا بندوبست ہے؟ میں خاموش رہی... میں کیا کہہ سکتی تھی؟... شاید میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئی تھیں۔ اسے بہت تکلیف ہوئی اور اس نے کہا تم میرے ساتھ آؤ۔ تم یہاں اس طرح بے آسرا نہیں رہ سکتیں۔ یہ ٹھیک نہیں... اور وہ میرے لیے کھانے پینے کی چیزیں لے آیا۔

ایک دن وہ بوڑھا چپڑاسی، چوکیدار آیا اور بولا، ''میں آپ کو ایک کہانی سناؤں گا۔ یہاں کا ایک گورا ڈپٹی کمشنر تھا—— مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا—— وہ اس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا۔ میں اس کا چپڑاسی تھا، ایک رات وہ آیا اور مجھے کہا، 'چپڑاسی میرے جوتے اُتارو... میرے پاؤں میں جوتے ہیں انھیں اُتار دو اور آج... میں تم کو ایک کہانی سناؤں گا... اسے کاغذ پنسل سے لکھ لو... تم کو پتہ ہے تمھارے بابا گاندھی نے ہمیں بہت سی مصیبتیں دی ہیں... بہت سی مصیبتیں' وہ بولتا چلا گیا اور سانس لینے کو بھی نہ رُکا—— 'ہمیں (انگریزوں کو) بولتا ہے، نکل جاؤ، گیٹ آؤٹ، آخر ہم کہاں جائیں؟ یہاں ہم بہت خوش ہیں، بابا ہمیں جانا پڑے گا۔ جانا ہی ہوگا لیکن اسے سبق سکھائے بغیر نہیں جائیں گے۔ ہم ایسے حالات پیدا کر کے جائیں گے کہ بھائی بھائی سے لڑے گا، بہن بہن سے لڑے گی۔ یہاں قتل و غارت ہوگی، جائدادیں نذرِ آتش ہوں گی اور عورتوں سے زیادتی۔ ہم ایسے حالات چھوڑ جائیں گے جسے وہ (اشارہ غالباً گاندھی جی کی طرف ہے: مترجم) کنٹرول نہیں کر سکے گا۔ اور پھر بے بس ہو کر ہماری واپسی کی دعائیں مانگے گا... یا خدا انھیں واپس بھیج دے اور پھر کیا ہوگا... اس کے اپنے آدمی، اس کے اپنے لوگ، اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔ وہ اسے مصیبت میں مبتلا کر دیں گے۔ وہ اسے کہیں گے کس جھنجھٹ میں تم نے ہمیں مبتلا کر دیا ہے۔' پھر اس نے ایک کاغذ[1] نکالا اور کہا: 'دیکھو، اسے پکڑو اور آج کی تاریخ دیکھ لو، میں تمھیں بتا رہا ہوں، ہم یہاں سے چلے جائیں گے، ہمارا یہاں رکنے کا کوئی امکان نہیں، لیکن ہم اسے جانے سے پہلے سبق سِکھائیں گے، یہ ضرور ہوگا، ایسا ہو کر رہے گا اور ہر کوئی کہے گا، ''اے خدا اُنہیں واپس بھیج دے...''

1: اس سے مراد کوئی سرکاری چٹھی ہے: مترجم

☆☆☆

یہاں دونوں بہنوں کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے:

کملا: یہ کون سی کہانیاں ہیں، تم نے ہمیں ایسی کہانیاں کبھی نہیں سنائیں...

دمینتی: تم کچھ نہیں جانتیں، (کملا) تم کو کچھ پتہ نہیں، کیوں کہ تم انگلینڈ میں تھیں...

کملا: نہیں، میرا مطلب ہے ہمارے پاس گفتگو کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا... ایک گھنٹا یہاں، ایک گھنٹا وہاں... تم بہت تھوڑے وقت کے لیے آیا کرتی تھیں...

دمینتی: اور اس کے علاوہ، میری ایک مختلف زندگی تھی، اور حالات بدلتے رہتے ہیں...

کملا: مجھے پتہ ہے، ہم نے کبھی تم سے یہ نہیں پوچھا کہ تم کیسے آئیں...

دمینتی: میں اکیلے آئی تھی۔

کملا: ہم نے تو اسے تسلیم کرلیا تھا کیوں کہ ہم انگلینڈ سے آئے تھے۔ ہمیں پتہ تھا کہ ہر کوئی یہاں آ گیا، لیکن یہ کسی نے نہیں پوچھا... ہم نے تو تسلیم کرلیا تھا...

دمینتی: وہاں مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا...

کملا: نہیں میرا مطلب تھا، تم آئیں اور پھر آشرم چلی گئیں... کوئی یہ نہیں جانتا تھا، باقی تو اکٹھے ہو کر آتے تھے...

دمینتی: تمھیں علم ہے...

کملا: باقی سب تو اکٹھے ہو کر آئے، ہمارا خیال تھا تمھیں ان سب کے ساتھ آنا چاہیے...

☆☆☆

دمینتی اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہتی ہے:

میں نے محسوس کیا میرا دُنیا میں کوئی نہیں، مجھے کچھ پتہ نہیں ہر کوئی کہاں تھا، میں پہاڑوں پر تھی، اکیلی، کنگال، میں کیا کر سکتی تھی؟ ایک دِن دریا کے کنارے میں نے 2 افراد دیکھے، وہ ایک دوسرے سے آہستگی سے باتیں کر رہے تھے... وہ کہہ رہے تھے... ہمارا دفتر کھلنے والا ہے، ہمیں جانا نہیں چاہیے... نگر کے قریب ایک جگہ ہے جہاں سے وہ بجلی حاصل کرتے تھے، کملا اس جگہ کا نام کیا ہے؟ چلو یاد آ جائے گا، ان دونوں کو یہ پریشانی تھی کہ اتنے دِن گزر چکے تھے، انھیں ابھی اپنی جاب پر رپورٹ کرنا تھی۔ میں نے ان کی طرف کان لگا لیے۔ وہ کہہ رہے تھے، وہاں ایک مقام ہے،

MashalBooks.com

پہاڑوں میں سے گزرتا راستہ، جہاں سے پولیس گزرتی ہے، یہ کوئی درّہ ہے، درّہ خیبر نہیں، لیکن کوئی چیز... اُنھیں پہاڑوں سے گزاری جاتی تھی۔ وہاں سے ہم بھی گزر جائیں گے۔ اس وقت دریا پانی سے لبریز تھا، میں ان کی طرف گئی اور دریافت کیا، بڑی نرمی سے، کیا تم جانے کا منصوبہ بنا رہے ہو؟ انھوں نے کہا ہاں، ہمارا دفتر کھلنے والا ہے، ہم واپس جائیں گے، ورنہ ہمارے خلاف انضباطی کارروائی ہوسکتی ہے، ہم پہاڑوں کے اندر سے جائیں گے، میں بولی: مجھے بھی لیتے جاؤ۔ انھوں نے کہا: نہیں، سوری، راستہ بہت پُرخطر ہے، کئی جگہ پر بہت تنگ ہے، ہمیں شاید ایک یا دو رات رکنا پڑے اور منزل پر پہنچنا دُشوار ہے۔ میں بولی: میں ضرور جاؤں گی، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

انھوں نے اگلی صبح ایک مخصوص جگہ پر ملنے کا وقت طے کیا۔ اگلی صبح جہاں پہاڑی راستہ شروع ہوتا تھا۔ میں ان سے پہلے جا کر بیٹھ گئی۔ آخر میرے پاس کچھ کھونے کو تھا ہی کیا؟ مجھے کیا ڈر ہوتا؟ میری جمع پونجی میرا لباس تھا جو میں نے پہنا ہوا تھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں بس ان کے پیچھے چلتی جاؤں گی، وہ بھلا مجھے کیسے روک سکتے ہیں۔ ہاں، اس سے پہلے میں جانگلی لوگوں کے پاس بھی گئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ راستے میں کوئی ریسٹ ہاؤس ہے؟ اور اگر ہے تو کیا میرے لیے کوئی جگہ مخصوص ہوسکتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ جگہیں بہت خطرناک ہیں، وہاں ابھی تک قتل و غارت اور لوٹ مار جاری ہے۔ میں نے ان سے التجا کی کہ کیا تم لوگ مجھے سڑک کے راستے شملہ بھجوا سکتے ہو؟ وہاں میرے جاننے والے ہیں، لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم زیادہ سے زیادہ تمھیں کچھ رقم دے سکتے ہیں۔ لیکن میں نے اس کے باوجود کہ وہ مجھے ماں بہن کہہ رہے تھے ان سے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا ہمیں معلوم ہے تم کسی اچھے خاندان کی لڑکی ہو۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ پھر میں نے پہاڑ پر جانے کا فیصلہ کر لیا... اور جب وہ دونوں نوجوان آئے، مجھے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ انھوں نے کہا تم یہاں کیا کر رہی ہو اس راستے پر؟ ہم نے تمھیں بار بار سمجھانے کی کوشش کی کہ تم اس راستے سے سفر نہیں کر سکتیں، یہ بہت خطرناک ہے۔ میں نے کہا، تم مجھے کیسے روک سکتے ہو؟ میں خود سڑک پر چل رہی ہوں، میرے پاس کوئی پیسہ نہیں، انھوں نے کہا، ہم تمھیں پیسے دے دیں گے۔ لیکن میں محض پیسے نہیں لے سکتی

تھی۔ میں اس جگہ سے جانا چاہتی تھی۔ ہاں تو تم وہ جگہ جانتی ہو جہاں سے بجلی آتی ہے، (بجلی گھر) یہ منڈی ہے؟ میں نے کہا اگر تم مجھے وہاں لے جاؤ گے تو میں دھرم شالہ یا پنجاب سے رابطہ کر سکتی ہوں، لیکن انھوں نے کہا جو رستہ ہم نے منتخب کیا ہے وہ بہت خطرناک ہے۔ لیکن میں ان کے پیچھے چلتی رہی۔ وہ بہت غصے میں تھے لیکن کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ کچھ فاصلے کے بعد وہ رُکے اور کھانے پینے کا سامان کھول لیا اور مجھے بھی کھانے کو دیا۔ انھوں نے سوچا ہوگا: یہ کیا جونک اور چیچڑ ہے جو ہمارے ساتھ خواہ مخواہ چمٹ گئی ہے۔ لیکن وہ کر کیا سکتے تھے۔ میں بھلا انھیں کب چھوڑنے والی تھی۔ میں بالکل لاغر تھی، آنکھیں سرخ... کوئی پیسہ نہیں تھا، ذرا آگے جا کر ایک چھوٹا سا گاؤں آ گیا اور انھوں نے مجھے دودھ اور روٹی بھی کھلائی۔ صبح کو میں پھر ان کے پیچھے تھی... لیکن گھاس پر پھسلن بہت تھی۔ ہمارے پاؤں رگڑ کھاتے اِدھر اُدھر پڑتے رہے... منجمد کرنے والی سردی، کوئی گرم لباس نہیں تھا... پھر ہم ایک مقام پر جا پہنچے۔ یہ ذرا بڑا کاروباری مرکز تھا جہاں سے بسیں روانہ ہوتی تھیں۔ وہاں ایک پولیس چوکی بھی تھی۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھے پولیس چوکی میں چھوڑ دیں گے کیوں کہ میں خواہ مخواہ ان کے ساتھ چمٹی ہوئی ہوں۔ وہ مجھے ایک قسم کے پلیٹ فارم پر لے گئے اور کہا: تم یہیں بیٹھو، ہم تمھارے لیے پانی وغیرہ لا رہے ہیں اور پھر چپکے سے غائب ہو گئے... آخرکار وہ مجھ سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے۔

پھر، میں وہاں بیٹھی تھی کہ پولیس آ گئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ کیسے میں یہاں تک پہنچی ہوں، میں لاہور سے آئی ہوں اور میرا تعلق فلاں، فلاں سے ہے، اور کیا آپ مجھے دھرم شالہ تک پہنچا سکتے ہیں؟ انھوں نے پوچھا: وہاں تم کیا کرو گی؟ میں بولی: وہاں میں ڈپٹی کمشنر آن ڈیوٹی سے رابطہ کروں گی... میں نے ان سے کہا میرے پاس کوئی رقم نہیں، براہِ کرم مجھے کسی نہ کسی طرح بس پر سوار کرا دیں، تمھیں بتایا ہے نا وہاں ایک پولیس چوکی بھی تھی۔ میری ٹانگیں سوُجی ہوئی تھیں اور جسم اکڑا ہوا تھا۔ میں بہ مشکل چل پھر سکتی تھی۔ انھوں نے کیا کیا، سڑک پر رسی اور زنجیر باندھی تا کہ بسوں کو روکا جا سکے۔ ایک بس آئی، انھوں نے اسے روکا اور کہا، اس مسافر کو لے جانا پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بارات ہے اور ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں، انھوں نے کہا کہ یہ بیماری،

بدقسمتی اور حالات کی ماری ہوئی عورت ہے، تمھیں اسے ساتھ لے جانا چاہیے۔ اسے اس جگہ پر اُتار دینا جہاں سے بجلی آتی ہے۔ اس جگہ کا نام فی الحال مجھے یاد نہیں پڑ رہا۔ انھوں نے کہا، ہمارے پاس کوئی نشست خالی نہیں، پھر انھوں نے کیا کیا، انھوں نے پچھلا دروازہ کھولا اور اس چھوٹی سی جگہ پر مجھے اوپر کھینچ لیا۔ بھگوان ہمیشہ میری مدد کرتا ہے—— میرا جسم اتنا اکڑا ہوا تھا کہ میں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ بس چلنا شروع ہو گئی اور میرا سر چکرانے لگا۔ میں گرنے والی تھی، میں تقریباً نیم بے ہوش تھی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کیا کروں، میں نے اپنے کُرتے پر قے کرنا شروع کر دی—— میرا کرتا اور دھوتی بھر گئی۔ میں بیمار ہو گئی—— میں نے اپنے بھگوان سے پرارتھنا کی۔ میں نے کہا: اے بھگوان تم نے دروپدی کی شرم رکھی، مجھے دیکھو میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اے بھگوان میری مدد کرو۔ جیسے ہی میں نے دعا کی، اگلا سٹاپ آ گیا۔ میں کھڑکی سے باہر تک نہیں جھانک سکتی تھی۔ میں اُلٹی سے بھری قمیص کو چھپا کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ دروازہ کھلا اور ایک نوجوان اندر آیا۔ دراز قد اور سمارٹ، اس نے کھادی پہن رکھی تھی۔ بولا: ماتا جی! بہن جی! آپ آئیں میری سیٹ پر بیٹھ جائیں۔ میں نے کہا: نہیں، نہیں، مجھے تنہا چھوڑ دو، میں گندی ہوں، میں غلیظ ہوں... میں بہ مشکل بول پا رہی تھی... تمھیں بتاؤں، اس نوجوان نے یہ سب کچھ ایک فاصلہ گزرنے کے بعد کہا، درحقیقت یہ میری دعا کا اثر تھا۔ اس نے کہا: میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ آپ ایسی حالت میں بیٹھیں، آپ کو یہاں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ میرے پاس فرنٹ سیٹ ہے، آئیں وہاں بیٹھ جائیں۔ میں یہاں بیٹھ جاتا ہوں۔ میں نے کہا نہیں، میں گند سے لتھڑی ہوئی ہوں، سیٹ بھی گندی کر دوں گی۔ اس نے کہا: فکر نہ کریں... میں رونے لگی، اس نے مجھے اُٹھایا اور سیٹ پر بٹھا دیا... میں روتی رہی، میں کہتی رہی کہ میں اکڑی ہوئی ہوں، اس حالت میں میرے اعضا جڑ گئے ہیں—— اس نے میری ایک نہ سنی، اس نے مجھے سیٹ پر بٹھایا، میرے کپڑوں پر خشک قے کو صاف کیا اور پھر دوسری طرف بیٹھنے چلا گیا، پتہ نہیں کہاں——

جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں سے بجلی آتی ہے تو بس رُک گئی۔ وہاں سے مجھے ایک اور بس پکڑنا تھی۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو کسی نے کہا آپ فکر نہ کریں، بس آئے گی تو ہم آپ کو اس میں بٹھا دیں گے۔ میں نے کہا لیکن میرے پاس تو کچھ نہیں،

MashalBooks.com

براہِ کرم کسی نہ کسی طرح مجھے دھرم شالہ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیں۔ بس یہی میں چاہتی ہوں۔ وہ نوجوان شخص اُٹھ گیا۔ اس نے کہا: میں یہاں رہتا ہوں اور یہیں ملازمت کرتا ہوں، یہاں پر میرا ایک گھر ہے، آپ میرے ساتھ آ جائیں، میں بولی: نہیں۔ اس نے کہا: کیوں؟ میں نے کہا: نہیں، بیٹا میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اس نے کہا کہ میں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ ہم آپ کو اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتے، آپ کو ہمارے ساتھ جانا ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں پہاڑی پر نہیں چڑھ سکتی۔ اس نے کہا: فکر نہ کریں، میں ایک اور آدمی کو لاؤں گا، اور ہم باری باری آپ کو اوپر لے جانے میں مدد کریں گے۔ اس کا بنگلہ بہت اونچائی پر تھا۔ بہرحال میرے احتجاج کے باوجود وہ مجھے وہاں لے گیا اور بنگلے کے برآمدے میں بٹھا دیا۔ پھر آواز لگائی: بہن جی، بہن جی، میرے ساتھ آپ کے لیے ایک مہمان ہے، دیکھو ہمارے گھر مہمان آیا ہے۔ اور دروازہ کھلا، مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ عورت میری سٹوڈنٹ تھی۔

میرے بھگوان، بھگوان، بہن جی، آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اپنی حالت تو دیکھیں! کملا، وہ شکنتلا تھی۔ محلّہ دیوی کی رہنے والی خوب صورت لڑکی۔ وہ آئی اور مجھے بازوؤں میں لے کر رونے لگی۔ بولی: اپنی حالت تو دیکھیں۔ میں نے کہا: تم شکنتلا ہو؟ اس نے کہا: ہاں... جی ہاں... میں بولی، مجھ سے دُور رہو، میں گندی ہوں، گندی... وہ فوراً بولی: یہ عورت... یہ مجھے اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ ہر سٹوڈنٹ ان سے محبت کرتی تھی، وہ گرم پانی لائی، مجھے صاف ستھرے گرم کپڑے دیے، ہیٹر جلائے، میرا بستر تیار کیا، مجھے چائے کا کپ دیا اور بستر میں لٹا دیا۔ میں بہ دستور روتی رہی اور وہ کہتی رہی: بہن جی! آپ رو کیوں رہی ہیں؟ آپ نے ہمیں علم کا تحفہ دیا... میں نے کہا: شکنتلا، مجھے پتہ نہیں اب میں کیا کروں، کہاں جاؤں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ از راہِ کرم مجھے دھرم شالہ بھیج دو۔ میں دل کی گہرائیوں سے تمھاری ممنون ہوں گی... میرے پاس کوئی رقم ہے نہ اور کچھ چیز۔ اس نے کہا: مجھے شرمندہ نہ کریں... اور آپ کو اس حالت میں تو میں کہیں نہ جانے دوں گی۔ پہلے آپ مکمل آرام کریں۔ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں، تگڑی ہو جائیں اور پھر... یہ آپ ہی کا گھر ہے۔ ہم آپ کے بچے ہیں۔ یہ گھر میری بہن کی ملکیت ہے۔ وہاں انھوں نے مجھے 10 یا 15 دن تک رکھا اور میری بہت

اچھی طرح دیکھ بھال کی۔ میری مالشیں ہوئیں۔ ڈاکٹر بلائے گئے... میں خوش تو تھی لیکن مجھے اس بات کا احساس بھی تھا کہ میں ان لوگوں کی میزبانی میں ہوں جنھیں میں ٹھیک سے جانتی تک نہیں۔ مجھے ایک قسم کا احساسِ کم تری ہونے لگا۔ پھر انھوں نے مجھے دھرم شالہ بھجوا دیا... جہاں میں سیدھی ڈپٹی کمشنر کے پاس گئی۔

میں نے اسے وضاحت سے بتایا کہ میں کس طرح گھر سے نکلی۔ میں فلاں فلاں جگہ پر گئی... میں آپ سے کسی چیز کی توقع نہیں رکھ رہی۔ آپ صرف مجھے پنجاب بھجوا دیں۔ مجھے یہ پتہ نہیں کہ میرے رشتہ دار کہاں ہیں، ماسوائے ڈاکٹر سنتو کھ سنگھ کے جو امرت سر میں رہتے تھے۔ آپ مجھے ان کے پاس بھیج دیں۔ اس نے کہا: فکر نہ کرو، ہم تمھیں وہاں بھیج دیں گے، لیکن تم پہلے میرے گھر چلو۔ اس نے ڈرائیور کو بلوایا اور اس سے کہا کہ اسے گھر لے جاؤ۔ اس کی بیوی دمے کی مریض تھی۔ اس نے مجھے تقریباً ایک ماہ اپنے پاس رکھا اور واقعی میرا خیال رکھا۔ اس نے کہا میں تمھیں ابھی نہیں بھجوا سکتا کیوں کہ دریا میں طغیانی آئی ہوئی ہے اور تمام راستے بند ہیں۔ جیسے ہی حالات ٹھیک ہوں گے، میں تمھیں بھجوا دوں گا۔ اس وقت سڑکوں پر پھسلن ہے اور جیپ اُلٹ سکتی ہے۔

☆☆☆

دونوں بہنوں کے درمیان پھر مکالمہ ہوتا ہے:

کملا: ایک منٹ، کیا خاندان میں سے کسی نے تمھاری فکر نہیں کی تھی؟ پریمی آنٹی کے بارے میں تم کیا کہتی ہو؟

دمینتی: کملا، انھیں کیا پتہ تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا؟ انھیں صرف یہ پتہ تھا کہ میں کوٹرا میں ہوں، مر کھپ چکی ہوں، یا پھر کچھ... وہ وقت ہی ایسا تھا... کوئی کسی دوسرے کے بارے میں نہیں جانتا تھا، نہ ہی کسی کو کسی سے دلچسپی تھی۔ لہٰذا انھیں میرے بارے میں کیا علم ہو سکتا تھا؟ انھوں نے سوچا ہو گا کہ میں نے کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیا ہو گا...

☆☆☆

MashalBooks.com

حصہ اوّل

پوشیدہ تاریخیں

میں یہاں صحیح طور پر واضح نہیں کرسکتی کہ میں خواتین کی تواریخ (histories) سے کب آشنا ہوئی۔ میں نے لفظ ''آشنا ہوئی'' استعمال کیا ہے، کیوں کہ یہ ایک بتدریج وقوع پذیر ہونے والا عمل ہے، جو میرے لاشعور میں جمع ہوتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن مجھ پر منکشف ہوا کہ کوئی ایسی چیز ہے جس کی مجھے طلب ہے۔

اگرچہ میں خود یہ کہہ رہی ہوں لیکن یہ مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔ حقوق نسواں کی علم بردار ہونے کے ناتے میں تاریخ کی تہیں کھولنے کی ضرورت سے آگاہ ہو چکی ہوں۔ اگرچہ بسا اوقات یہ عمل تکلیف دہ بھی ہوتا ہے (اس تاریخ کو حقائق بھی کہا جا سکتا ہے) البتہ اس دوران میں مختلف نوعیت کے پیچیدہ ''سچ'' سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔ میں اکثر خود سے پوچھتی ہوں کہ خواتین کی حقیقت کی دریافت کا عمل اتنا حیران کن کیوں ہونا چاہیے؟ لیکن ایسا ہی ہوا۔ شاید میری ریسرچ کے دوران میں سامنے آنے والا یہ نکتہ بہت سادہ تھا: جہاں تک مجھے علم ہے تقسیم کی تاریخ میں عورتوں کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک عورت اور حقوق نسواں کی علم بردار ہونے کے ناتے میں تقسیم کے کرداروں یعنی عورتوں کی ''تلاش'' کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ اور جب مجھے اس میں کامیابی مل گئی تو میں نے پھر انھیں نمایاں کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ بعض حوالوں سے یہ ''مکمل'' یا پھر نامکمل تصویر ہو گی۔

لیکن ہمارے معاشرے میں تصویریں مکمل نظر نہیں آتیں، اس کا مجھے اب علم ہوا ہے۔ جو کوئی یہ تصویریں کھینچتا ہے، اسے از سرِ نو تازہ کرتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے تصویر بدلتی نظر آتی ہے: آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کس سے باتیں کر رہے ہیں، کب باتیں کیں، کہاں پر ان سے باتیں کیں، آپ کیا سننا چاہتے تھے اور انھوں نے آپ کو کیا چنیدہ باتیں بتائیں... یہ فیکٹر آپ کی کھینچی گئی تصویر کو متاثر کرتے

ہیں، رانا کی کہانی سنتے ہوئے مجھے اس کا بڑی گہرائی میں اندازہ ہوا۔

مثال کے طور پر میں نے محسوس کیا کہ اگر رانا ماما کو اپنی کہانی سنانے میں اتنی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تو کسی عورت کو اس کے لیے کیسی دُشواری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ وہ کس کے سامنے دُکھڑا بیان کریں؟ انھیں کون سنے گا؟ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ سوالات کرتے ہوئے جس چیز کو میں نے اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ دراصل ان کے اندر کی آوازیں تھیں۔ مجھے مختلف نوعیت کے سوال، مختلف سچوایشن کے لحاظ سے کرنا تھے، اور باتیں سننے کے لیے مجھے کچھ اہم نکات تیار کرنا پڑے۔ اس طرح ان کا کلام، خاموشیاں، اَدھ کہی باتیں اور نازک فرق کا خیال رکھنا پڑا۔ مرد بہت کم عورتوں کی باتیں کرتے۔ خود عورتیں بھی اپنے بارے میں کچھ نہ کہتیں۔ درحقیقت وہ اپنی اہمیت سمجھتی ہی نہیں تھیں جو قابل بیان ہو۔ یہی خیال ان کے مردوں کا بھی ہوتا تھا، اور بھلا میں نے کون سا اچھا کام کیا، ایک اجنبی، ایک غیر عورت اب ان کی زندگیوں کو کرید کر انھیں وہ چیزیں یاد کرنے پر مجبور کر رہی تھی جسے بھلانا بہتر تھا۔ بالخصوص میں جن تاریخوں (histories) کے بارے میں جاننا چاہتی تھی، وہ تشدد، زیادتی اور قتل کی تواریخ تھیں۔

پھر کچھ عرصے کے لیے تو میں نے خواتین سے مخاطب ہونا بند کر دیا۔ ان تاریخوں میں خاموشی کی تہیں تھیں۔ میں نے خود سے کہا کہ مجھے اپنی مطلوبہ چیز کی تلاش کے لیے کوئی ذریعہ استعمال کرنا چاہیے—— یقیناً میں اب بھی ان خاموشیوں کو پوری طرح دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ پھر میں نے ان ''دستاویزات'' کی طرف رجوع کیا جو عرصہ دراز سے مجھے درکار تھیں۔ اخباری حوالہ جات، ایک خودنوشت اور دیگر ذرائع نے مجھے ایک کہانی کے حصے جوڑنے میں مدد کی۔ یہ کہانی محبت و نفرت کی کہانی ہے۔ چار زندگیوں اور دو قدموں کی کہانی ہے۔ وہ کہانی جو مجھے خواتین کی تاریخوں کی طرف لے گئی۔ زینب اور بوٹا سنگھ کی کہانی...!

زینب ایک نوجوان مسلمان لڑکی تھی جسے اس وقت اغوا کر لیا گیا جب اس کا خاندان قافلے میں پاکستان جا رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے اغوا کنندہ کون لوگ تھے اور کتنے ہاتھوں میں سے گزری۔ آخر اسے ضلع امرت سر کے ایک جاٹ بوٹا سنگھ

کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ دیگر کئی افراد کی طرح جنھوں نے خواتین کو اغوا کیا یا خریدا بوٹا سنگھ اس وقت شادی شدہ نہیں تھا۔ اس نے ''چادر'' کی تقریب منعقد کر کے زینب سے شادی کر لی۔ دراصل دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی تھی۔ ان کا ایک کنبہ اور 2 چھوٹی بچیاں تھیں۔ تقسیم کے کئی برس بعد اغوا شدہ عورتوں کا سراغ لگانے والی ایک پارٹی زینب کو تلاش کرتے امرت سر پہنچ گئی، جہاں وہ بوٹا سنگھ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ شبہہ تھا کہ بوٹا سنگھ کے بھائی یا بھتیجے نے اس پارٹی کو زینب کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کر دیا... کیوں کہ انھیں فکر تھی کہ بوٹا سنگھ کی اولاد انھیں جائداد سے محروم یا ان کا حصہ کم کر دے گی۔ ''برآمد'' ہونے والی اکثر عورتوں کی طرح زینب سے بھی اس کی مرضی نہ پوچھی گئی اور اسے زبردستی واپس جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اخباری رپورٹوں میں اس کی رُخصتی کی تفصیل بڑے پُراثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ رُخصتی کے وقت اسے دیکھنے پورا گاؤں اُمڈ آیا۔ وہ اپنا بچہ اُٹھائے دھیرے دھیرے گھر سے نکلی۔ ایک ہاتھ میں اس نے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اُٹھا رکھی تھی۔ اس کا سامان ترتیب سے جیپ میں رکھا گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے بوٹا سنگھ کو مخاطب کیا اور بڑی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی: ''اس کا خیال رکھنا اور فکر نہ کرو میں بہت جلد واپس آؤں گی۔''

یہ بات حیران کن نہیں کہ زینب کی تلاش کے پیچھے بھی جائداد کی ہوس کا محرک کارفرما تھا۔ اس کے والدین قتل ہو چکے تھے لیکن اس کے خاندان کو لائل پور میں بھارتی پنجاب میں چھوڑی گئی اراضی کے عوض کلیم کی زمین الاٹ کی گئی تھی۔ زینب اور اس کی بہن کو باپ کی جائداد سے حصہ ملا تھا۔ ان کے ایک چچا کو بھی ان کے ساتھ زمین کا ٹکڑا ملا۔ یہ سرگوشیاں عام تھیں کہ زینب کی تلاش دراصل اس کے چچا نے کرائی۔ وہ اپنی فیملی کی جائداد اپنے خاندان میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش تھی زینب جب مل جائے تو اس کی شادی اس کے بیٹے سے ہو جائے۔ اس طرح تمام زمین اپنے خاندان میں رہے گی۔ بیٹے کو زینب سے شادی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جو کہانی مجھے بتائی گئی، اس کی جھجک کی وجہ یہ تھی کہ زینب کئی برس تک ایک سکھ کے پاس رہی تھی۔ کچھ عرصہ تک خاندان میں بحث چلتی رہی اور بوٹا سنگھ کو بھی گاہے بگاہے ہمسایوں اور دیگر افراد سے تفصیلات ملتی رہیں۔

اس دوران میں بوٹا سنگھ نے ہر ممکن جگہ اپنا مقدمہ پیش کیا... لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس نے پاکستان جانے کی بھی کوشش کی، لیکن اب یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ ایک دن اسے پاکستان سے ایک خط موصول ہوا... غالباً زینب کے کسی ہمسائے نے لکھا تھا۔ تاہم کوئی حتمی طور پر لکھنے والے کا نام نہیں جانتا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو وہاں چلے جاؤ۔ ایسے نظر آتا ہے کہ زینب کا خاندان اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈالتا رہا۔ بوٹا سنگھ نے اپنی زمین بیچی اور کچھ رقم جمع کر لی، لیکن اس نے دونوں ملکوں کے درمیان سفر کرنے میں درپیش ممکنہ مشکلات پر کوئی مشورہ نہ کیا۔ اسے پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے وہ دہلی گیا۔ یہاں اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اسلام قبول کر لیا۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ اس طرح پاکستان میں جانا آسان ہوگا۔ بوٹا سنگھ اب جمیل احمد تھا۔

اور اس نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی۔ اس کے ساتھ اس نے پاکستانی قومیت کے لیے بھی اپلائی کر دیا۔ زینب کو حاصل کرنے کے لیے اسے جو کچھ کرنا چاہیے تھا، وہ اس نے کیا۔ لیکن جن حالات میں وہ جا رہا تھا ان میں ایک نئے ملک میں رہنا آسان نہیں تھا۔ پاکستان کے ہائی کمیشن نے بوٹا سنگھ کی طرف سے قومیت کی درخواست وصول کر لی اور اسے ریکارڈ میں شامل کر لیا لیکن قومیت کی تبدیلی اتنا سادہ کام نہیں تھا۔ اور یہ سوال کیا کبھی آسان ہو سکتا ہے؟ دونوں ملک تقریباً حالت جنگ میں تھے: ایک دوسرے کی سرگرمیوں کے حوالے سے گہری بدگمانیاں پائی جاتی تھیں۔ لوگ زیادہ دیر بہ آسانی اِدھر اُدھر نہ جا سکے... ان حالات میں بھلا کیا صرف ''دوسرے کی'' محبت میں قومیت کی تبدیلی ہضم کی جا سکتی تھی۔ کئی مہینوں کی کارروائی کے بعد درخواست مسترد کر دی گئی۔ (دلچسپ امر یہ ہے کہ انہی دنوں اخباری حوالوں کے مطابق ایک معروف اداکارہ مینا نے بھی پاکستانی شہری بننے کی خواہش ظاہر کی اور قومیت کے لیے درخواست دی جو فوراً قبول کر لی گئی اور اس کی ''ڈیفیکشن'' پر اخبارات میں کافی شور مچایا گیا۔

لیکن بوٹا سنگھ بھلا اتنی آسانی سے کب ٹلنے والا تھا۔ اس نے پاکستان کے مختصرالمدتی ویزے کے لیے درخواست دی اور چوں کہ اس وقت تک ہائی کمیشن کا عملہ

بوٹا سنگھ سے کافی مانوس ہو چکا تھا لہٰذا اسے ویزا جاری کر دیا گیا۔ اس طرح بوٹا سنگھ عرف جمیل احمد پاکستان روانہ ہو گیا، اور زینب کو تلاش کرنے کے لیے وہاں پہنچا جس کی شادی کزن سے ہو چکی تھی۔ یہ شاید ایک طرح سے بوٹا سنگھ کی دُنیا کا خاتمہ ہو سکتا تھا لیکن حالات نے ایک عجیب کروٹ لی اور بوٹا سنگھ کو زینب کے حصول کے لیے جنگ لڑنے کا ایک اور موقع مل گیا۔ زینب کی تلاش کے عمل کے دوران میں وہ پولیس کو اپنی آمد کی رپورٹ دینا بھول گیا... کیوں کہ اس وقت تک دونوں ملکوں میں پہنچنے کے بعد 24 گھنٹے کے اندر متعلقہ پولیس سٹیشن کو اطلاع کرنے کی شرط لاگو ہو چکی تھی۔ اس غلطی پر بوٹا کو ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا گیا اور بظاہر لگتا ہے اس نے مجسٹریٹ کو بتایا کہ وہ زینب کو پیش آنے والے حالات سے سخت بد دل اور پریشان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کو رپورٹ نہ کر سکا۔ مجسٹریٹ نے زینب کو عدالت کے رُوبہ رُو پیش ہونے کا حکم جاری کر دیا اور کہا گیا کہ وہ اپنا بیان ریکارڈ کرائے۔ یہی وہ وقت تھا جب بوٹا سنگھ کی تمام اُمیدیں ایک چھناکے سے ٹوٹ گئیں۔ رشتہ داروں کے تنگ گھیرے میں زینب نے اسے مسترد کر دیا اور کہا، ''میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور اب میرا اس آدمی سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنا وہ دوسرا بچہ واپس لے سکتا ہے جو میں اس کے گھر سے لائی تھی...''

اگلے دن بوٹا سنگھ نے خود کو ٹرین کے نیچے دے کر خودکشی کر لی۔ اس کی جیب سے نکلنے والے رقعے میں وصیت کی گئی کہ اسے زینب کے گاؤں میں سپردِ خاک کر دیا جائے، لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ جب اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لاہور لائی گئی تو بتایا جاتا ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد وہاں جمع ہو گئی اور کچھ رونے لگے۔ ایک فلم ساز نے تو فلم بنانے کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں پولیس کی ایک ٹیم لاش دفنانے کے لیے زینب کے گاؤں گئی لیکن اس کی برادری کے لوگوں نے اس کی اجازت نہ دی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ گاؤں میں ان کے پاس ہی اس واقعے کی ایک مستقل یادگار قائم ہو جائے اور بوٹا سنگھ یا جمیل احمد کو لاہور واپس لا کر دفنا دیا گیا۔[1] مرنے کے بعد بوٹا سنگھ ہیرو بن گیا اور اس کا نام محبت و پیار کے دیگر روایتی کرداروں ہیر رانجھا، سوہنی

1 : میں نے اس واقعے کی تفصیلات مختلف اخباری رپورٹوں اور ایک کتاب کے مخطوطے

بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ کریں

مہینوال کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ تاہم زینب نے اس دوران میں اپنی خاموشی برقرار رکھی۔ وہ اپنے عاشق کا ماتم کر سکتی تھی نہ اس کی موت پر آنسو بہا سکتی تھی۔ وہ تو اس موضوع پر کسی سے بات تک نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اس طرح کی ہزاروں عورتوں میں سے ایک عورت تھی۔ کتاب لکھتے ہوئے زینب اور بوٹا سنگھ کی کہانی میرے ساتھ ساتھ رہی۔ یہ ایک متحرک کہانی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ مجھے طنز و ملامت اور ضمیر پر کچوکے لگانے والی داستان لگی، جس سے بے اطمینانی کا احساس ہوتا ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا تھا، یہ ایک ہیرو اور ایک ''زخم خوردہ'' خاتون کی داستان تھی جس سے ہمیں ہیرو کی شخصیت کے بارے میں تو معلومات حاصل ہوئیں، ہمیں اس کی دیوانہ وار فطرت، اس کی دیانت داری اور مستقل مزاجی، ایک عورت کی محبت میں پوری دُنیا تیاگ دینے کا عزم اور اس کی محبت کی طاقت کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ''زخم خوردہ'' کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ میری بھرپور کوشش کے باوجود میں اس کی (زینب) آواز کا کہیں سراغ نہیں لگا سکی۔ زینب کے احساسات کیا تھے؟ کیا اسے بوٹا سنگھ کی فکر تھی؟ یا اسے اپنی زندگی میں آنے والے دونوں مردوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی؟ وہ اغوا، کئی بار زیادتی کے تجربے سے کیسے گزری۔ یہ بتایا جاتا تھا کہ زینب اور بوٹا سنگھ خوش وخرم زندگی گزار رہے تھے۔ بلکہ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔ مگر جس شخص نے اسے ایک مویشی کی طرح خریدا، اس سے وہ محبت کیسے کر سکتی تھی؟ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس کی تفصیل کے لیے انٹرویو کرنا چاہیے—— اگر کوئی ایسی عورت زندہ تھی تو بوٹا سنگھ اور زینب کے تجربات، احساسات کی حقیقت جاننے کا یہی واحد راستہ ہو سکتا تھا۔

یہ فیصلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک ایسا موڑ ہوتا ہے جہاں تحقیق کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ جس شخص کے بارے میں آپ ریسرچ کر رہے ہوتے ہیں وہ ہی وسیلہ معلومات بن جاتا ہے۔ ''اطلاع کنندہ'' اپنے ذاتی احساسات سے بے خبر لیکن آپ کے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: ''لاہور، ایک خودنوشت'' مصنف سوم آنند سے حاصل کی تھیں۔ اب بوٹا سنگھ سے طرح طرح کی باتیں منسوب کی جاتی ہیں اور اسے ایک افسانوی کردار کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ہر جگہ مختلف تفصیل ملتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سٹوری کو پاکستان میں حال ہی میں ریلیز ہونے والی فلم ''کرتار سنگھ'' میں بھی فلمایا گیا ہے۔

کام کے لیے اہم ہوتا ہے۔ میں اس قسم کی روایت شکن نہیں بننا چاہتی تھی۔۔۔ رانا ماما کی صورت حال کی طرح میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی ریسرچ پر خود ساختہ خاموشی لاگو کر دوں۔ مجھے پتہ چل چکا تھا کہ تقسیم کی تاریخ دراصل خواتین کی جسمانی اور ذہنی خلاف ورزیوں کی تاریخ ہے۔۔۔ لہٰذا میں انہی لوگوں سے بات کروں گی جو گفتگو کرنے کے خواہاں تھے اور خواتین کی تواریخ کا سراغ لگانے کے لیے دیگر ذرائع تلاش کرتی رہوں گی۔ اس وقت مجھے لگا کہ ایک بار جب کسی عمل میں کسی شخص کی شمولیت ہو جاتی ہے تو آپ اس سے متعلقہ چیزوں کا نوٹس لینا بھی شروع کر دیتے ہیں۔۔۔ اگلا مرحلہ خود بخود نمودار ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

1988ء میں خواتین کے رسالہ منوشی (Manushi) نے گجراتی زبان کی کتاب موُل سوٹا اکھڑ (جڑوں سے کھوکھلی) پر ایک تبصرہ شائع کیا۔ یہ کتاب ایک خاتون کملا بن پٹیل کی تقسیم کے وقت اغوا اور زیادتی کا شکار ہونے والی عورتوں کی یادداشتوں پر مبنی تھی۔ کملا بن نے جو تفصیلات بیان کیں وہ روح فرسا ہیں۔ اس نے لکھا ہے تقسیم کے وقت سرحد کے دونوں طرف تقریباً 75 ہزار خواتین کو اغوا اور زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ اگر کشمیر کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد بڑھ کر ایک لاکھ ہو جائے گی۔ زیادتی کے علاوہ عورتوں کو کئی دیگر نوعیت کے تشدد کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ کئی خواتین کو برہنہ کر کے سڑکوں پر گھمایا گیا۔ کئی کی چھاتیاں کاٹ ڈالی گئیں، ان کے جسم پر دوسرے مذاہب کے نشان داغ دیے گئے۔ نام نہاد ''تطہیر'' کے لیے دوسری نوعیت کی تذلیل کی خاطر خواتین کو دوسرے مذہب کے مردوں کے ساتھ اختلاط پر مجبور کیا گیا، جس سے کئی حاملہ ہو گئیں۔ بچوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ بسا اوقات انھیں زبردستی اُٹھا لیا گیا۔ کئی عورتوں کو آزادی کے لیے بیچ دیا گیا۔ بعض دفعہ کیمپوں اور پیدل چلتے قافلوں سے عورتوں کو اغوا کر کے غائب کر دیا گیا لیکن ان سینکڑوں، بلکہ ہزاروں عورتوں کے اغوا اور ان سے زیادتی کے مقاصد اب واضح ہو چکے ہیں۔

کملا بن نے کئی مغوی عورتوں کا سراغ لگا کر ان کی مدد کی لیکن ان کی تفصیلات کو کتاب کی شکل دینے کے لیے اور اپنے احساسات کے اظہار میں اسے کئی دہائیاں

صَرف کرنا پڑیں۔ میں حیران ہوئی کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس نے خاموشی کا راستہ کیوں اختیار کیا؟ میں اس کی تلاش میں لگ گئی اور آخرکار اسے پا لیا۔ وہ بمبئی میں اپنی لے پالک بیٹی، جو اس کی اسسٹنٹ بھی تھی، کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس دھان پان سی خاتون نے پوچھا، ''تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ میں نے اتنی دیر اپنے تجربات تحریر کیوں نہیں کیے؟ میں تمھیں ضرور بتاؤں گی۔

''کتاب نہ لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ شروع میں ذہنی طور پر وہ کچھ قبول نہ کر سکی جو میں نے دیکھا۔ میں یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھی کہ ایک انسان بھی یہ کچھ کر سکتا ہے۔ یوں لگا بدروحیں زمین پر اُتر آئی ہوں... یہ ویسے ہی ہے جب بدروحیں شِوجی میں حلول کر گئیں اور انھوں نے ''تانڈو'' (موت و تباہی) کا رقص کیا... یہ ایسے ہی تھا جیسے یہ روح ہر مرد و عورت میں گھس گئی ہو... تقسیم ''تانڈو'' ناچ کی طرح تھی... میں نے ایسی اِبنارمل چیزیں دیکھیں کہ میں بے اختیار خود سے پوچھنے لگی— آخر لکھنے کو اس میں ہے ہی کیا؟ آخر میں یہ سب کچھ کیوں لکھوں؟...''

کملا بن کی خاموشی ایک چیز تھی لیکن ان خاندانوں کے بارے میں کیا کہا جائے جن سے میں نے رابطہ کیا؟ انہوں نے عورتوں کے اغوا اور ان سے زیادتی کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ کیا انھوں نے جان بوجھ کر تفصیلات کانٹ چھانٹ کر بیان کیں یا یہ کہ میں نے ان سے کوئی غلط سوال کر ڈالا تھا؟ یا وہ اَدھ کہی باتیں اور ان میں چھپے معانی سننا نہیں چاہتے تھے؟ میں نے سوچا شاید مجھ سے ہی کوئی بھول ہو گئی ہو۔ لوگوں نے مجھے تفصیل بتائی ہو گی لہٰذا میں نے اپنے انٹرویوز کا دوبارہ جائزہ لیا لیکن ان میں بھی بالکل خاموشی پائی گئی۔ اندازِ کلام بھی مبہم تھا۔ دہلی میں راولپنڈی کے فسادات میں بچنے والے دو بھائیوں نے مجھے اپنے اہل خانہ کے بارے میں بتایا:

ہمارے گھر میں دادی، دادا، اماں، والد، تین بھائی اور تین بہنیں رہتی تھیں۔ ایک بہن مشرقی پنجاب میں رہتی تھی۔ ہماری ایک خالہ جو دہلی میں رہتی تھی وہ اپنی بچی کے ساتھ ہمارے پاس آ گئی۔ انھیں قتل کر دیا گیا۔ وہ ہمیں ملنے آئی تھی۔ درحقیقت ہمارے پورے گھرانے کو قتل کر دیا گیا۔ صرف ہم

دونوں بھائی بچے... کچھ کو گوردوارے میں، بعض کو کسی اور جگہ پر قتل کر دیا گیا۔ ہماری دادی اور دادا کو گھر میں قتل کیا گیا۔ ان کو پٹھانوں نے ہلاک کیا، دیگر کو... میری ماں اور چھوٹے بھائی کو... گوردوارے میں مار ڈالا گیا۔ ہمارا باپ بھاگنے کی کوشش میں راستے میں ہلاک ہو گیا... ہم چند گھر والے ہی فرار ہو سکے... کچھ ہی زندہ بچے۔''

پھر وہ لوگ جو مارے گئے ان میں کئی ایک ہی خاندان کے لوگ تھے لیکن انھوں نے اپنی ان بہنوں کا کوئی براہِ راست ذکر نہ کیا جو اس وقت ''غائب'' ہو گئیں۔ ان کے آس پاس رہنے والوں کو اس کہانی کا ''علم'' تھا۔ وہ بھی ان کی قومیت کے لوگ تھے، اسی گاؤں کے مکین تھے۔ انھوں نے سرگوشیوں میں مجھے بتایا، ''ان سے بات کرو، ان کی دو بہنیں اس وقت غائب ہو گئی تھیں۔'' جس انداز میں ان کے اس ہمسائے نے مجھ سے بات کی مجھے لگا کہ وہ اسے کوئی بہت شرم ناک بات سمجھتا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی پوچھنا مناسب نہ سمجھا، لیکن جب میں نے دوبارہ بات چیت کا سلسلہ شروع کیا تو مجھے یہ خاموشی بہت عجیب محسوس ہوئی۔ دونوں بہنوں کے غائب ہونے کی داستان اس پراسرار خاموشی اور جھجک کی گہری تہوں میں چھپی ہوئی تھی۔ مجھے لگا اس خاموشی میں تقسیم کی کئی سربستہ کہانیاں موجود ہیں۔ وہ کہانیاں جو ہمیشہ بتائی گئی کہانیوں کے ساتھ ہوا میں معلق رہیں۔ وہ داستانیں جو آزادی کے تاریک پہلوؤں کا پتہ بتاتی ہیں۔ جب میں نے ریسرچ کا آغاز کیا تو اس کہانی کا خود بخود انکشاف ہوتا چلا گیا۔

کملا بن سے ملاقات کے چند ماہ بعد پُرانی کتابوں کے ایک سٹور سے سدیش اور میرے ہاتھ ایک ضخیم کتاب لگی جس میں ایسی ہزاروں ہندو اور سکھ عورتوں کی تفصیل تھی جنھیں اغوا کر لیا گیا یا ان کے گھرانوں کے مطابق وہ تقسیم کے بعد غائب ہو گئیں۔ یہ بڑے صفحات والی 1414 اوراق پر مشتمل کتاب تھی، جس میں ضلع بہ ضلع لاپتہ ہونے والی عورتوں اور بچوں کی فہرستیں تھیں۔ اس میں ایسے 21908 نام تھے۔ یقیناً یہ نامکمل فہرست ہو گی لیکن پھر بھی انتہائی ہَول ناک تھی۔ جن دو بہنوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے نام بھی دیگر اَن گنت عورتوں کی طرح اس میں شامل تھے... اکثر کو ان کے اپنے گاؤں کے لوگوں نے اُٹھا لیا تھا۔ حالانکہ گردہی تصادم کے مؤرخ جو دیو مالا بیان کرتے

ہیں ان میں زیادتی کرنے والوں کو زیادہ تر ''بیرونی'' ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن جو فہرست حتمی شکل میں میرے سامنے تھی وہ بالکل اُلٹ تفصیل بتا رہی تھی۔ لہٰذا اَن گنت عورتوں کو ان کے اپنے گاؤں کے لوگوں نے ہی اغوا کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ 50 اور 60 سال کی بوڑھی عورتوں کو بھی نہ چھوڑا گیا... سماجی کارکنوں نے مجھے بتایا کہ یہ غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بوڑھی عورتوں، بیواؤں یا ایسی عورتیں جن کے خاوند قتل کر دیے گئے تھے کو محض جائداد کے لیے اُٹھا لیا گیا تھا۔ پھر انھیں کہا جاتا کہ ہمیں اپنا ''بیٹا'' بنا لو، جائداد پر قبضہ کرنے کا یہ شارٹ کٹ تھا۔ اس لسٹ میں سے ایک نمونہ یہاں دیا جا رہا ہے۔

نمبر شمار	مقام رہائش	مغوی کے مندرجات	مقام و تاریخ اغوا	اغوا کنندہ کی تفصیل وغیرہ
851	جی آر ٹی/ایس-2/این-11 سی	پیرا سنگھ ولد کنہیا لال، 10 سال، گاؤں کدھر، تھانہ کھٹالیہ بنکا، ڈاکخانہ و تحصیل پھالیہ ضلع گجرات	کدھر ضلع گجرات 8-8-1947	میاں صدر دین ولد ناصر دین کسبی، گاؤں گجن ڈاکخانہ و تحصیل پھالیہ ضلع گجرات
852	جی آر ٹی/بی/یو97 ڈبلیو	پریمیشوری بائی، 28 سال، زوجہ ہری دیال، گاؤں گاندھی خیل تھانہ تجوری لکی مروت	گجرات 12-01-1948	امکان ہے کہ وہ گجرات یا اس کے قریبی علاقے میں موجود ہے۔

ضلع بنوں

853	جی آر ٹی/بی یو98 ڈبلیو	پیری بائی، (18 سال) دختر بھن رام، زوجہ مول چند گاؤں حسو خیل، تھانہ بنوں تحصیل سرالی، ضلع بنوں	گجرات سٹیشن 10-01-1948	ایضاً
854	جی آر ٹی/ بی/او-6 سی	پشاوری لال، 9 سال، ولد پالا رام گاؤں بُرج بختے دا، تھانہ قادر آباد، تحصیل پھالیہ، ضلع گجرات	منڈی بہاؤالدین 28-8-1947	نمبردار مولو ولد تیجا، گاؤں برج بختے دا، ڈاکخانہ و تحصیل پھالیہ ضلع گجرات

MashalBooks.com

855	جی آر ٹی/ پی/ یو-94- ڈبلیو	پرکاش کور، 22 سال زوجہ پریتم سنگھ، گاؤں ڈنگہ، تحصیل کھاریاں ضلع گجرات	ڈنگہ 18-04-1947	امکان ہے وہ ڈنگہ یا اس کے قریبی علاقے میں موجود ہے۔
856	جی آر ٹی/ ایس-2/ یو6/ سی	پاش، 6 سال دختر سرداری لال گاؤں چھوکری بھلووال تحصیل کھاریاں ضلع گجرات	...	امکان ہے کہ وہ چھوکری بھلووال کے قریبی علاقے میں ہے۔
857	جی آر ٹی/ ایس/ 1 او- 8 ڈبلیو	پورو، 25 سال دختر سردار سنگھ، گاؤں و ڈاکخانہ بھاگووال تحصیل ضلع گجرات	بھاگووال اگست 1947	رحمت خان، غلام قادر بھاگووال ضلع گجرات
858	جی آر ٹی/ ایس/ 1 این-5 سی	پرکاش، 10 سال، ولد موہن لال، گاؤں کھمبی، تحصیل کھاریاں ضلع گجرات	لٹھیری اگست 1947	دلت خان ڈاکخانہ و بمقام کھمبی تحصیل کھاریاں، ضلع گجرات
859	جی آر ٹی/ ایس-14 199 ڈبلیو	پریم دیوی، 40 سال، دختر جامن رام، زوجہ بھگت رام گاؤں بٹالہ، تحصیل بھمبر ضلع میرپور	بٹالہ	بھولا ترکھان، اسی گاؤں کا رہائشی
860	جی آر ٹی/ ایس-14/ 201 ڈبلیو	پریم کور، 34 سال، زوجہ رام سنگھ، گاؤں لٹھیری تحصیل کھاریاں ضلع گجرات	لٹھیری اگست 1947	صوبے دار عنایت خان اسی گاؤں کا مکین

کتاب کا نام تھا **List of Non Muslim Abducted Women and Children in Pakistan and Pakistan Side of the Cease-Fire line in Jammu & Kashmir State.**

اس کتاب کا مصنف اے جے فلیچر انبالہ اور جالندھر ڈویژن کا کمشنر اور ہندوستان میں مغوی عورتوں اور بچوں کی برآمدگی سے متعلق ادارے کا اعلیٰ افسر تھا۔ اس کتاب کو عوام الناس کے لیے اس لیے شائع نہیں کیا گیا مبادا لسٹ میں درج ناموں کے رشتہ داروں کے احساسات مجروح ہوں۔ ابتدایے میں مصنف لکھتا ہے:

MashalBooks.com

(1) یہ کتاب حروف تہجی کے لحاظ سے ان سکھ اور ہندو عورتوں کی فہرستوں پر مبنی ہے جنھیں 1947ء کی گڑ بڑ کے دوران میں مغربی پنجاب (پاکستان) سے اغوا کر لیا گیا۔ یہ معلومات گاہے بگاہے حکومت پاکستان کو بُنیادی اور اضافی فہرستوں کی شکل میں فراہم کی گئیں۔ ان فہرستوں کا ریکارڈ اب اتنا زیادہ اور اُلجھ گیا ہے کہ ان کے مندرجات اور حوالہ جات سمجھنا کافی پیچیدہ اور مشکل ہو گیا ہے۔ ان ناموں کو اب ان اضلاع کے حساب سے ترتیب دیا گیا، جہاں وقوعہ ہوا یا جہاں متعلقہ فرد موجود ہے، تصدیق کے لیے ضروری ہے کہ مغوی کے اصل گھر اور اغوا کے مقام سے انکوائری کی جائے۔

(2) شروع میں اس کتاب کی اشاعت مغویوں اور ان کے رشتہ داروں کے جذبات مجروح ہونے کے خدشے کے پیش نظر نہیں کی گئی تھی، لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ بدقسمت متاثرین کی برآمدگی اور بحالی کا کام تیز کرنے کے لیے اسے شائع کر دیا جائے۔ اس پر مغویوں یا ان کے عزیز و اقارب کے محسوسات کچھ بھی ہوں لیکن ضروری ہو گیا ہے کہ اس کتاب کی تکمیل و اشاعت کا کام انسانی بُنیادوں پر جلد از جلد مکمل کر لیا جائے تا کہ دونوں طرف کی حکومتوں کو ایسے افراد کی مدد اور بحالی میں سہولت حاصل ہو سکے۔ یہ تفصیلات مغربی پنجاب سے آنے والے مہاجرین نے انڈیا کے حکام کو بتائیں۔

مختلف خاندانوں نے پولیس کو اپنی گم شدہ عورتوں کی رپورٹ درج کرائی۔ ایک بار اس مسئلے کی شدت واضح ہو گئی تو حکومت کو بعض اقدامات کرنا پڑیں گے۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ گم شدہ عورتوں کی فہرستیں تیار کی جائیں۔ اس طرح ان کی تلاش کی بُنیاد اُستوار ہو جائے گی۔ تاہم یہ کام اتنا آسان نہیں، بعض اوقات ایک ہی خاندان کے تین یا چار مختلف مقامات پر بکھرے افراد لاپتہ خواتین کی رپورٹ درج کرا دیتے تھے۔ ان دنوں ان معلومات کے تقابل اور انھیں دوسرے افراد تک پہنچانے کا مربوط نظام نہیں تھا۔ ایسی فہرستوں کی تیاری کا کام ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کی یونائیٹڈ کونسل برائے ریلیف و بہبود کے ذمے لگایا گیا، جنھوں نے ان فہرستوں کا جائزہ لیا اور مختلف نام مخصوص علاقوں

کے تھانوں کو بھجوائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فہرستوں کے تشویش ناک بھاری حجم نے دونوں حکومتوں کو عمل درآمد کرنے پر مجبور کر دیا۔ ستمبر 1947 کے اوائل میں بھارت اور پاکستان کے وزرائے اعظم نے لاہور میں ملاقات کی اور مغوی عورتوں کی برآمدگی کے معاملے پر تبادلہ خیال کیا۔ اس ملاقات کے بعد ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا جس کے مطابق: دونوں طرف کی مرکزی حکومتوں اور مشرقی اور مغربی پنجاب کی حکومتوں کی طرف سے واضح کیا جاتا ہے کہ جبری تبدیلی مذہب اور شادیوں کو قانونی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ مزید یہ کہ مغوی خواتین اور لڑکیوں کو ان کے خاندانوں کے حوالے کیا جائے گا۔ اس ضمن میں حکومتیں اور متعلقہ حکام تمام اقدامات بروئے کار لائیں گے۔[1] اس حوالے سے یہ اخذ کیا گیا تھا: چونکہ مغوی افراد کو زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا اس لیے ایسی حالت میں کی گئی شادیاں قابل قبول نہیں ہیں۔ بعد ازاں اس برس 6 دسمبر کو جب کاغذ، پنسلوں، میزوں اور دیگر اثاثوں کی تقسیم کا کام بہ مشکل مکمل ہو چکا تھا اور جب کہ کئی پُرخار معاملات بہ دستور زیر التوا تھے، یہ ابتدائی معاہدہ بین الریاست انتظامیہ کے لیے کافی تقویت کا باعث بنا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں حکومتوں میں سے کسی نے یہ تردید نہیں کی کہ اغوا کے واقعات نہیں ہوئے—— یوں یہ قیاس آرائی کی گئی تھی کہ سرکاری حکام ایک دوسرے کی حدود میں مغوی عورتوں کی بازیابی کا باقاعدہ طریقہ کار وضع کریں گے۔ یہ دونوں ملک اس بات پر بھی متفق ہو گئے کہ جن عورتوں کو جبری تبدیلی مذہب کے ذریعے شادی پر مجبور کیا گیا، انھیں واپس کر دیا جائے گا۔ اس کے لیے طاقت کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا اور انھیں ''اپنے'' گھروں یا دیگر الفاظ میں اپنے ہم مذہب مقام پر واپس بھیج دیا جائے گا۔ یہ ایک عجیب سی منطق تھی۔ کم از کم بھارتی حکومت کے لیے... حالانکہ بھارت کی طرف سے تقسیم کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کے پس منظر میں مذہب کے بجائے سیکولر نظریہ کارفرما رہا۔ (حالیہ تاریخ میں اس پر بھی شکوک وشبہات نظر آنے لگے ہیں) اس طرح نظریاتی طور پر جہاں عورت اس

---

1. The Story of Re-habilitation مصنف: یو بھاسکر راؤ، دہلی، محکمہ بحالیات، 1967، صفحہ: 30

قوم کی برابر درجے کی شہری تھی وہاں اب مذہبی حوالے سے اس کی شناخت کی جانے لگی۔ ان حالات میں اغوا ہونے والی ہندو اور سکھ عورتوں کا ''مناسب'' گھر انڈیا کو متصور کیا جا رہا تھا، جب کہ مسلمانوں کے لیے اپنے اختیار کا حق نہیں دیا گیا۔ نظریاتی طور پر تقسیم کے وقت ہر مرد اور عورت شہری کو اپنی پسند کی قوم کے ساتھ رہنے کا اختیار دیا گیا تھا، لیکن اگر بدقسمتی سے کوئی عورت اغوا ہو گئی تو پھر اس کا یہ اختیار ختم ہو جائے گا۔

خواتین کی بازیابی کے لیے جو مشینری تشکیل دی گئی وہ پولیس افسروں اور سماجی ورکروں، بالخصوص خواتین پر مشتمل تھی۔ یہ عورتیں متمول گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور سماجی شعبے کو وقت دینے کی خواہاں تھیں۔ ایسی خواتین میں مردولا سارا بھائی، پریم وتی تھاپڑ، کملا بن پٹیل اور دمینتی سہگل شامل تھیں۔ نیچے درج کیے گئے تفصیلی اقتباس میں دمینتی سہگل بیان کر رہی ہے کہ وہ کس طرح اس شعبے میں داخل ہوئی۔

دمینتی سہگل

ماسی پریم وتی اپنی شادی کے تین ماہ بعد ہی بیوہ ہو گئی۔ شادی کے لیے اسے سکول سے اٹھا لیا گیا تھا لیکن تین ماہ بعد شوہر کے انتقال پر اس نے دوبارہ (کانونٹ) سکول میں مس تھاپڑ کے طور پر داخلہ لے لیا۔ وہ ایک ریاضی دان تھا۔ (غالباً اشارہ شوہر کی طرف ہے: مترجم) وہاں پریم وتی نے ایف اے، بی اے، ایم اے اور پھر ڈبل ایم اے کر لیا۔ اس کے بعد اس نے کیمبرج سے اکنامکس کی ڈگری لی۔

ایک دن لاہور کا مشہور آریہ سماجی مہاتما ہنس راج میرے نانا کو ملنے آیا اور کہا تھاپڑ صاحب ہم آپ سے ایک بُنیادی سوال پوچھنے آئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں ناں آریہ سماجی لوگ مطلب کے بغیر کہیں نہیں جاتے۔ ہم آپ سے بھی کچھ پوچھنے آئے ہیں۔ وعدہ کریں کہ ہم جو کچھ پوچھیں گے، آپ ہمیں بتائیں گے۔ تھاپڑ صاحب نے پوچھا کم از کم مجھے کچھ اشارہ تو دیں کہ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا، نہیں۔ لیکن آپ کو وہ چیز دینے کا وعدہ کرنا پڑے گا۔ ہم جو لینے آئے ہیں لے کر ہی جائیں گے۔ آپ کو پتہ ہے آریہ سماجی لوگ ضد کے کتنے پکے ہیں۔ نانا بولے ٹھیک ہے لیکن

احتیاط سے سوچیں کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں وہ میں دے بھی سکتا ہوں۔ انھوں نے کہا: آپ کی بیٹی جو حال ہی میں (بیوہ ہو کر) واپس آئی ہے اسے زندگی بھر کے لیے ہمارے سپرد کر دیں۔ ہماری تنظیم کا ایک ڈی اے وی کالج ہے لیکن سکول کوئی نہیں۔ ہم سکول کا انچارج آپ کی بیٹی کو بنانا چاہتے ہیں۔ اور وہ اعزازی طور پر کام کرے گی۔ میرے بھائی جی بولے: آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے اس کی تعلیم پر بہت رقم خرچ کی ہے اور اسے اب کئی جگہوں سے ملازمت کی پیش کش ہو رہی ہے۔ (اتفاق سے میرے لیے ان دنوں ملازمت کی کئی آفرز آئی تھیں) اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اسے اعزازی طور پر کام کرنے دوں۔ اس کی گزر بسر کیسے ہوگی؟ وہ کہاں سے کھائے گی؟ وہ ہنس پڑے اور کہا: رائے صاحب بچوں جیسی باتیں نہ کریں۔ آپ کے تین بیٹے ہیں، ہیں کہ نہیں؟ اگر چوتھا بھی بیٹا ہوتا تو کیا کرتے؟ اسے نکال باہر کرتے؟ بیٹی کو بھی اپنا لڑکا سمجھیں، جائداد میں سے اسے حصہ دیں۔ وہ اس پر گزارا کرے گی۔ میرے نانا... وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے سوچا میں نے لڑکی پر کتنا خرچ کیا ہے اور اب اسے کسی کے حوالے کر دوں... لیکن آنٹی پریمی نے مداخلت کی اور کہا: میں نے فیصلہ کر لیا ہے، میں یہ کام کروں گی۔ میں ان کے ساتھ کام کروں گی، انھوں نے کہا پریمی سمجھنے کی کوشش کرو، ایسا نہ کرو، لیکن وہ اڑ گئیں۔ اس کے بعد، ماسی، وہ ایک روپیہ ماہانہ پر کام کرنے لگیں... ہم سب ان کے ماتحت تھیں... ایک روپیہ ماہانہ پر...

تم جانتی ہو وہ کتنی اچھی تھیں، کتنی اچھی شخصیت تھی، وہ پہلے بھی سوشل ورک کرتی رہی تھیں، پوری زندگی انھوں نے یہی کام کیا اور لاہور میں کئی لوگ ان کے نیچے کام کرتے تھے۔ بعد میں جب وہ بیگم نہرو کے پاس گئیں اور پوچھا کہ ان کے لیے کوئی کام ہے وہ بولیں: جواہر لال کسی معاملے پر کام کر رہے ہیں، دونوں حکومتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے، تم جانتی ہو ہماری جو عورتیں اغوا ہوئی ہیں وہ بڑی بُری حالت میں ہیں۔ ہمیں ان کو اغوا کرنے والوں کے چنگل سے چھڑانا ہے۔ یہاں ہماری طرف سکھوں نے بھی وہی کچھ کیا ہے۔ اس لیے ہم نے ایک امدادی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس میں تمھارے ذمے بھی کچھ کام لگایا جائے گا۔ ماسی نے کہا: اب تو میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں، اور مجھے بہت تھوڑی... مجھے رہائش کی ضرورت ہے،

ایک کار اور ایک چپراسی بھی چاہیے۔ براہِ کرم یہ مجھے فراہم کر دیں۔

ایک روز ماسی نے مجھے کہا: سردیاں سر پر آ گئی ہیں اور ہمارے پاس کوئی رقم ہے... نہ کپڑے، تم جانتی ہو ناں آنٹی پریمی کو کپڑے پہننے اور صاف ستھرا رہنے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے زندگی بھرپور طریقے سے گزاری، لاہور میں ہماری الماریاں چیزوں سے بھری رہتیں، اور ہم کو یہ تک معلوم تھا کہ لاہور میں کن خاندانوں نے ہمارے گھروں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ان دِنوں قافلے لاہور کو جاتے رہتے تھے، لہٰذا ہم نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ماسی نے کہا: دانتی چلو چلتے ہیں۔ ہم ڈی اے وی کالج کیمپ لاہور میں ضرور جائیں گے۔ وہاں سے ہم سرکاری جیپوں پر اپنے پُرانے گھروں کو جائیں گی اور وہاں سے اپنی دھوتیاں اور شالیں اُٹھا لیں گی۔ لہٰذا ہم چلے گئے اور ہم ڈی اے وی کالج گئے جہاں سے جیپوں کے ساتھ ماسی کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں کے مکینوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ بیگمات باہر نکل آئیں۔ ہم ان سے واقف تھے۔ ماسی نے کہا: ہمارا یہاں آنے کا ایک مقصد ہے۔ میں یہاں اپنی الماریوں کو تالے لگا کر گئی تھی، اور اس وقت سردی سے میری قفلی جم رہی ہے۔ مجھے یہاں سے کپڑے اور شالیں لینا ہیں۔ انھوں نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہیں؟ تمام چیزیں لاوارث چیزوں کے مرکز کو دی جا چکی ہیں اور یہاں تو کچھ باقی نہیں بچا۔ مجھے اور ماسی کو شدید صدمہ پہنچا۔ انھوں نے کہا کہ آیے چائے پیئیں۔ لیکن ہم ایسا نہ کر سکے۔ وہ مُصِر رہے کہ آپ کی کوئی چیز یہاں موجود نہیں...

ہم واپس کیمپ چلے آئے اور وہیں کھانا کھایا۔ کیمپ میں مہاجرین کو جمع کیا جاتا، پھر قافلوں کی صورت میں سرحد پار بھجوا دیا جاتا۔ لہٰذا ہم نے بڑے بڑے برتنوں میں پکائی گئی دال روٹی کھائی۔ پھر مردولا سارا بھائی وہاں آ گئیں۔ ماسی انہیں پہلے سے جانتی تھی، لیکن میں ان سے واقف نہیں تھی۔ البتہ ان کی کہانیاں ضرور سنی تھیں۔ وہ بولیں مس تھاپڑ تم یہاں! ماسی نے کہا: ہم یہاں کپڑے لینے آئے تھے لیکن کچھ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ مردولا سارا بھائی نے کہا: تمھیں (ماسی) نئے ادارے کا پتہ ہے۔ (اغوا ہونے والی عورتوں کی بازیابی کی سنٹرل ریکوری آرگنائزیشن) انھوں نے فیصلہ کیا ہے تمھیں اس کا ڈائریکٹر بنا دیا جائے اور یہ کون لڑکی ہے؟ اشارہ میری طرف تھا۔ ماسی

نے کہا: یہ میری بھانجی ہے۔ اس نے کہا: اوہ گڈ، میں اسے بھی اپنے ساتھ کام کرنے پر خوش آمدید کہوں گی۔ یہ ویسی ہی ہے جیسی میں چاہتی ہوں۔ پریمی تمھیں پتہ ہے، اس تنظیم نے کام شروع کر دیا ہے۔ تم وہاں کی ڈائریکٹر ہو گی اور یہ یہاں کی ڈائریکٹر ہو گی۔ مجھے بہت شرم محسوس ہو رہی تھی اور پورا دن میں نے سوائے دعائیں کرنے، تسبیح پھیرنے اور تنہا ٹہلنے کے کچھ نہ کیا۔ میں سمجھ نہ سکی کہ کیا ہونے والا ہے اور کہا: ''نہیں، نہیں مجھے اس کام سے دور رکھو۔'' لیکن اس نے کہا: ''نہیں، میں اسے چیف لائزان آفیسر مقرر کر دوں گی۔'' اور ماسی سے کہا: اسے واپس لے کر نہ جانا، یہ اب یہیں رہے گی اور میں اسے بہت جلد اپائنٹمنٹ لیٹر جاری کر دوں گی۔ میں نے پوچھا کیا ہونے والا ہے اور اس نے بتایا، میں تمھیں ڈائریکٹر بناؤں گی۔ میں نے پوچھا: کس چیز کی ڈائریکٹر؟ اس نے کہا: ریکوری کی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ کس چیز کی ریکوری ہونا تھی اور میں ڈائریکٹر کس طرح سے تھی۔ میں دو اور دو جمع نہیں کر سکتی۔ اس نے کہا: نہیں، نہیں۔ فیصلہ ہو چکا ہے، فیصلہ ہو گیا۔ میں نے کہا: میرے پاس کپڑے نہیں ہیں... وہ بولی: جیپ جا رہی ہے اور تمھارے لیے کپڑے لے آئے گی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کیا ہو رہا ہے... اچانک ماسی چلی گئی۔ میرے پاس کوئی کپڑے نہیں تھے... پھر تمھیں میری عادت کا پتہ ہے ناں، جب بھی مجھے کوئی مشکل پیش آتی ہے میں بھگوان سے باتیں کرتی ہوں، وہی میرا ٹھاکر ہے، میں کچھ نہیں جانتی، میں صرف اس کی مرضی کی پابند تھی، لہٰذا میں نے اس سے کہا: بھگوان تم یہ کیا کھیل کھیل رہے ہو؟ میں ڈائریکٹر بن گئی ہوں، تقرر نامہ میرے ہاتھ میں ہے، حالانکہ میرے باپ دادا میں سے کوئی ڈائریکٹر نہیں بن سکا تھا، لہٰذا اب سب کچھ تمھارے ہاتھ میں ہے، میری لاج رکھ لینا۔

کچھ عرصے بعد ایک پیغام آیا کہ ایک نوجوان لڑکی ہے جسے اغوا کر لیا گیا تھا اور اب کسی قریبی علاقے میں اس کا سراغ مل گیا ہے، لہٰذا کچھ بھی ہو، ہم نے اسے بازیاب کرنے کا بندوبست کرنا ہے، مہاجرین وہاں بڑی تعداد میں آتے تھے، انھیں وہاں جمع کیا جاتا اور جب ایک مخصوص تعداد جمع ہو جاتی، قافلے روانہ ہو جاتے۔

☆☆☆

MashalBooks.com

حصہ دوم

تاریخ ایک عورت کا بدن ہے

بڑی تعداد میں عورتوں کے اغوا کے مسئلے سے پریشان ہو کر بھارت اور پاکستان کی حکومتوں نے 6 دسمبر 1947ء کو ''انٹر ڈومینین ٹریٹی'' پر دستخط کیے تا کہ مغوی خواتین کو برآمد کیا جا سکے۔ اس آپریشن کو سنٹرل ریکوری آپریشن کا نام دیا گیا، اور ایک عورت مردولا سارا بھائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کی مہم چلائی۔ ان کا تعلق احمد آباد کے ایک امیر کبیر صنعتی خاندان سے تھا۔ وہ گاندھی اور نہرو پر کافی اثر انداز ہوتی تھیں، جب کہ کانگریس کی سیاست میں بھی ان کا اچھا خاصا عمل دخل تھا۔ انہوں نے نہرو کو 4 صفحات پر مشتمل نوٹ لکھا، جس میں مغوی عورتوں کی بازیابی کی ضرورت کی اہمیت بیان کر کے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ ریکوری آپریشن تیز کرنے پر تیار ہو جائے۔ 1947ء کی انٹر ڈومینین کانفرنس میں جہاں اس کام پر اتفاق کیا گیا وہاں اس کی ذمہ داری سارا بھائی کو سونپ دی گئی اور انہیں چیف سوشل ورکر تعینات کر دیا گیا۔ ان کی معاونت کے لیے ایک ٹیم بھی تشکیل دی گئی جو زیادہ تر پولیس پر مشتمل تھی۔

دونوں ملکوں میں معاہدے کے فوراً بعد اسے قانون ساز اداروں سے بھی پاس کرا لیا گیا۔ The Abducted Persons Recovery and Restoration Ordinance کو پہلے بل کی شکل دی گئی۔ پھر 1949ء میں اسے باقاعدہ ایکٹ بنا دیا گیا۔[1] اس ایکٹ کے مندرجات کے مطابق گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک عمل درآمد مشینری تشکیل دی اور اہم بات یہ ہے کہ ''مغوی شخص'' کی تعریف کا تعین کر لیا گیا۔

---

1. The Abducted Persons (Recovery and Restoration) Act; 1949 (Act No: LXV of 1949).

یہ بہت ضروری تھا کیوں کہ یہ معاملہ کافی پیچیدہ تھا کہ یہ فیصلہ کیسے کیا جائے کہ فلاں شخص اغوا شدہ ہے اور فلاں شخص نہیں۔ اگر ایک عورت اپنی مرضی سے گئی تو پھر ان چیزوں پر غور کیا گیا، جن پر غور و تفکر کرنے کی ضرورت تھی۔ سادہ الفاظ میں اب سٹیٹ نے اس حوالے سے وقت، تاریخوں اور دیگر پُر خار مسائل کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ لہٰذا اس کے لیے تاریخ متعین کر دی گئی۔ پنجاب میں تشدد کی لہر 1947 کے اوائل میں چلی۔ یوں یکم مارچ 1947ء کے بعد ہر وہ عورت جو دوسرے مذہب کے مرد کے ساتھ رہ رہی تھی یا اس کے ساتھ کوئی رشتہ قائم کر لیا تھا اسے مغوی متصور کیا گیا، یا اس تعلق کو جبری سمجھا گیا۔ اس تاریخ کے بعد تمام شادیاں اور تبدیلی مذہب کو جبری فیصلہ قرار دے کر دونوں حکومتوں نے قانونی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بارے میں خاتون کی رائے، اس کے احتجاج کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ اس حوالے سے بعض ''حقیقی'' رشتے بھی قبول نہ کیے گئے، اور خاتون کی کوئی مرضی نہ چلنے دی گئی۔ اس تاریخ کے طے ہونے سے کئی معاملات حل طلب رہ گئے۔ ایسی خواتین جن کے بچے ''مکسڈ یونین'' کے باعث پیدا ہوئے۔۔۔ کیا ایسی عورتیں سب مغوی سمجھی گئیں؟ یا یہ کہ تاریخ کا اطلاق ایسے بچوں پر ہونا تھا جو یکم مارچ کے بعد پیدا ہوئے؟ یہ ایکٹ ان سوالات کے جواب دینے میں خاموش ہے۔ امدادی کام میں چیف سوشل ورکر کو ایک یونٹ کی معاونت حاصل تھی جس کا بیشتر حصہ پولیس پر مشتمل تھا۔ پورے یونٹ میں ایک اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل (اے آئی جی)، دو ڈی ایس پی، 15 انسپکٹر، 10 سب انسپکٹر اور 6 اے ایس آئی شامل تھے۔ خواتین سوشل ورکروں سمیت دونوں ملکوں میں اس پوری ٹیم کو اختیار تھا کہ وہ دوسرے ملک کا سفر کرے اور مغوی خواتین کی جس طرح مناسب سمجھے ''تلاش'' اور ''برآمدگی'' آپریشن کرے۔ دونوں طرف کے سماجی کارکنوں کو مغوی عورتوں کی تلاش کے لیے ہر ممکن کارروائی کا اختیار تھا۔ اکثر اوقات خواتین کا سراغ لگانے کے لیے جب مقامی پولیس کا تعاون حاصل کیا جاتا تو اس کی طرف سے وارننگ جاری ہونے کے بعد متعلقہ خاتون کو غائب کر دیا جاتا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے سوشل ورکروں نے جوابی طریقے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ وہ بھیس بدلتے، فرضی نام اختیار کرتے، اور خفیہ طریقے سے کارروائی کرتے ہوئے اچانک گھروں پر چھاپہ مارتے جہاں مغوی

عورتوں کو قید رکھا گیا ہوتا۔ یہاں دو واقعات کی تفصیل دی جا رہی ہے۔

صبح کے وقت دیہی علاقوں میں لاپتہ لڑکیوں کو تلاش کرنا ہمارا معمول تھا۔ شام کو ہم ہیڈ آفس آ جاتے اور بازیاب ہونے والی لڑکیوں کی وصولی ڈالی جاتی۔ اس کے بعد دونوں ملکوں میں ان کا تبادلہ کیا جاتا۔ صرف ایک فرق تھا۔ وہ ورکر بہت جرأت مند تھے... وہ جاتے اور عورتوں کو تلاش کر لیتے...

ہم انڈے بیچنے چلے جاتے، ہم دیہات میں چلے جاتے، ہم لوگوں سے لسی پلانے کی فرمائش کرتے اور کہتے اماں، اماں! ہم بہت دور سے آئے ہیں، ازراہِ کرم ہمیں لسی پلا دیں۔ اس طرح ہم انڈے بیچتے اور لسی کی فرمائش کرتے۔ پھر ہم فرضی کہانیاں سنانا شروع کرتے اور کہتے ہم ہندوستان سے آئے ہیں۔ آپ کو بتاؤں حرامی سکھ میرے چھوٹے بھائی کی جوان بیوی کو اُٹھا لے گئے ہیں، انھوں نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ وہ اب مایوس اور تنہا ہو گیا ہے۔ کیا آپ کو اس علاقے میں کافر کی کسی بچی کی موجودگی کا علم ہے—— اگر کوئی ہے تو ہمیں بتا دیں، شاید کہ ہم اسے خرید لیں اور وہ بے چارہ آدمی (میرا بھائی) کم از کم اپنا گھر تو دوبارہ بسا لے گا۔ اس پر وہ بتاتے کہ فلاں جگہ پر فلاں گھر میں لڑکی ہے... اس طرح ہم انڈے بیچنے جاتے اور کہتے، اماں، ہمیں لسی دے دو۔ یا یہ کہتے، ماں! میں بھوکی ہوں، مجھے کچھ کھانے کو دے دو۔ اس طرح ہم ان کا دل جیتنے کی کوشش کرتے۔ پھر ان سے کہتے ہم کوئی لڑکی خریدنا چاہتے ہیں—— پھر پوچھتے کہ جن لوگوں کے پاس لڑکی ہے وہ اسے چھوڑ دیں گے۔ اور پھر نہایت آہستگی سے پتہ دریافت کر لیتے—— معلومات حاصل کرنے کا ہمارا یہی طریقہ تھا۔

☆☆☆

دہلی سے آئے مہاجرین میں ایک نوجوان شخص تھا جس نے ڈیڑھ برس قبل شادی کی تھی اور اس کی جوان بیوی اور دو ماہ کا بچہ لاپتہ تھا۔ ایک دن کسی

نے اسے بتایا کہ اسے معلوم ہوا ہے کہ وہ بھوگل (دہلی کے قریب) کے ایک جاٹ کے پاس ہے۔ یہ اطلاع ایک بوڑھے چیئرمین نے دی تھی۔ اس نے لڑکی کے لیے بہت ہمدردی محسوس کی اور وعدہ کیا کہ وہ اس کا پیغام سرحد پار اس کے شوہر کو پہنچا دے گی۔ اس نوجوان نے مجھے بتایا کہ اس کی بیوی نے اس کی تصویر بھی منگوائی جو اس نے بھجوا دی ہے... چیئرمین خاتون نے بتایا وہ اسے بڑی اچھی طرح جانتی ہے اور اغوا کنندہ مٹھن اس عورت سے کھیتوں میں کام لیتا تھا۔

ایک روز سوشیلا نائیر ہمارے کھیت میں آئی اور کہا: آؤ میں تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ بتاؤ کھیت کس جگہ ہیں؟ شام ڈھلے ہم اوکھلا پہنچ گئے، لیکن سوشیلا کو کوئی ڈر اور جھجک نہیں تھی۔ وہ مجھ سے 20 قدم آگے آگے چل رہی تھی، اور جھاڑیوں، کھیتوں میں سے گزرتی چلی گئی۔ ہم کئی عورتوں سے ملے لیکن وہ عورت نہ ملی جس کی ہمیں تلاش تھی۔ سوشیلا متعلقہ گھر میں کسی خوف کے بغیر گھس گئی۔ میں اس کے پیچھے تھی۔ تمام وقت شوہر اوصاف اپنی بیوی کا نام پکارتا رہا: جان بائی، جان بائی، لیکن کوئی جواب نہ ملا اور سوشیلا عورتوں سے کہہ رہی تھی دیکھو! اگر لڑکی تمھارے پاس ہے تو فوراً ہمارے حوالے کر دو، مجھے بتاؤ وہ کہاں ہے؟ ابھی تک تو میں اکیلی آئی ہوں اور کسی کو نقصان پہنچائے بغیر لڑکی لے جاؤں گی لیکن اگر پولیس آئی تو تم جیل جاؤ گے اور تمھیں سزا ہو گی۔ لیکن وہاں لڑکی کے کوئی آثار نظر نہ آئے... اور رات کے 9 بجے ہم واپس آ گئے۔ مایوس و نامراد۔[1]

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی جان بائی جسے سوشیلا اور انیس قدوائی ڈھونڈ رہے تھے وہ گھر میں بھوسے کے ڈھیر کے پاس باندھ کر قید کی گئی تھی، اس خوف سے مبادا لڑکی کا سراغ مل جائے، اغوا کنندہ اسے لے کر یو پی فرار ہو گیا تاہم راستے میں جان بائی بھاگنے میں کامیاب ہو گئی اور نماز

1: ''آزادی کی چھاؤں میں'' مصنف: انیس قدوائی، نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی، 1990، صفحہ 131۔

پڑھتے مسلمانوں کی طرف چلی گئی اور انھیں اپنی داستان سنائی، جس کے بعد اسے شوہر کے پاس پہنچا دیا گیا۔ البتہ اس کا بچہ کہیں کھو چکا تھا۔ ہر کہانی کا انجام خوش گوار نہیں ہوتا تھا۔ ہزاروں عورتیں تھیں جنھیں کامیابی سے غائب کر دیا گیا اور پھر کبھی ان کا سراغ نہ ملا۔

تاریخوں کے تعین اور قانون سازی کے باوجود بعض قسم کی مشکلات ختم نہ ہو سکیں۔ کئی عورتوں نے احتجاج کیا۔ انھوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا، حالانکہ یہ ناممکن دکھائی دیتا ہے لیکن زینب کی طرح کئی عورتوں نے اغوا کاروں سے یا جن لوگوں نے انھیں خریدا تھا، ان سے رشتے اُستوار کر لیے۔ شروع میں مجھے اس بات پر یقین کرنا مشکل تھا، لیکن بعد میں اس میں بگڑی قسم کا سچ مجھے نظر آ گیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں کی اکثریت کے لیے بعض لحاظ سے شادی اغوا ہی ہوتی ہے۔ ایک نامعلوم شخص کے پلّے باندھنے کا عمل۔ ایک قسم کا حملہ... پھر یہ (اغوا ہونے کی) واردات بھلا انھیں مختلف کیوں لگتی؟ محض اس لیے کہ مرد کا تعلق دوسرے مذہب سے تھا؟ ایک مغوی عورت نے کہا: ''مجھے واپس کیوں جانا چاہیے؟ تم لوگ مجھے بھارت میں کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ میرے لیے مذہب اور عقیدے میں رکھا ہی کیا ہے؟'' ایک اور بولی: ''پہلے میں نے اپنا شوہر کھو دیا، اور اب دوسرے کے پاس ہوں، تم مجھے بھارت بھیج رہے ہو، وہاں میرا کون ہے؟ آپ مجھ سے ہر روز خصم بدلنے کی توقع نہ رکھیں۔''[1]

مردولا سارا بھائی سوشل ورک میں متوسط طبقے کی عورتوں کو لانے میں کافی فعال تھی۔ ان میں سے اکثر خواتین نے مغوی سکھ اور ہندو عورتوں کے ساتھ کام کیا تھا۔ دہلی میں پُرانا قلعہ اور مقبرہ ہمایوں میں قائم مسلم کیمپوں میں ایک اور سوشل ورکر بہت سرگرم رہی۔ اس کی توجہ کا مرکز ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں اغوا ہونے والی مسلمان لڑکیوں کی بازیابی تھا۔ انیس قدوائی کا شوہر شفیع احمد قدوائی تقسیم کے دوران میں فسادات میں مسوری میں مارا گیا، وہ وہاں کام کرتا تھا۔ انیس کی التجاؤں کے باوجود اس نے اپنا دفتر ماتحت عملے اور اپنی ملازمت (وہ سرکاری افسر تھا) کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس کی موت نے انیس قدوائی کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ غم گساری کے خیال سے

1۔ ''دی پارٹیشن آف پنجاب'': مصنف کرپال سنگھ، پبلی کیشنز بیورو، پنجاب یونیورسٹی، پٹیالہ، 1972ء صفحہ: 171۔

گاندھی سے ملنے چلی گئی۔ انھوں نے اسے مشورہ دیا کہ ماتم چھوڑو اور خود کو کسی کام میں مصروف کرلو، جس پر قدوائی سماجی کام کی طرف آ گئی اور مسلمان مہاجرین کی مدد کرنے لگی۔ اس دوران میں اس کا واسطہ کئی مغوی مسلمان عورتوں سے پڑا اور اس نے ان کی الجھنوں پر لکھنا شروع کر دیا۔ اس میں سے ایک اقتباس میں یہاں دے رہی ہوں:

اس دوران میں بسا اوقات لڑکی کو مار دیا جاتا یا زخمی کر دیا جاتا۔ ''اچھا مال'' پولیس اور فوج کے درمیان بانٹ دیا جاتا۔ ''دوسرے درجے کا مال'' کسی کو بھی دیا جا سکتا تھا اور یہ لڑکیاں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ، پھر اگلے ہاتھ میں چلی جاتیں۔ اس طرح وہ ہوٹلوں میں نمائش کا سامان بن جاتیں یا پھر انھیں پولیس افسروں کے حوالے کر دیا جاتا تاکہ وہ ان سے دل بہلائیں۔

ان لڑکیوں میں کوئی ایک جو حالات کا شکار رہی کو اپنا رحم دل، نجات دہندہ ایک فرشتہ نظر آتا، جس نے لوٹ مار کے اس دور میں اسے بچایا۔ اس کے لیے لڑائی کی، اور اسے بچا لیا، اور جب وہ شخص اس کے برہنہ جسم کو ڈھانپتا—— کیوں کہ لڑکی کے کپڑے تک کوئی چور لے گیا ہوتا—— اور جب وہ اپنی بُنیان یا تن کا کپڑا اس لڑکی کے بدن پر ڈالتا تو اس حالات کی ماری کو ایک لمحے کے لیے اپنی ماں کا کٹا ہوا گلا، اپنے باپ کی خون آلود لاش، اپنے شوہر کی تڑپتی لاش، سب کچھ بھول جاتا۔ وہ اپنے نجات دہندہ کا شکریہ ادا کرتی اور اسے بھلا ایسا کیوں نہیں کرنا چاہیے؟ خوف و دہشت سے بچا کر وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ اسے عزت و احترام دے رہا ہے۔ اسے شادی کی پیش کش کرتا ہے، وہ زندگی بھر کے لیے اس کی غلام کیوں نہ رہے؟

اور پھر بہت عرصے بعد یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ لٹیروں کے ایک ہجوم کے درمیان وہی ایک شخص اتنا معصوم نہیں رہ سکتا۔ پولیس جیسے محکمے کے اندر وہ اتنا شریف کیسے رہا ہوگا۔ لیکن سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا گیا۔ ہر کوئی ایک عورت کی آبرو کے تحفظ کے لیے زندگی اور موت سے کھیلتا رہا اور ہزاروں مائیں بہنیں ان ''بہادر'' افراد کو بددعائیں دیتیں

جنھوں نے ان کی بچیاں اغوا کر لی تھیں۔

لیکن جب اس بات کا احساس ہوا بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب اس عورت کے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ وہ ماں بننے والی ہوتی یا وہ کئی ہاتھوں سے گزر چکی ہوتی تھی۔ اَن گنت مردوں کی شکل دیکھنے والی ہندوستان کی یہ وہ بیٹی بھلا اپنے والدین یا اپنے شوہر کا چہرہ کیسے دیکھ سکے گی؟[1]

اغوا ہونے والی عورتوں کے بارے میں انیس قدوائی کے محسوسات ـــــ کہ قاری اس طرح سمجھ نہیں سکتا جس طرح ایک عورت ہونے کے ناتے میں نے ان کی باتیں سنتے ہوئے محسوس کیا ـــــ جیسا کہ وہ کہتی ہے ان بے شمار سوشل ورکروں کے کردار پر روشنی ڈالنا ہوگی جنھوں نے مغوی عورتوں کی بازیابی کے لیے کام کیا۔ حکومت کے فرض شناس ملازمین کی طرح انھوں نے عورتوں کی مدد عورتوں کے طور پر کی اور حکومت کے ایجنڈے کی تکمیل میں مدد کی۔ اگرچہ بعض اوقات وہ خود بھی بے بس ہو جاتیں اور اُنھیں اپنی بے بسی کا احساس ہوتا کہ انھیں اپنے ذمے لگائے گئے کام کی ادائیگی میں بہت کم اختیار حاصل تھا۔ قدوائی اپنے احساسات کو یوں بیان کرتی ہے:

... ایسی خواتین بھی تھیں جنھوں نے غریب گھرانوں میں آنکھ کھولی اور غربت کے سوا زندگی میں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ کبھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا نہ چیتھڑوں کے سوا کچھ پہنا تھا، لیکن اب وہ جن مردوں کے ہتھے چڑھ گئی تھیں، انھوں نے انھیں ریشمی کپڑے اور بڑھیا دوپٹے خرید کر دیے، انھیں آئس کریم اور کافی کے ذائقے سے روشناس کرایا۔ جو انھیں فلم دکھانے سینما لے گئے، وہ ایسے آدمیوں کو چھوڑ کر واپس کیسے جاتیں اور چیتھڑوں میں ملبوس کھیتوں میں ایک بار پھر جلتی دوپہروں میں کام کرنے کو تیار ہوتیں؟ اگر وہ عورت اس سمارٹ وردی والے کو چھوڑ دیتی تو یقیناً اسے ایک کسان کے پلّے بندھنا پڑے گا، ایک گندے شخص کے ساتھ رہنا پڑے گا، جس کے کندھے پر ہل ہوتا۔ لہٰذا وہ خوف ناک ماضی کو بھلانے پر تیار تھیں۔ اس کے ساتھ وہ غیر یقینی اور خدشوں سے بھرپور مستقبل کو بھول کر صرف حال میں رہنا چاہتی تھیں۔

---

1. : ''آزادی کی چھاؤں میں'': مصنفہ انیس قدوائی، صفحہ:142

انھیں ایک اور بھی خوف تھا۔ وہ لوگ جو ان کے دوست یا دُشمن تھے، انھیں واپس لے جا رہے تھے، اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ وہ انھیں آگے فروخت نہیں کریں گے؟ بہرحال وہ کئی بار بک چکی تھیں اور مزید کتنی بار ایسا ہو گا؟ ایسے ہی کئی پولیس کی وردی والے کتنی مرتبہ، بار بار اسے اِدھر اُدھر لے جاتے رہے تھے۔ وہ لینے آنے والے معزز شخص کے اونچے شملے پر کیسے اعتبار کرتی جو اس کا رشتہ دار بن کر آیا تھا اور ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اس کا سودا کرتے رہے۔ ان حالات میں بدنامی کا داغ دُور نہ ہو پاتا۔ حتیٰ کہ اسے کھینچ کر لے جایا جاتا اور چند روز تک اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رہنا پڑتا۔

مذہب یہاں بھی رُکاوٹ بنتا لیکن آخر اس چیز کے بارے میں لڑکیاں کتنا کچھ جانتی تھیں؟ مرد کم از کم پڑھ سکتے تھے، وہ مسجد جا کر نماز پڑھ سکتے ہیں اور مُلّا کا وعظ سن سکتے ہیں۔ لیکن مُلّا عورتوں کو وہاں کھڑے ہونے تک کی اجازت نہیں دیتا۔ جب وہ ایک عورت کو دیکھتے ہیں، ان کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے، 'دفع ہو جاؤ، یہاں سے چلی جاؤ، تمھارا یہاں کیا کام ہے؟' ان سے ایسے برتاؤ ہوتا جیسے وہ کوئی کتا ہوں اور انھیں وہاں سے بھگا دیا جانا چاہیے۔ اور اگر مسجد میں عورت آ گئی تو ان کی نماز مکروہ ہو جائے گی۔ اگر وہ وعظ سننے آ جائے تو ہر کسی کی توجہ تقسیم ہو جاتی۔ اگر وہ درگاہ جائے تو مرد انھیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ اگر وہ قوالی کی محفل میں شرکت کرنے کی کوشش کریں تو صوفیوں کی توجہ خدا سے ہٹ کر ان کی طرف مبذول ہو جاتی ہے...

اور اے میری دوست اس مذہب کا خدا بھی اسے (عورت کو) سکون میں نہیں رکھتا، اور جو نیا مرد اس کی زندگی میں آیا وہی اس کا خدا ہوتا۔ اسے ہر کسی سے بات کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ وہ اس مرد کو کبھی نہیں چھوڑے گی جس نے اس کی زندگی میں رنگ بھر دیے...

خواتین کی جھجک کے برخلاف (اگرچہ تمام عورتیں ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوئیں اور کئی اپنی بازیابی اور خاندان کو واپسی پر بہت خوش تھیں) انھیں واپس جانے کے لیے

بہت دباؤ ڈالا جاتا حتیٰ کہ زبردستی کی جاتی تاکہ وہ جانے کے لیے ''قائل'' ہو جائیں۔

دمینتی سہگل

دو نوجوان آدمیوں نے مجھے اطلاع دی کہ ان کی ایک بہن ستیہ کو، جس کی شادی کی تیاریاں جاری تھیں اغوا کر لیا گیا ہے۔ شبہہ ہے اسے پٹھانوں نے اُٹھا لیا ہے اور مجھے کہا کہ اسے کسی طرح تلاش کریں۔ میں نے سنا تھا کہ ـــــ مجھے اب چک کا نام بھول گیا ہے ـــــ بدمعاش پٹھانوں نے دین داروں کی بیٹی کو اغوا کر کے گھوڑے پر بٹھا دیا اور اس کے ہاتھوں میں بندوق تھما دی...

مجھے پتہ چلا کہ ستیہ اب ڈاکوؤں چوروں کے ساتھ تھی اور ان سب سے بڑی مجرم بن چکی تھی۔ انھوں نے اسے تربیت دی تھی اور اب وہ گھوڑوں پر سواری کر سکتی تھی۔ میں نے ایس پی سے کہا کہ میں اس جگہ جانا چاہتی ہوں اور وہ بولا، وہ بہت خطرناک جگہ ہے۔ میں نے کہا: خطرہ جائے بھاڑ میں، مجھے وہاں جانا ہے۔ میں نے بتایا تھا ناں! کہ اغوا کرنے والے مخبروں کے ذریعے اطلاع حاصل کرتے اور ہماری کارروائی سے پہلے وہاں سے بھاگ جاتے تھے اور ہماری اپنی نقل و حرکت بھی بہت محدود ہوتی تھی ـــــ ہمیں بڑا محتاط رہنا پڑتا تھا کہ ہمیں کس جگہ پر جانا ہے اور کیسے جانا ہے۔ تاہم باقی ورکروں کی بہ نسبت میں زیادہ مختلف علاقوں میں جاتی تھی۔ بہرحال اس روز ہمیں کھیتوں اور فارموں میں سے گزر کر جانا تھا اور ایس پی مسلسل کہتا رہا وہ بہت خطرناک اور غیر محفوظ علاقہ ہے۔ میرے ساتھ ایک بیمار عورت تھی۔ صبح کے وقت انھوں نے آگے پیغام بھجوایا کہ ستیہ کو چھوڑ دو، تاہم بڑی مشکلوں کے بعد بالآخر ہم لڑکی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب ہم اسے واپس گجرات لانے والے تھے، پہلے ہم نے ایس پی سے کہا کہ وہ لڑکی کی حفاظت کے لیے پولیس گارد مہیا کرے۔ پٹھان ہمیں کہاں چھوڑنے والے تھے۔ انھوں نے عدالت میں اپیل کی کہ وہ اس لڑکی سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ یہ شروع سے ہی مسلمان ہے۔ تقسیم سے پہلے ہی اس نے دین قبول کر لیا تھا اور وہ مسلمان تھی۔ لہٰذا ڈپٹی کمشنر نے لڑکی مجھ سے لے کر اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے بھائی نے بہت شور مچایا لیکن اسے لڑکی سے ملنے تک کی

اجازت نہ دی گئی۔ میں نے بھی کہا کم از کم اسے بہن سے ملنے ہی دیں، لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ میں بہت پریشان ہوگئی—— میں نے اپنی زندگی خطرے میں ڈالی، کئی مشکلات اور سختیوں سے گزری اور لڑکی کو حاصل کیا۔ اب ڈی سی نے اُسے بری کر دیا تھا۔ پھر میں —— پاکستان کے پہلے وزیراعظم سے ملی۔ کیا نام تھا اس کا؟ ہاں، لیاقت علی، اس وقت وہ کراچی میں تھے (یہاں دمینتی سے غلطی ہو رہی ہے، جس شخص سے ان کی ملاقات ہوئی وہ وزیراعظم نہیں بلکہ وزیر امورِ مہاجرین راجا غضنفر علی خان تھے: مصنفہ) یہ وہ وقت تھا جب بین الریاستی معاہدہ عمل میں آ چکا تھا، جس کے تحت ہندو عورتوں کی بھارت اور مسلمان خواتین کی پاکستان واپسی عمل میں لائی جانا تھی۔ میں نے اس کا حوالہ دے کر وزیر کو ٹیلی گرام بھیجا اور کہا کہ میں نے انتہائی مشکل سے اس لڑکی کو بازیاب کرایا، لیکن ڈی سی نے اسے چھوڑ دیا۔ میں نے خبردار کیا کہ اگر ایسے فراڈ ہوتے رہے تو میں پاکستان میں کام نہیں کروں گی۔ انھوں نے تار بھیجا کہ وہ اگلے روز گجرات آنے والے ہیں اور حکام کو حکم دیا کہ ستیہ دیوی کو ریلوے پلیٹ فارم پر ملاقات کے لیے پیش کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ وہ دیکھیں گے کہ وہ اس ضمن میں کیا کر سکتے تھے۔ یہ خبر ہر طرف پھیل چکی تھی۔ اس حوالے سے... انھوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ جس عورت کو میں نے پٹھانوں سے چھڑوایا، اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس کے بھائی بھی میرے ساتھ تھے۔ بہت سے لوگ وہاں جمع تھے۔ یہ بہت خوف ناک کیس تھا کیوں کہ ڈاکو لوگ انتقام لیتے تھے۔ وہ بھی ایسی صورت حال سے دوچار تھی، اور تم یقین نہیں کرو گی، ہر کوئی سٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔ ایس پی، ڈی سی... جو بھی نام لے لو، وہ سب وہاں حاضر تھے۔ انھوں نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ فوج بھی موجود تھی۔ ایک کپتان تھا، ہم سب ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سوچ لیا کہ اس معاملے سے کیسے نمٹوں گی۔ میں نے ایک کاغذ اور پنسل منگوائی اور کہا میں دو سطریں لکھنا چاہتی ہوں اور میں نے وزیر کے نام لکھا: جناب عالی! آپ بہت دانش مند انسان ہیں، پاکستان کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں ہے—— میں نے ان کی تعریف کی۔ میں نے کہا، یہ سچ ہے کہ آپ کے پاس پاکستان کا سب سے بڑا عہدہ ہے، کیوں کہ آپ وزیراعظم ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ بہت ذہین انسان ہیں۔ میں ایک نادان عورت ہوں، مجھے

معاملات پر کھنے کی کوئی سوجھ بوجھ نہیں۔ میں محض یہ کہنا چاہتی ہوں: میں نے ایک عام سی غریب لڑکی کو بازیاب کر لیا، اور پورا پاکستان یہاں اسے لینے آ گیا ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گی—— کیا بازیابی میں مدد کا یہی طریقہ ہے؟ کیا انٹر ڈومینین معاہدے کا مقصد یہی تھا اور یہاں جو لوگ جمع ہیں کیا وہ اتنے نیچے گر چکے ہیں کہ ایک عورت کے لیے ہزاروں لوگ باہر نکل آئے ہیں؟ کیا ان کے سینوں میں انتقام کی ایسی زبردست آگ بھڑک رہی ہے؟ ان حالات میں آپ مجھ سے کام کرنے کی توقع کیسے رکھ سکتے ہیں؟ میں نے وہ خط لکھا—— ایک مختصر خط۔ اور جب ٹرین آئی میں سیدھی اس طرف چلی گئی۔ لوگ کہنے لگے، ٹرین آ گئی، ٹرین آ گئی، اور ٹرین کیسی تھی—— پوری کی پوری سفید۔ اس کے ہر طرف پاکستان کے پرچم لگے تھے۔ وہ منظر دیکھنے کے لائق تھا۔ ٹرین رکی تو پولیس مجھے وہاں لے گئی۔ ان کا نام کیا تھا؟ لیاقت علی، وہ باہر آ گئے۔ انھوں نے کہا، تم ہی وہ لڑکی ہو؟ میں بولی، جی ہاں، کیا تمھیں شکایت ہے؟ جی۔ انھوں نے کہا: پلیز تم ٹرین کے اندر آ جاؤ، میں بولی صاحب، میں ٹرین کے اندر تو آ جاؤں گی، لیکن آپ صورت حال کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں، ایک عورت کے لیے اَن گنت لوگ، یہ کیا ہے؟ میں سمجھ نہیں سکی۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں نے صرف یہ کیا کہ ایک لڑکی کا سراغ لگایا، لیکن ہر طرف ہلچل اور کنفیوژن پھیل گئی۔ وہ غصے میں آ گئے۔ ''ڈی سی کہاں ہے؟'' وہ چلّائے، ''لوگ یہاں کیوں جمع ہیں؟'' سر، صرف لڑکی کی وجہ سے، کیا ایک لڑکی کے تحفظ کے لیے اتنے سارے لوگوں کی ضرورت تھی؟ ''لڑکی کہاں ہے؟ کیا اسے یہاں لایا گیا ہے؟'' پولیس لڑکی کو لے آئی۔ اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں یہاں کھڑی تھی اور وہ میرے ساتھ کھڑے تھے۔ لڑکی چیخی: ''کون مجھے لینے آیا ہے؟ یہ حرامی عورت، کیا یہ عورت مجھے لے جانے کے لیے آئی ہے؟ میں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے اپنے پاؤں سے جوتا اُتار کر ہاتھ میں پکڑا اور اسے میری طرف دیکھ کر ہلانے لگی۔ ''اوہ، اوہ'' وزیراعظم کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ انھوں نے حکم دیا: اس لڑکی کو جیل بھجوا دو اور اس کے ساتھ آنے والے پولیس اہل کاروں کو فوری برطرف کر دیا جائے۔ یہ میرا حکم ہے۔ ایس پی کا تبادلہ کر دیا جائے۔ پھر انھوں نے پلیٹ فارم پر تقریر کی۔ انھوں نے کہا: مجھے ان ہندو ورکروں پر فخر ہے، یہ ایک (میری طرف اشارہ) لڑکی انڈیا کی نمائندگی کر

رہی ہے اور تم تمام پولیس اہل کاروں اور افسروں نے یہاں آنا ضروری سمجھا، اس عورت کو دیکھیں! یہ کس طرح شیر جیسے ڈٹی ہوئی ہے۔ کسی حفاظت کے بغیر... مجھے تمھیں دیکھ کر شرم آ رہی ہے۔ تمھارا کیا بنے گا؟ تم ترقی کر کے کسی مقام پر کیسے پہنچو گے؟ اپنی ڈیوٹی کرنے کے بجائے تم نے میرے سامنے اس عورت کو جوتا اٹھانے کیسے دیا۔ اسے ہتھکڑی پہنا کر ایک ڈبے میں بند کر دو اور اس کے ساتھی بدمعاشوں کو دوسرے ڈبے میں۔ انھوں نے پولیس اہل کاروں کو برطرف کر دیا۔ ایس پی کا تبادلہ کر دیا۔ بعض دیگر افسر بھی تبدیل کیے۔ پھر انھوں نے میری پشت پر تھپکی دی اور مجھے اپنے سامنے نشست پر بٹھا لیا، اور کہا مجھے تم پر بہت زیادہ فخر ہے۔ نہ صرف تم پر بلکہ انڈیا پر بھی۔ انھوں نے کہا: یہ بہت حیران کن بات ہے کہ تمھیں اس قسم کے حالات کا سامنا ہے، حالانکہ تم بہت کمزور سی لگتی ہو۔ ہم نے پورے پندرہ منٹ تک گفتگو کی۔ پھر ٹرین چلی گئی اور تمام لوگ بھی... وہ بہت حیران تھے... میرے بچے، میں وہاں کھڑی رہی۔ انھوں نے ایس پی، ڈی سی اور دیگر کو بہت بُرا بھلا کہا۔ مجھے بہت شرم آ رہی تھی۔ میں بہ مشکل آنکھیں اُٹھا سکی۔ وہ کہتے رہے: اسے تبدیل کر دو، یہ باعث شرم ہے۔ جب میں واپس آئی تو ان میں سے ایک میرے پاس آیا اور بولا: مجھے اُمید ہے اب تمھاری تسلی ہو گئی ہو گی۔ تمھارا کلیجہ تو ٹھنڈا پڑ گیا، لیکن جن بے چاروں کا تبادلہ ہوا ہے تم نے سوچا ان کا اور ان کے بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تمھیں کیا کہیں گے؟ اپنے بارے میں سوچو، کیا تم اس طرح زندہ رہ سکو گی۔ میں نے سوچا یہ واقعی ایک مسئلہ ہے۔ وہ تو یہ کہہ کر دفعان ہو گیا لیکن مجھے اس صورت حال سے دھچکا لگا اور اس نے کہا: آج ان برطرف ہونے والے اہل کاروں کے گھروں میں ہر چیز اُداس اور خاموش ہے۔ کوئی چیز نہیں پکائی گئی، بچے بھوکے ہیں اور ہر کوئی انڈیا سے آئی اس عورت کے بارے میں سوچ کر حیران ہو رہا ہے جو بھی آتا ہے وہ اس پر حاوی آ جاتی، ہر کسی پر، ہمارے نزدیک یہ کوئی بلا تھی۔ میں نے پوچھا: کیا وہ سب کے سب برطرف کر دیے گئے ہیں؟ تو اور کیا، اس نے کہا اور تم نے کیا سوچا۔ ان گھروں میں کیا ہوا جہاں کھانے کو کچھ نہیں پکا، نوکری ختم ہونے کے بعد ان گھروں میں کمانے والا اب کوئی باقی نہیں رہا۔ تمھارا خیال ہے وہ تمھیں دعائیں دیں گے؟ بددعاؤں کے سوا تمھیں وہاں سے اور کیا ملے گا؟ میں نے کہا، لیکن میرا کیا قصور

ہے؟ اس نے کہا، بہرحال ذمہ دار تم ہی ہو۔ تم نے ہی شکایتیں کیں اور انہی شکایتوں پر کارروائی کی گئی۔ پھر میں ایس پی کی طرف گئی اور کہا، آپ اس حوالے سے انکوائری کیوں نہیں کرتے؟... اوہ معلوم نہیں اسے اب کیا کہتے ہیں؟ ہاں، میں نے کہا، پلیز انھیں صرف معطل کر دیں۔ آپ کو انھیں ڈسمس کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا میں وزیر کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ پھر میں ڈی سی کے پاس گئی اور اس کے سامنے جا کر رو پڑی اور کہا کہ ایسا نہ کریں لیکن وہ تو اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا اور اس نے کہا، مسز سہگل، آپ نے دیکھا وزیر صاحب کتنے غصے میں تھے، میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے کہا، ہاں میں نے دیکھا تھا، لیکن ایسا کیوں ہو سکتا ہے، میرے لیے کچھ کھانا تک مشکل ہو گیا۔ میں نے کہا کہ آپ میری وزیر سے بات کا بندوبست کر سکتے ہیں؟ اس نے کہا، ہاں، میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں میں فون ملا دیتا ہوں، آپ بات کر لیں، شاید کوئی حل نکل آئے، تاہم گفتگو صرف آپ کو کرنا ہو گی۔ پھر اس نے ٹیلی فون ملایا اور میں نے بات سننے پر ڈی سی کا شکریہ ادا کیا اور پھر وزیر سے کہا کہ مجھے برطرفی کے احکامات پر افسوس ہے۔ یہ حکم بدقسمتی کے مترادف ہے۔ اس نے کہا کہ وہ تو اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ میں نے کہا: جی ہاں صاحب لیکن آپ غور کریں ناں کہ ایسی صورت حال میں جب ہر طرف کنفیوژن ہے، ہر کوئی اپنا فرض سمجھتا ہے کہ پاکستان کا کس طریقے سے تحفظ کیا جائے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ لڑکی کو بازیاب کرنا میرا فرض ہے، اس لیے مجھے یہ سب کچھ بہت بُرا لگا۔ انھوں نے کہا: کیا تم واقعی یہ چاہتی ہو؟ میں نے کہا، جی ہاں، تو وہ بولے: آل رائٹ، پھر انھوں نے ایس پی سے کہا کہ فی الحال کسی کے خلاف کوئی ایکشن نہ لیا جائے۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ لڑکی کہاں گئی... اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ لیکن سٹیشن پر میں نے اسے کہا تھا کہ تمھارے بھائی وہاں کھڑے ہیں اور اس نے مجھے گالیاں دیتے ہوئے کہا: حرامی عورت مجھے بھائی سے کیا تعلق، اور تمھارا کیا کام ہے؟

اس وقت کی صوت حال بہت ڈراؤنی تھی۔ تم تصور کرو اگر ایک ہتھکڑی پہنے عورت لائی جائے، اس کے ساتھ ساتھ پولیس ہو، اسے حاکم وقت کے سامنے پیش کیا جائے... بھائی بھی پاس ہوں، لیکن وہ اپنا تمام قہر مجھ پر اُتار رہی تھی... کہ یہی وہ

عورت ہے جس نے مجھے پکڑا اور یہاں لے آئی۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔

نہیں، مجھے تو یہ تک معلوم نہیں، اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ منسٹر نے اس کے مستقبل کا کیا فیصلہ کیا، بہرحال وہ اسے مجھ سے دور لے گئے۔ ممکن ہے اسے انڈیا واپس بھیج دیا گیا ہو یا کچھ بھی، مجھے معلوم نہیں، مجھے بتایا گیا کہ گجرات میں کیمپ قائم کیے گئے تھے، مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ وہاں ایک نواب ہے جس نے باپ کی جگہ تخت نشین ہونا تھا اور اغوا ہونے والی عورتوں کو اس کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، جس میں سے حسین ترین خواتین کا وہ انتخاب کرے گا۔ جو کم عمر ہوں گی اس کے پاس رہیں گی اور زیادہ عمر والیوں کو دوسرے لوگوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مغوی لڑکیاں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ کوئی احتجاج نہیں کر سکتی تھیں۔ کچھ بھی نہیں، وہ صرف یہ کہتا، فلاں فلاں کو کیٹیگری نمبر ایک میں رکھو، فلاں کو کیٹیگری نمبر 2 میں شامل کر دو اور جو بڑھیا مال ہے اسے زنانے میں بھیج دیا جائے۔ پھر میں نے سنا کہ دو ہندو لڑکے بھی لائے گئے جن کے ماں باپ مارے جا چکے تھے۔ میں یہ سن کر ان کے پاس گئی اور کہا لڑکے میرے حوالے کر دو۔ انھوں نے کہا، نہیں لڑکے ہم واپس نہیں کریں گے۔ میں نے کہا، آخر کیوں؟ تمھاری اپنی فیملی موجود ہے۔ اس کی بیوی بولی، ہاں میرے اپنے تین بیٹے ہیں۔ پھر تم لوگوں نے انھیں کیوں رکھا ہوا ہے؟ اس نے کہا: اس کے پیچھے ایک وجہ موجود ہے، ہم ہر کسی کو نہیں اُٹھوا لیتے، اور کچرا اپنے پاس نہیں رکھتے، ہم انھیں چُنتے ہیں جنھیں پاس رکھنا ہو اور جو اس کے قابل ہوں۔ اب یہ لڑکے میرے بیٹوں کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ دونوں کو ٹیوشن بھی دی جا رہی ہے۔ پھر میں انھیں تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیج دوں گی کیوں کہ میرے پاس پیسہ ہے۔ یہ لڑکے اتنے ذہین ہیں کہ میرے بچوں پر بھی اس کا اثر ہو گا۔ اور جب ان کی شادی ہو گی، ان لڑکوں کی شادی، تو ان کی اولادیں ذہین ہوں گی۔ ہمیں صرف ایک افسوس ہے کہ ہندو اس ملک سے چلے گئے ہیں۔ ان کا پیار سرحد کے اس طرف چلا گیا ہے۔ ہم اسے یہاں واپس لا کر بڑھانا (ضرب دینا) چاہتے ہیں۔ ان بچوں کے بچے... ان کی تربیت ایک اچھے مسلمان کی طرح کی جا رہی ہے۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کیا ہو رہا تھا۔ دن رات میں لڑکیوں کی بازیابی کے کام میں جُتی ہوئی تھی اور میرے حوالے ہونے کے بعد ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی

میری تھی۔ میں بہت مصروف اور اُلجھی تھی... لیکن 'تم جانو' پنجاب میں ایک جگہ تھی، وہاں کوئی ادارہ وغیرہ بنا کر مولویوں نے مغوی لڑکیوں کی برین واشنگ شروع کر رکھی تھی کہ دیکھو انڈیا میں سکھ اور ہندو اب تمھیں قبول نہیں کریں گے، کیوں کہ تم مسلمانوں کے ساتھ رہتی رہی ہو، یا یہ کہ تمھارے رشتہ دار تمھیں یہاں سے تو لے جائیں گے لیکن وہ تمھیں بارڈر پر لے جا کر قتل کر دیں گے۔ وہ یہ بھی کہتے کہ انڈیا میں حالات اتنے بدتر ہیں کہ تم لوگوں کو پانی کا گلاس بھی ایک روپیہ میں ملے گا۔ جو لوگ وہاں چلے گئے وہ بھوکوں مر رہے ہیں۔ بہرحال مولوی ان لڑکیوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہر قسم کے ڈرامے کر رہے تھے۔ پھر وہ انھیں نماز پڑھاتے تا کہ وہ باقاعدہ مذہب تبدیل کر لیں۔ پھر ان میں سے کوئی ان کو آ کر کہتا کہ فلاں فلاں لڑکی کا باپ اس سے ملنے آیا ہے۔ وہ اس لڑکی کو چھت سے نیچے کھڑے فرضی لوگ دکھاتے اور کہتے تمھارے رشتہ دار آ گئے ہیں۔ اب تم ان کے ساتھ جا سکتی ہو۔ پھر لڑکی کو آزاد کر دیا جاتا۔ 10 دن یا بعد میں لڑکی واپس آ جاتی۔ روتے پیٹتے، وہ کہتی کہ وہ بڑی مشکل سے کھیتوں میں سے بھاگ کر آئی ہے اور اس نے بہ مشکل سکھوں سے جان بچائی، وغیرہ وغیرہ۔ وہ مسلمان لڑکیوں کو ہندو لڑکیوں سے گھلا ملا دیتے۔ بہرحال اگر 200 ہندو لڑکیوں کے ساتھ چند مسلمان لڑکیاں بٹھا دی جائیں تو یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ کون کس مذہب کی ہے۔ پھر چند لڑکیاں آ کر جھوٹی موٹی کہانیاں سناتیں کہ ہندو اور سکھ کتنے بُرے ہیں... ہم نے انھیں تمام جگہوں سے ڈھونڈا تھا اور ہم ان سے واقف نہیں تھے، لہٰذا کون جانتا تھا کون کیا ہے؟ وہ انھیں چھوڑ دیتے اور وہ دوبارہ واپس آ جاتیں اور یہ کہانیاں سناتیں جس سے دوسری لڑکیاں کانپنے لگتیں۔ اصل میں جب وہ انھیں پکڑتے تو مردوں عورتوں کو الگ کر دیتے، معلوم نہیں مردوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا، لیکن گمان ہے کہ انھیں قتل کر دیا جاتا۔ لڑکیوں کو وہ ساتھ لے جاتے اور وہاں بوڑھی عورتیں... انھیں وہ الگ کر دیتے۔ میری جیسی عورتیں، ان سے بھلا انھیں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ لیکن وہ اس سے آگاہ تھے، وہ ان کے بیٹے قتل کر کے خود ان کے بیٹے بن بیٹھتے۔ وہ کہتے، اماں مجھے اپنا بیٹا سمجھو۔ پھر وہ ان کی جائدادوں پر قبضہ کر لیتے۔ اگر ان عورتوں کو انڈیا جانے دیا جاتا تو انھیں یا ان کے خاندانوں کو وہاں جائداد کا متبادل مل جاتا یا پھر جائداد قرق کر لی جاتی۔ اس لیے

انھوں نے انھیں اپنے پاس رکھا۔ لہٰذا یہ انتہائی سوچا سمجھا منصوبہ تھا... ان کے پاس جرأت اور قوت تھی، اس لیے انھوں نے ایسا کیا، دوسری طرف ہندوؤں کو لے لو، اگر انھیں سُرخ کپڑے کا ٹکڑا دکھا دیا جائے، یا اگر سڑک پر خون نظر آ جائے تو وہ سڑک چھوڑ کر وہاں سے بھاگ جائیں گے۔ وہ کہتے ہمیں معلوم نہیں کس کس کو قتل کیا جا چکا ہے اور کس نے قتل کیا۔ ہم عقل مند اور ذہین ہیں اور وہ جسمانی لحاظ سے مضبوط... مسلمانوں کے دماغ گرم اور ہمارے دماغ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں نہ جانے میں نے کتنی عورتوں کو بازیاب کرایا۔ لیکن وہ سینکڑوں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں گی۔ ایک بھی کیس ایسا نہیں جس میں مَیں ذاتی طور پر ملوث نہ ہوئی ہوں۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی ورکر یہ کہہ سکتی ہے کہ اسے محض ایک کیس سے واسطہ پڑا۔ ان سب لڑکیوں کو ہم نے خود ڈھونڈا اور کئی ہمارے پاس لائی گئیں۔ ہم نے ان کی وصولی کی رسیدیں دیں۔ وہ ہمارے پاس لاتے تھے اور ہمارا معمول تھا کہ رسیدیں جاری کر دیتے۔ ایسے تقریباً پندرہ، بیس کیس تھے، میں مختلف کیسوں کا پتہ چلانے کے لیے خود جاتی تھی۔

☆☆☆

''میرے پاس کوئی عورت نہیں۔'' اس فقرے میں اس سے زیادہ سچ موجود ہے جتنا کہ کئی عورتوں کو ادراک ہوا: کئی عورتوں نے خود کو ''بازیاب'' کرانے کی اجازت دے دی تھی تاہم بعض کو بزورِ قوت ''برآمد'' کیا گیا، لیکن اس اقدام کے دوران میں ایک اور حادثے کا سامنا کرنا پڑا۔ ان فیملیوں نے جنھوں نے حکومت کو اپنی گم شدہ عورتوں کی بازیابی کے لیے درخواستیں دی تھیں تو اب ان خواتین کی واپسی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ 1948ء کی ابتدا میں پارٹیشن کونسل کے 16ویں اجلاس میں فیصلہ کیا تھا کہ دونوں حکومتوں کو اپنی حدود میں مہاجرین کی ذمہ داری لے لینی چاہیے اور کسی مہاجر کو زبردستی اس وقت تک اس کے اپنے علاقے میں نہیں بھیجا جائے گا جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ امن عامہ مکمل طور پر بحال ہو چکا ہے اور ریاست اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ تاہم عورتوں کے حوالے سے کہا گیا:

> وزارت بحالیات نے ریڈ کراس کی مشاورت سے فیکٹ فائنڈنگ برانچ قائم کی ہے، جس میں مغوی عورتوں کی بازیابی اور انکوائری کے لیے ایک کمیٹی

کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ پاکستان کو اس ضمن میں پہلے ہی 23 ہزار ناموں کی فہرست دی جا چکی ہے۔ اغوا شدہ عورتوں کی برآمدگی کے لیے فی الوقت حکومت سماجی کارکنوں اور ممتاز شخصیات کی سرگرم معاونت پر انحصار کر رہی ہے۔ دونوں حکومتوں کے نمائندوں کا ایک اجلاس 6 دسمبر کو لاہور میں ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مغوی خواتین کی برآمدگی کے لیے خصوصی کوششیں کی جانی چاہئیں۔ اب تک پاکستان سے مغوی خواتین کی 25 ہزار انکوائری موصول ہو چکی ہیں... جب کہ تقریباً 2500 کو پہلے ہی بازیاب کرایا جا چکا ہے۔ آج ہماری امدادی پارٹیوں کو جس بڑی دُشواری کا سامنا ہے وہ مغوی ہندو عورتوں کی بڑی تعداد کا یہ خوف ہے کہ انھیں معاشرے میں دوبارہ قبول نہیں کیا جائے گا اور مسلمان بھی ان کی اس غلط فہمی سے آگاہ ہیں۔ انھوں نے ان بدقسمت عورتوں کے ذہن پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ وہ عورتیں اغوا کرنے والوں کو چھوڑ کر انڈیا واپس جانے سے گریزاں ہیں۔ فریقین نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ ایسے کیسوں میں مغوی عورتوں کو زبردستی نکال دیا جائے۔[1]

خواتین کا زبردستی ایک ملک سے اخراج ایک علیحدہ چیز تھی جب کہ ان کی اپنے خاندانوں میں قبولیت دوسرا معاملہ تھا۔ یہ ہچکچاہٹ اتنی زیادہ تھی کہ گاندھی اور نہرو کو بار بار اپیل کرنا پڑی کہ اغوا شدہ عورتیں بدستور ''پاک باز'' ہیں۔ گاندھی نے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ عورتوں کو یہ اعتراض ہے کہ ہندو انھیں قبول کرنے کو تیار نہیں، کیوں کہ ان کا کہنا ہے ایسی عورتیں ناپاک ہو چکی ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک انتہائی شرم ناک بات ہے۔ یہ عورتیں ایسی ہی پوتر ہیں جیسے یہ کنواری لڑکیاں جو میرے ساتھ بیٹھی ہیں، اور اگر بازیاب ہونے والی کوئی عورت میرے پاس آئے تو میں اسے ویسی ہی عزت و احترام دوں گا جیسی میں ان لڑکیوں کو دیتا ہوں۔''[2]

بعد ازاں 1948 کے اوائل میں نہرو نے عوام سے اپیل میں کہا:

1: پارٹیشن کونسل کا 16واں اجلاس، 1948ء

2: Selected Works of Jawaharlal Nehru سے اقتباس، جلد: ۵، دہلی۔ جواہر لال نہرو فنڈ 1987، صفحہ 113۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ ان عورتوں کے رشتہ دار انھیں گھر واپس قبول کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ انتہائی قابل اعتراض اور غلط رویہ ہے اور اس رویے کی حمایت کے حوالے سے غلط رجحان قابل مذمت ہے۔ لڑکیاں اور عورتیں ہماری محبت اور ہمدردی کی طلب گار ہیں، ان کے رشتہ داروں کو انھیں واپس لیتے ہوئے فخر محسوس کرنا چاہیے۔[1]

اس بات کی آگاہی کے لیے بڑی تعداد میں پمفلٹ شائع کر کے تقسیم کیے گئے، جن میں قدیم ہندو دیومالا میں راون کے ہاتھوں سیتا کے اغوا کی داستان کا حوالہ دیا گیا اور بتایا گیا کہ وہ شوہر سے دور ہو کر بھی کیسے پاک باز رہی۔ تمام پہلوؤں سے بھارت میں ہندوؤں اور سکھوں کے نزدیک پاک بازی کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہندو مذہب عبادت اور ناپاکی کے معاملے میں کافی سخت ہے۔ بظاہر مغوی مسلمان خواتین کو پاکستان میں ان کے خاندانوں میں نسبتاً آسانی سے قبول کیا گیا، آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن (اپوا) اور دیگر تنظیموں نے ایسا کرنے والی لڑکیوں کی شادی کے لیے زبردست بھاگ دوڑ کی۔ ہندوؤں میں کسی عورت کی پاک بازی کو اسی صورت میں قبول کیا جا سکتا ہے جب وہ اکیلی ہو، لیکن اگر اس کے ساتھ بچے ہوں تو پھر نوعیت بالکل بدل جاتی ہے۔ ملاوٹ والے خون سے پہلے ہونے والے بچے کو خاتون کی بے حرمتی کی مستقل علامت سمجھا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس عورت نے دوسرے مذہب کے مرد کے ساتھ ہم بستری کی تھی، لہٰذا عورتوں کے لیے شرط رکھی جاتی کہ اگر بچوں کے ساتھ رہنا ہے تو تمام عمر آشرم میں رہنا پڑے گا، یا پھر انھیں چھوڑ دو (ایسے بچوں کو یتیم خانوں میں بھیج دیا جاتا) اور پرانے رشتہ داروں کے پاس چلی جاؤ۔ یہاں ایک اور مشکل کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ کئی عورتیں حاملہ تھیں۔ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ سماجی کارکنوں نے تصدیق کی ہے کہ حاملہ عورتوں کو زچگی کے لیے مخصوص مقامات پر بھیج دیا جاتا۔ (اکثر ایسے بچوں کو کسی اور کو متبنّٰی بنانے کی پیش کش

---

1. Stern Reckoning: A Survey of the Events Leading up to and Following the partition of India سے اقتباس۔ مصنف جی ڈی کھوسلہ، دہلی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس دہلی: 1949، صفحہ 75۔

کی جاتی) یا پھر انھیں پیٹ کا صفایا کرانے کے لیے بھیجا جاتا۔ حکومت نے بڑے پیمانے پر اسقاطِ حمل کے لیے رقوم فراہم کیں۔ یہ کام اس وقت کیا گیا جب اسقاطِ حمل کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا، اور شاید اس کاروبار کے ذریعے کئی ہسپتالوں کی قسمت کھل گئی۔ دمینتی سہگل نے بتایا:

> گاندھی ونیتا جالندھر کیمپ میں کئی شادیاں ہوئیں کیوں کہ وہاں آنے والی کئی لڑکیاں غیر شادی شدہ تھیں۔ کم عمر لڑکیاں وہاں آتیں جہاں انھیں تربیت دی جاتی۔ چونکہ لوگ جانتے تھے کہ کیمپ میں کئی لڑکیاں ہیں اس لیے شادیوں کی متعدد پیش کشیں موصول ہوتیں۔ ہمارا معمول تھا کہ ان کے لیے ملازمتیں تلاش کرتیں، یا انھیں واپس ان کے رشتہ داروں کو پہنچانے کا بندوبست کیا جاتا...
>
> جہاں کہیں لڑکیوں کے پاس کسی مسلمان کے بچے ہوتے، ان کے خاندان انھیں واپس قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے، لیکن عورت کے لیے اپنی کوکھ میں بچے کی موجودگی کے بعد اس سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہوتا ہے... لیکن کئی عورتوں پر بچے سے چھٹکارا پانے کے لیے محض اس لیے دباؤ ڈالا گیا کیوں کہ وہ کسی مسلمان کا خون تھا۔ تمھیں تو پتہ ہے ناں! ہمارا معاشرہ کس طرح کا ہے۔ ایسے بچے کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ اکثر عورتیں سال کے اندر اندر ٹھیک ہو گئیں۔ اور ان کے خاندانوں نے انھیں قبول کر لیا، لیکن جو عورتیں حاملہ ہو جاتیں، تمھیں بتاؤں! ڈاکٹر کپور کے کلینک میں ان کا اسقاطِ حمل کیا جاتا یا زچگی کی سہولت فراہم کی جاتی اور پیدا ہونے والے بچوں کے ساتھ اس طرح کا عمل مشکل ہوتا اور جب عورتیں اپنے بچے احمد آباد چھوڑ دیتیں وہ ان سے ملنے کی متمنی رہتیں۔ انھیں وہاں ایک چوائس دی جاتی—— وہ اپنے بچے اپنے ساتھ رکھ سکتی تھیں—— اگر ان کے اہل خانہ انھیں اس کی اجازت دیں۔ شرط یہ تھی کہ بچے کو پورے وقار کے ساتھ قبول کیا جائے اور اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جائے۔ بہ صورت دیگر بچوں کو وہیں رہنے دیا جائے۔ یہ واقعی ایک مسئلہ تھا۔ ہر کیس

مختلف نوعیت کا تھا، مائیں الہ آباد جاتی تھیں، وہ ہم سے کچھ مہلت مانگتیں اور وہاں چلی جاتیں، وہ وہاں کیا کرتیں اس کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ وہ کیا محسوس کرتیں... ہم انھیں کرایہ دیتے اور کہتے جاؤ، بچوں سے مل آو، بچوں کا مستقبل کیا ہوا تھا... کس کو خبر ہے؟

شمالی بھارت کے شہروں امرت سر، جالندھر، کرنال اور دہلی میں مغوی عورتوں کی رہائش کے لیے آشرم کھولے گئے۔ اکثر کو اس وقت تک عارضی بُنیادوں پر وہاں رکھا جاتا، جب تک ان کے خاندان انھیں واپس قبول نہ کر لیتے۔ اکثر خاندان والے انھیں قبول نہ کرتے۔ یہ عورتیں اب ان کے نزدیک کلنک کا ٹیکہ تھیں۔ خاندانوں نے ان کی عدم موجودگی کو قبول کر لیا تھا۔ اب بھلا وہ نئے سرے سے ان کو کیسے ایڈجسٹ کرتے۔ ان کے لیے جگہ بناتے اور ایسے فرد کو کیوں قبول کرتے جو پلید ہو چکا ہو؟ اسی طرح ایسی خواتین کے لیے آشرم مستقل گھر بن گئے، جہاں اپنی یادوں کے ساتھ وہ زندگی بسر کرتیں۔ کچھ تو اپنی زبان بند رکھتیں اور بعض اپنی طرح کی عورتوں کو اپنے دُکھ درد میں شریک کر لیتیں۔ اور وہاں کئی خواتین مر بھی گئیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں تقسیم کے باعث دو گھروں سے نکلنا پڑا۔ کرنال میں 1997ء تک بعض ایسی خواتین آشرم میں موجود تھیں، جب کہ جالندھر کے گاندھی ونیتا آشرم میں آج بھی متاثرہ عورتیں موجود ہیں۔ کئی وہ ہیں جن کی تاریخ ہمیشہ کے لیے چھپی رہے گی، اور کئی ایسی ہیں جن کو خود اپنی تاریخ کا پتہ نہیں۔ جالندھر کے آشرم میں ایک عورت اس وقت لائی گئی تھی جب اس کی عمر محض چند ماہ تھی، کوئی نہیں جانتا اس کا تعلق کس کمیونٹی سے ہے، کسی کو اس کی حقیقت کا پتہ نہیں، تاریخ کا ایک بچہ جس کی اپنی کوئی ہسٹری نہیں۔ جالندھر میں گاندھی ونیتا آشرم اب بے سہارا عورتوں اور بیواؤں کا مسکن ہے۔ ایک سوشل ورکر نے بتایا کہ ''ہم نے آشرم کھولنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے ہر طرف موزوں جگہ تلاش کی گئی۔ آخر اس جگہ کا انتخاب کر لیا گیا۔ اصل میں یہاں مسلمانوں کا قبرستان تھا۔ اس طرح ہم نے مُردوں کی ہڈیوں پر متاثرہ خواتین کی زندگی کی بُنیاد رکھی۔'' ایسا شاید اس لیے ممکن ہوا کہ تقسیم کا دور بے دخلی اور تبدیلی کا وقت تھا اور حکومت نے جگہ کے کلیم کی درخواست منظور کر لی۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ہر کوئی اپنی زندگی کی فکر میں تھا اور کسی کے پاس سوال کرنے کا وقت

نہیں تھا۔ لیکن آشرم میں ان عورتوں کی زندگی کیا بنی ہوگی جنھیں ان کے خاندانوں نے مسترد کر دیا تھا۔ یہ وہ نکتہ ہے جس کی حقیقت معلوم ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

مغوی عورتوں کی بازیابی کا آپریشن تقسیم کے 9 سال بعد تک جاری رہا۔ اگرچہ ابتدائی برسوں کے بعد بازیابی کی تعداد بتدریج کم ہوتی چلی گئی، مجموعی طور پر 30 ہزار مسلمان جب کہ باقی ماندہ 8 ہزار خواتین (ہندو، سکھ) کو پاکستان سے چھڑایا گیا۔ ان میں سے کئی کی رپورٹ حکومت کو نہیں کرائی گئی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، بازیابی کا عمل مشکل تر ہو گیا۔ برآمدگی کے عمل میں سب سے بڑی رُکاوٹ خواتین کی طرف سے بچوں کو چھوڑنے میں جھجک تھی۔ اس دوران ممتاز سوشل ورکروں کے درمیان اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ مثال کے طور پر رمیشوری نہرو چاہتی تھیں کہ بازیابی کا پروگرام روک دیا جائے جب کہ مردولا سارا بھائی اس کے جاری رکھنے کے حق میں تھیں۔ 1954ء میں ایک خصوصی کانفرنس ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ اس بات کا بندوبست کیا جائے کہ مغوی افراد کو بہ زور واپس بھیجنے کا عمل روک دیا جائے۔ اس کے بعد خصوصی آشیانے تعمیر کیے گئے جہاں گومگو کا شکار افراد کو رہنے اور دباؤ کے بغیر سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا موقع دیا جاتا۔ اس عورت کو کہاں تک آزادانہ چوائس کا موقع ملا، یہ ایک اور سوال ہے۔

دمینتی سہگل

جالندھر میں ایک سال گزارنے کے بعد میں ہوشیار پور کیمپ چلی گئی۔ یہ ایک بڑا کیمپ تھا، جہاں بازیاب کرائی گئی 1500 خواتین قیام پذیر تھیں۔ ان میں وہ عورتیں شامل تھیں جنھیں ان کے خاندان والوں نے قتل کرنے کی کوشش کی... ہمارے عملے میں 45 ارکان شامل تھے اور میں وہاں بہت مصروف ہو گئی۔ ہمیں ان عورتوں کی بحالی کا کام کرنا تھا۔ وہ کیمپ ہی دراصل بحالی کیمپ تھا، جہاں ہمیں متاثرہ عورتوں کی ذہنی، جسمانی اور مالی بحالی کا کام کرنا تھا۔ یہ وہ فرض تھا جس کی ہم سے توقع کی جا رہی تھی۔ ہم میں سے کتنوں نے یہ کام دل سے کیا، یہ الگ داستان ہے۔

ایسے کیمپ حکومت نے قائم کیے تھے۔ ایسی عورتیں جو بے سہارا یا اکیلی تھیں، کو وہاں رکھا گیا۔ ہوشیار پور میں بڑا کیمپ تھا۔ اس کے بعد جالندھر کیمپ کا نمبر آتا تھا۔

ایک کرنال میں تھا۔ اور بھی کئی شہروں میں کیمپ تھے۔ کیمپ کھولے گئے اور میرے جیسی عورتوں کو ان کا انچارج مقرر کر دیا گیا اور ہم نے کیسا کام کیا اس کا انحصار متعلقہ ورکر پر تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کام کا تجربہ نہیں رکھتا تھا جب کہ ہم میں سے کئی تعلیم یافتہ بھی نہیں تھیں۔ حکومت چاہتی تھی، ان خواتین کو ہر لحاظ سے بحال کیا جائے ـــــ ہماری ڈیوٹی تھی کہ ہم ان کا دُکھ درد بھلانے میں ان کی مدد کریں۔ ان کی رگوں میں نئی روح پھونک دیں اور انھیں معاشی طور پر خود انحصار بنائیں۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی۔ ذہنی طور پر ایڈجسٹ ہونے میں عرصہ لگتا ہے، تاہم معاشی بحالی نسبتاً آسان کام ہے۔ حکومت نے ہمیں صنعتی مراکز دیے جہاں ہوزری، ٹیلرنگ، ٹوکریاں بنانے، کڑھائی، بُنائی اور سپننگ کا کام ہوتا تھا۔ جب میں پاکستان سے واپس آئی تو جالندھر کے بعد ہوشیار پور جانے سے پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ بہت ہو چکا، میں اب اور کچھ نہیں کروں گی۔

لیکن مسز نہرو میرے کام کے حوالے سے کافی مطمئن تھیں اور انھوں نے اصرار کیا کہ آنٹی پریمی اور مجھے کام جاری رکھنا چاہیے۔ پہلے ہم نے عورتوں کی بازیابیاں کی تھیں۔ اگلے مرحلے میں ہمیں ان کی بحالی کا کام کرنا تھا۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ حکومت نے ہوشیار پور میں ایک کیمپ کھولا ہے لیکن اس کی کمانڈنٹ کی کارکردگی اچھی نہیں۔ اس کے بارے میں غلط رپورٹیں آ رہی ہیں ـــــ اس طرح مسز نہرو مجھے وہاں کا انچارج بنانا چاہتی تھیں۔ میں کہتی رہی کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن ماسی نے مجھے اس کی اجازت نہ دی۔ پھر ایک روز لیڈی ماؤنٹ بیٹن آئیں، انھیں ہوشیار پور کا دورہ کرانا تھا۔ لہٰذا میں نے سوچ لیا کہ مجھے جانا چاہیے ـــــ کیوں کہ مجھے مفت سواری کی سہولت مل رہی تھی، میں چلی گئی۔ انھوں نے مہمانوں کے لیے بہت بندوبست کر رکھا تھا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے پہلے سپننگ کے شعبے میں مصروف عورتوں کو دیکھا، انھوں نے دورہ کرنے والے وفد کو بتایا کہ یہ خواتین بہت کمائی کر رہی ہیں۔ انھیں یومیہ 10 روپے معاوضہ دیا جا رہا ہے۔ پھر ہم کپڑے سینے والے سیکشن میں گئے۔ وہاں بھی یہی کچھ کہا گیا۔ کڑھائی کرنے والی عورتوں کے الفاظ بھی یہی تھے... مجھے حیرت ہوئی، سپننگ کے کام سے اتنی رقم نہیں مل سکتی تھی اگر 10 روپے یومیہ معاوضہ تھا تو اس کا مطلب تھا 300 روپے ماہانہ۔ میں نے غور کیا اور واپس آ کر ماسی کو بتایا۔ وہ بولیں تم

احمق ہو، تمھیں وہاں چلے جانا چاہیے۔ وہ بہت مضبوط خاتون تھیں، زندگی سے بھرپور، توانا، کیا زبردست شخصیت کی مالک تھیں۔ انھوں نے کہا: مجھے یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال انھوں نے اصرار کیا کہ میں وہاں چلی جاؤں۔ آنٹی پریمی نے کہا کہ میں ان کے ساتھ چلوں کیوں کہ انھیں وہاں معائنے کے لیے جانا تھا۔ وہاں جا کر انھوں نے کہا، تم یہاں رہ کیوں نہیں جاتیں۔ میں کل آ کر تمھیں لے جاؤں گی، وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں اور بولیں کہ میں چند روز میں واپس آ کر تمھیں لے جاؤں گی۔

انھوں نے وہاں لوگوں کو کہا کہ اسے ایک بستر دے دیں اور یہاں رکھ لیں۔ اس طرح اُس دن سے میرا وہاں تقرر ہو گیا۔ اس کے بعد میں کام میں جُت گئی، اور میرے بھگوان نے مجھے اس میں کامیابی دی۔ ایک ماہ بعد جب تمام آمدن کے بل تیار کیے گئے تو دستخط کے لیے میرے پاس لائے گئے۔ میں نے کہا یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ آپ دستخط کر دیں گی تو ورکروں کو ادائیگی ہو جائے گی۔ میں نے کاغذات دیکھے تو انکشاف ہوا کہ کچھ عورتوں کو ماہانہ 5 روپے اور بعض کو 10 روپے معاوضہ مل رہا تھا۔ پہلے میں نے یہ سمجھا کہ یہ ڈیلی رپورٹ ہے، پھر میں نے محسوس کیا—— سپننگ کرنے والی خواتین کو 10 یا 12 روپے، ٹوکریاں تیار کرنے والیوں،... غرضیکہ کسی کو بھی ماہانہ 40 روپے سے زائد معاوضہ نہیں مل رہا تھا۔ میں نے کہا: کیا یہ یومیہ کمائی ہے؟ انھوں نے کہا: جی نہیں، پورے مہینے کا معاوضہ ہے۔ میں نے پوچھا: لیکن جب میں یہاں معائنے کے لیے آئی تھی تو مجھے کچھ اور بتایا گیا تھا۔ انھوں نے کہا وہ تو وِزٹ کرنے والوں کے لیے تھا۔ کیا آپ سوچ سکتی ہیں کہ یہ عورتیں اتنا کما سکتی ہیں؟ مجھے دھچکا لگا۔ میں نے کہا: تم نے اتنا جھوٹ بولا تھا۔ انھوں نے کہا: نہیں جی، وہ دراصل جھوٹ نہیں تھا۔ ہمارا مطلب تھا کہ اگر کوئی شخص دن رات کام کرے تو وہ بہت کچھ کما سکتا ہے۔ 24 گھنٹے کام کر کے۔ وہ تو محض شو تھا۔ ایک اور بات جو میں نے نوٹ کی جب کبھی ہمیں باہر سے سلائی کا کوئی کام دیا جاتا تو کپڑوں کی کٹائی، ٹیکنیشن کرتیں، اور وہی ذمہ دار ہوتیں۔ عورتوں کو اپنے طور پر کچھ کام کرنے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ اگر آپ بہت سارا کپڑا لا کر ان خواتین کے سامنے رکھ دیں تو وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ لہٰذا میں نے کہا کیا تم سمجھتے ہو یہ ٹیکنیشنز ہر جگہ ان عورتوں کے ساتھ ہوں گی، حتیٰ کہ ہوزری کے

شعبے میں بھی تمام ذمہ داری ٹیکنیشنوں کے سپرد تھی۔ اس تمام صورت حال کا بظاہر تاثر بہت جان دار تھا، لیکن حقیقت بالکل مختلف تھی۔ اگر ٹیکنیشنز تھیں تو مشین چلتی تھی، انھیں باہر نکال دیں تو ہر چیز ساکت ہو جائے گی۔ یہ کس قسم کی بحالی تھی؟ جب تک وہ کیمپ میں رہیں گی انھیں کھانے کو راشن ملے گا، اور تھوڑی بہت کمائی ہو گی۔ 10 روپے یا اس کے لگ بھگ، لیکن ایک بار وہ باہر چلی جائیں... تو ان کے پاس کوئی تجربہ نہیں۔ وہ ہوزری کا کام نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کے پاس کوئی مشین نہیں تھی۔ اگر کوئی بے چاری مشین خرید بھی لے تو وہ کسی ٹیکنیشن کے بغیر کیسے کام کر سکتی تھی؟ اگر وہ گھر پر دھاگا کاتنے والی مشین یا لوم لگا لیتی تو بھی وہ کیا کر لیتی؟ یہاں اگر دھاگا کہیں پھنس جائے تو ٹیکنیشن مدد کے لیے موجود ہوتا ہے۔ لیکن کسی اور جگہ پر کون ہو گا؟... اس کا مطلب تھا کہ کوئی کوئی مستقبل نہیں، کچھ بھی نہیں۔ حکومت چاہتی تھی کہ متاثرہ عورتیں تین سال میں اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو جائیں اور ہم اس قسم کے سیٹ اَپ میں کر بھی کیا سکتے تھے؟ میں اس صورت حال پر بہت پریشان رہتی تھی۔ میں کئی روز تک سو نہ سکی۔ میں حیران تھی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ چونکہ میں ذرا مذہبی خیالات کی حامل تھی، اس لیے مجھے لگتا تھا جیسے میں کوئی گناہ کر رہی ہوں۔ میں اپنے احساسِ جرم سے نجات حاصل نہ کر سکی۔

میں نے سوچا، میں یہاں اہم عہدے پر فائز ہوں۔ کیمپ کمانڈنٹ ہوں، لوگ مجھے سلام کرنے آتے ہیں، میرے پاس خدمت گار اور ملازمین ہیں، لیکن... میں اصل مسئلے کی طرف دھیان کیوں نہیں دے رہی؟ پھر میں نے دعا کی اور بھگوان سے پوچھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے تعلیم بالغاں شروع کرنے پر غور کا آغاز کیا۔

1947 سے 1948ء تک میں پاکستان میں تھی۔ پھر 1948 میں مَیں ہوشیار پور چلی آئی۔ پھر میں نے اپنا سٹاف تیار کیا اور تعلیم بالغاں کا کام شروع کر دیا۔ میں نے سٹاف سے کہا کہ تمام ان بیواؤں کی فہرست تیار کریں جن کی عمریں 35 یا 40 سال سے کم تھیں۔ مجھے یہ حد ٹھیک سے یاد نہیں۔ میں نے کہا: اس عمر سے زائد والی عورتوں کو چھوڑ دیں۔ ہم نے فہرستیں تیار کر لیں۔ عمر کی اس حد میں کوئی 100 یا 50 خواتین آئی تھیں۔

پھر میں نے سٹاف کی لسٹ تیار کرنے کو کہا اور اس میں ان کی کوالی فی کیشن پوچھی گئی تھی۔ پھر میں نے کہا کہ وہ ملازمین جو میٹرک فیل تھے لیکن اس کے باوجود جن مضامین میں ان کی حالت اچھی تھی ہم نے ایک کالم میں ان مضامین کا اندراج کر لیا۔ اس طرح میں نے ایک فہرست تیار کر لی۔ میں اب اندازہ لگا سکتی تھی کہ کتنے ملازمین ''ہندی'' میں زبردست ہیں، کتنے فلاں مضمون میں اور کتنے فلاں مضمون میں... پھر میں نے کہا: یہاں ہم 8 گھنٹے کام کرتے ہیں، لیکن ہم زیادہ کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکے۔ ہم صبح کے وقت پوجا کرتے ہیں، لیکن ہمارا ملک سخت مسائل سے دوچار ہے اور مثال کے طور پر ہم کوئی عطیہ نہیں دے سکتے کیوں کہ ہمارے پاس دان کرنے کو کچھ نہیں۔ ہاں البتہ ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ اپنے وطن کو وقت دیں۔ ہم کسی سے کوئی پیسہ نہیں مانگ رہے۔ ہاں آپ سے تھوڑا سا وقت مانگ رہی ہیں۔ آپ ہر روز 8 گھنٹے حکومت کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ وقت آپ اس کام کے لیے بھی دے دیں۔ اس طرح فہرست تیار ہو کر آ گئی اور سر فہرست میرا نام تھا۔ اسی وجہ سے سب سے پہلے میں نے آدھ گھنٹا دینے کا اعلان کیا۔ میں اپنے وقت میں سے آدھا گھنٹا دینے کی خواہش مند تھی... پھر کسی اور نے بھی نصف گھنٹا لکھا۔ کسی نے ایک گھنٹا وقت دینے پر رضامندی ظاہر کی۔ اس طرح تمام سٹاف نے وقت کا تعین کر دیا۔ ہم بہت سارے وقت کا عطیہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر ہم نے عورتوں کی فہرست کا جائزہ لیا۔ اور اس کے مطابق سٹاف کی تقسیم کی۔ پتہ چلا کہ ایک سٹاف ممبر کے حصے میں پانچ عورتوں کی ذمہ داری تھی۔ اب ہمارا کام شروع ہونے کے لیے تیار تھا، لیکن اس دوران میں ایک اور مشکل آن پڑی۔ ہمیں کاپیوں اور پنسلوں کی ضرورت تھی۔ حکومت ہر عورت کو ماہانہ 10 روپے الاؤنس دیتی تھی۔ اتنی قلیل رقم میں سے وہ ان چیزوں کا بندوبست کیسے کر سکتی تھیں۔ انھیں کھانا پینا بھی اسی پیسے سے کرنا پڑتا تھا۔ پھر میں نے کہا: اچھا تمھیں جتنی سٹیشنری کی ضرورت ہے مجھ سے لے لو۔ ہم اس کے لیے عورتوں سے پیسے نہیں لے سکتے تھے۔ ان کے پاس تو رقم نہیں تھی۔ ہم حکومت سے بھی کچھ نہیں مانگ سکتے تھے۔ نہ ہی وہ ہمارا مطالبہ تسلیم کرتی۔ لہٰذا میں نے کہا: فکر نہ کرو، بس یہ سب کچھ مجھ سے لے لو۔ پھر میں نے دعا کی۔ میں نے خواتین سے کہا کہ وہ بھی دعا کریں کہ ہماری جدوجہد

کامیاب ہو جائے۔ تمھیں صرف برتن مانجھنا اور گھریلو مشقت نہیں کرنا چاہیے، بلکہ عزت و وقار کی زندگی گزارنا چاہیے... پھر میرے ڈائریکٹر کو پتہ چل گیا۔ شام کو مسز تھاپڑ کو پتہ چلا کہ ہم نے بالغوں کی تعلیم کا پروگرام شروع کیا ہے۔ انھوں نے کہا: سکیم جو کچھ بھی بنائی گئی، مجھے یقین ہے کہ صرف تم ہی اسے شروع کر سکتی ہو۔ یہ خبر ہر طرف پھیل گئی۔ سٹاف اور دیگر عورتیں موجود تھیں۔ جالندھر سے پیغام آیا: میں نے سنا ہے تم تعلیم بالغاں کی کلاسیں شروع کرنے والی ہو، تمھیں شاید علم نہیں کہ تم گورنمنٹ کی ملازم ہو، تم اپنے طور پر کوئی کام نہیں کر سکتیں۔ تمھیں اس کے لیے اجازت لینا پڑے گی۔ میں نے دل میں سوچا، وہ کیا کر سکتے ہیں؟ صرف باتیں! وہ مجھے جان سے تو نہیں مار دیں گے۔ لہٰذا میں نے عورتوں سے کہا: تمھاری کلاسیں کل سے شروع ہوں گی۔ لیکن پھر ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم کلاسیں کس جگہ شروع کریں؟ میں نے فیصلہ کیا کہ آم کے درختوں کے نیچے... پھر میں نے عورتوں سے کہا، ان میں سے کچھ کو تھوڑی بہت ہندی اور پنجابی آتی تھی۔ کچھ تنخواہ لیتے وقت انگوٹھا لگاتی تھیں جب کہ باقی دستخط کر سکتی تھیں۔ میں نے ان ملازمین کے لیے انعام کا اعلان کر دیا جو عورتوں کو زیادہ تیزی سے پڑھائیں گے... یہ تمام مہم بڑی اچھی طرح جاری رہی اور بہت کامیاب ہو گئی۔ گورنمنٹ نے بہت ساری صنعتیں قائم کی تھیں لیکن ہر جگہ یہی ٹیکنیشنز لگائے گئے اور انھوں نے بہت پیسہ کمایا۔ یہ عورتیں کسی جگہ نہ جا سکیں۔ لیکن معمولی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے ٹیکنیشنز کے خلاف بہت شور مچایا۔ جس پر ٹیکنیشنز کو اپنی نوکریوں کی فکر لگ گئی۔ پھر میں نے چیخنا شروع کر دیا کہ کسی کو روزگار سے بے دخل نہیں کیا جانا چاہیے۔ بہرحال... 80 عورتوں کا پہلا گروپ، ان میں سے کئی دادیاں بن چکی تھیں، نے پہلا سال مکمل کر لیا۔ کسی نے پہلا مرحلہ مکمل کیا، کئی آگے چلی گئیں، کچھ ''مڈل'' کے لیے تیار تھیں، جب کہ بعض نے میٹرک کی تعلیم حاصل کر لی۔ پھر ایک اور سوال اُبھر کر سامنے آ گیا۔ یہ تھا ان کی عمروں کا! کئی ملازمتوں کے لیے عمر کی حد مقرر تھی، لیکن یہ عورتیں... پھر ہم سب نے نئے حلف نامے تیار کیے، جس میں انھوں نے اپنی تعلیمی قابلیت لکھی، لیکن ہمیں پہلے عمر کا ایک سرٹیفکیٹ درکار تھا۔ میں نے سٹاف کو بتایا کہ حکومت کا قانون ہے کہ 28 سال سے زیادہ عمر والا کوئی شہری سرکاری ملازمت حاصل

نہیں کر سکتا۔ میں نہیں جانتی اس کی کیا منطق تھی۔ تاہم یہ ایک قاعدہ تھا۔ لہٰذا ہم نے بعض جمع تفریق کی، ہم نے ان مواقع کے بارے میں غور کیا جو تعلیم حاصل کرتے وقت عورتوں نے کھو دیے تھے۔ پھر کسی کے لیے ایک سال اور کسی کے لیے چھ ماہ کی کوششوں کے بعد ہم نے دیکھا کہ کتنی عورتیں ملازمتوں میں کھپ چکی ہیں۔ لیکن میری ورکروں نے کہا: ''بہن جی! یہ فہرستیں اب کافی چھوٹی ہو چکی ہیں۔ میں نے کہا کیسے؟... ہم کیسے ان کے لیے ملازمتیں تلاش کریں؟ ان فہرستوں کو بڑا کرو، انھوں نے کہا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے پوچھا۔ بس جیسے میں نے کہا ویسے کرو، آرڈر اِز آرڈر، وہ میرا منہ دیکھنے لگے۔ سوچ رہے ہوں گے کہ بہن جی پاگل ہو گئی ہیں۔ پھر ہم نے حلف نامے مکمل کر لیے۔ میں مجسٹریٹ کی طرف گئی۔ اسسٹنٹ کمشنر، اسے کیا کہتے تھے، مجھے یاد نہیں آ رہا، ہاں اس کا نام تھا مسٹر پوری، میں نے اسے ٹیلی فون کیا اور کہا میں آپ سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے کہا: پلیز آپ ضرور آئیں۔ آپ کیا چاہتی ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ عورتیں آٹھویں کا امتحان دینا چاہتی ہیں۔ یہ ان کا پہلا داخلہ ہے جس کے لیے ہمیں عمر کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا، کن عورتوں کی عمر کے سرٹیفکیٹ؟ وہ کہاں ہیں؟ انھیں میرے پاس بھیج دیں۔ عورتیں باہر تھیں۔ میں نے کہا آپ کو عورتوں کو دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس نے کہا چونکہ مجھے حلف نامے پر دستخط کرنا ہیں، اس لیے متعلقہ عورتوں کو دیکھنا بہت ضروری ہے۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا مذاق نہ کریں، میں پہلے عورتوں کو دیکھوں گا۔ میں نے کہا: لیکن کیوں؟ اس نے کہا کیا میں مذاق کر رہا ہوں یا آپ؟ میں نے کہا آپ عورتوں کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ آپ تمام حلف ناموں پر دستخط کریں، بس!! اس نے کہا مِس سہگل، آپ ایک اجنبی فرد ہیں، کم از کم خواتین تو سامنے لائیں۔ (ہنستے ہوئے) بے چارہ اے سی، ہم نے عورتوں میں سے کسی کی عمر 12 سال، کسی کی 18 اور کسی کی 14 برس لکھی تھی... اس نے ان کی طرف دیکھا، کیا یہ وہ عورتیں ہیں؟ یہ ان عمروں کی ہیں؟ میں نے کہا، آپ کاغذات پر سائن کریں، آپ اپنا اور میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس نے کہا، مِس سہگل اس عورت کو دیکھیں اس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا مبارک ہو، وَیل ڈن، کیا آپ نہیں جانتے بعض لوگوں کے بال چھوٹی

عمر میں بھی سفید ہو جاتے ہیں؟ آج کل تو 12 سال کی عمر میں بال سفید ہو جاتے ہیں ـــــ کیا آپ نے کہیں نہیں دیکھا؟ میں آپ کو کئی لوگ دِکھا سکتی ہوں، موجودہ دور میں عمر کے لیے بالوں پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے کہا کہ آپ اس عورت کو دیکھیں، اس کے دانت تک نہیں ہیں۔ میں نے کہا: اوہ، اوہ آپ کی نظریں تو بہت تیز ہیں، عام مردوں کی طرح، میں نے کہا بی بی کیا تم چند روز پہلے چھت سے نہیں گری تھیں۔

اس نے کہا: ہاں، ہاں بہن جی، میں گری تھی اور میرے دانت ٹوٹ گئے۔ میں کیا کر سکتی تھی؟ اس نے کہا، مِس سہگل آپ مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہیں۔ میں نے کہا پوری صاحب، لڑکیاں آپ کے سامنے ہیں، آپ خود سچائی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو بے وقوف کیوں بنانے لگی۔ اس نے کہا، ان کے چہروں پر جھریاں ہیں۔ میں نے کہا آپ کی قوت مشاہدہ تو کافی تیز ہے، آپ نے بہت ساری چیزوں کو نوٹ کیا ہے۔ میں نے کہا دیکھیں پوری صاحب! مجھے بتائیں آج صبح آپ نے گھر پر کیا کھایا تھا؟ اس نے کہا، اچھا اب آپ مجھ پر میز الٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں نے کہا، جی نہیں! میں واقعی جاننا چاہتی ہوں آپ نے کس چیز سے ناشتہ کیا تھا۔ آپ نے یقیناً دودھ، پھل، ٹوسٹ، مکھن، انڈا کھایا ہوگا ـــــ یہ سب کچھ کم از کم آپ کی بیوی نے آپ کو دیا ہوگا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی آپ کو بتا سکتی تھی۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ پتہ نہیں، اور میں نے، میں نے بھی بہت کچھ کھایا ہوگا، لیکن ان غریب عورتوں کو دیکھیں، انھوں نے کچھ نہیں کھایا۔ حکومت انھیں صرف 10 روپے ماہانہ دیتی ہے۔ اس سے یہ کیا کھا سکتی ہیں۔ انھیں فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کے چہرے مرجھائے ہوئے ہیں۔ جب انھیں پیٹ بھر کر کھانے کو ملے گا، یہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی۔ اس نے کہا آپ واقعی جٹی ہیں، ان عورتوں کو دیکھیں، ایک کے دانت نہیں، دوسری کے بال سفید ہیں، تیسری کے چہرے پر جھریاں ہیں... میں نے کہا: اوہ، اوہ، پوری صاحب آپ چاہتے کیا ہیں؟ اس نے کہا مجھے ان عورتوں کی درست عمریں بتائیں۔ میں نے کہا اچھا ٹھیک ہے، آپ جو سمجھتے ہیں لکھ دیں۔ میں اسے قبول کر لوں گی۔ اس نے کہا وہ کیسے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں، اپنا قلم استعمال کریں اور حلف اٹھائیں اور لکھیں کہ یہ عورتیں کب پیدا ہوئیں اور میں یقین کر لوں گی۔ اس نے کہا میں بھلا کیسے بتا سکتا ہوں؟

MashalBooks.com

لہٰذا میں نے کہا، اگر آپ کو پتہ نہیں تو میں کیسے بتا سکتی ہوں؟ آپ اپنا اندازہ لگائیں تو میں بھی لگاؤں گی۔ میں نے کہا آپ نے ان کے چہرے دیکھے ہیں، یہ گاؤں سے آئی ہیں، کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ یہ عورتیں خود بھی اپنی عمروں سے آگاہ ہوں گی؟ یہ عورتیں کیا جانتی ہوں گی؟ یہ آپ کے سامنے جھوٹ بولیں گی۔ میں بھی جھوٹ بول رہی ہوں، آپ کو جھوٹے دستخط کرنا ہوں گے، کیوں کہ ہم سب جھوٹے ہیں، کوئی بھی نہیں بولے گا۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ یہ عورتیں بتا سکتی ہیں یہ کب پیدا ہوئی تھیں؟ میں بھی نہیں بتا سکتی۔ میں وہاں نہیں تھی، آپ بھی موجود نہیں تھے۔ لہٰذا ہم کیا کر سکتے ہیں؟ پورے 45 منٹ تک ہم نے بحث اور مسلسل بحث کی۔ اس نے پوچھا: مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے کہا: میں کچھ نہیں جانتی، میں یہ سب کچھ بھگوان کے نام پر کر رہی ہوں، آپ ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ میں نے کہا اگر آپ قسم اٹھا سکتے ہیں کہ یہ کب پیدا ہوئی تھیں، کس گھنٹے، کس دن، میں آپ کی بات مان لوں گی اور کاؤنٹر سائن کر دوں گی، لیکن آپ جانتے ہیں نہ میں۔ اگر آپ نہیں جانتے تو میں بھی نہیں۔

بہرحال اس نے دستخط کر دیے اور ان عورتوں کے ساتھ ہم نے سو فی صد نتائج حاصل کیے۔



MashalBooks.com

5
غیرت

MashalBooks.com

MashalBooks.com

حصہ اوّل

ہماری عورتیں، تمھاری عورتیں

عورتوں کی بازیابی کی مہم آغاز سے ہی مشکل اور تناؤ سے دوچار رہی۔ شروع میں پاکستان نے اس کام میں ملٹری ایوا کیوایشن آرگنائزیشن (ای ام او) کی مداخلت پر احتجاج کیا اور تجویز دی کہ اس فوجی ادارے کا کام صرف ٹرانزٹ کیمپوں (یہاں ان عورتوں کو اکٹھا کیا جاتا تھا جنھیں مختلف گھروں سے بازیاب کرایا گیا اور اب وہ ''اپنے ملک'' جانے کی منتظر تھیں) کی حفاظت ہونا چاہیے۔ پاکستان کا موقف تھا کہ تلاش و امداد کا کام صرف پولیس کے سپرد کیا جائے، بھارتی حکومت اس حوالے سے اس لیے ہچکچاہٹ کا شکار تھی کیوں کہ اس کا کہنا تھا کہ بعض کیسوں میں اغوا کنندگان خود پولیس والے تھے ـــــ اور اگر سوشل ورکروں کی بات کا یقین کر لیا جائے تو اس دعوے میں صداقت نظر آتی تھی، دونوں طرف کے بااثر افراد اغوا میں ملوث تھے۔ منٹگمری میں دیپال پور کا ایک تحصیل دار جو بڑے جوش و خروش سے مغوی عورتوں کی بازیابی کی اپیلیں کرتا تھا اس کے پاس 8 ماہ تک ایک عورت محبوس رہی۔ ایک اور واقعہ میں پولیس کے دو اسسٹنٹ سب انسپکٹروں نے مغوی خاتون کو بازیاب کیا اور پھر دونوں نے خود اس سے زیادتی کر ڈالی۔[1]

دونوں حکومتوں کے درمیان ابتدائی معاہدے پر دستخط کے کئی سال بعد تک بھی مغوی خواتین کے مستقبل کا معاملہ دونوں ملکوں کے لیے کافی تشویش کا باعث بنا رہا۔ قانون ساز اسمبلی میں 1947ء کے بعد کی کارروائیوں اور اخباری رپورٹوں سے اس حوالے

1: ''دی پارٹیشن آف دی پنجاب'': مصنف کرپال سنگھ، صفحہ 171۔

سے مختلف مباحث اور معاملات پر تشویش کا پتہ چلتا ہے:

دونوں ملکوں میں ریکوری کے غیر مساوی اقدامات، بازیاب ہونے والی خواتین کی تعداد، کہاں سب سے زیادہ برآمدگیاں ہوئیں، بھارتی حکومت پاکستانی ورکروں کو مختلف علاقوں تک رسائی کی اجازت کیوں دے رہی ہے حالانکہ پاکستان نے کئی علاقوں میں آمد و رفت بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، ایسا کیوں ہوا ہے کہ پاکستان سے ہندو اور سکھ عورتیں تو بہت کم بازیاب ہوئیں لیکن بھارت سے زیادہ مسلمان خواتین برآمد ہوئیں، بھارتی حکومت مسلمان عورتوں کی بازیابی کا کام اس وقت تک سست کیوں نہیں کر دیتی جب تک ہندو اور سکھ عورتوں کی برآمدگی کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوتا؛ اس قسم کے کئی سوالات اٹھائے گئے تھے۔

وہ آرڈی ننس جس کے تحت بھارتی حکومت بھارت سے مسلمان عورتوں کو بازیاب کر سکتی تھی، 30 دسمبر 1949ء کو ختم ہونا تھا۔ اس تاریخ سے 15 یوم پہلے گوپال سوامی آئینگر نے اسمبلی میں مغوی افراد کی بازیابی اور بحالی ایکٹ کا بل پیش کیا۔ یہ ایکٹ 1957ء تک مؤثر رہا، جس کے بعد اس میں توسیع نہیں کی جا سکی۔ اس وقت بازیابی کے کام میں نمایاں طور پر کمی آ گئی—— کئی عورتوں کو بازیاب نہ کرایا جا سکا جب کہ دیگر کئی اپنے نئے ''گھروں'' میں آباد ہو گئیں—— تاہم تلاش کا کام کسی نہ کسی طرح جاری رہا۔

آئین ساز اسمبلی میں، جہاں اس بل پر بحث جاری تھی کئی ارکان اسمبلی اس بات پر متفق تھے کہ تلاش کا کام تیز ہونا چاہیے، کیوں کہ اپنے مقاصد کے حصول میں یہ عین انسانیت نواز کام ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حکومت شہریوں کی قسمت سے بہ مشکل لاتعلق رہی۔ تاہم اسمبلی میں اس بحث کے نتیجے میں بھارت کے سیاسی رہنماؤں کو ذرا مختلف انداز میں مغوی عورتوں کی بازیابی کا سوال اُٹھانے کا موقع مل گیا، اس کی تہہ میں بھارتی سیاست دانوں کا وہ جذبہ بے وفائی کارفرما تھا جس کے تحت وہ خود کو اور انڈیا کو سیکولر سمجھتے تھے۔ ایک مقرر کے بعد دوسرا مقرر یہ شور مچاتا رہا کہ پاکستان متفقہ معاہدے پر پوری طرح عمل درآمد نہیں کر رہا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح کے رویے کی توقع کسی مہذب حکومت سے نہیں کی جا سکتی۔ اس تناظر میں دو چیزوں کی عکاسی ہوتی تھی: ایک طرف تو پاکستان کا روایتی غیر مہذب کردار (کیوں کہ وہاں کے مردوں نے فرقہ وارانہ

بُنیادوں پر ملک کے قیام کی جدوجہد کی تھی) دوسری جانب بھارتی حکومت کا انسان نواز اور مہذب سلوک۔ اسی اثنا میں یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ بھارتی حکومت اب ہندو عورتوں کی حوالگی کے لیے پاکستان پر دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔ وہ اس معاملے میں کسی تیسرے ملک کو بھی ملوث کرنے میں بھارت ناکام رہا۔ پروفیسر شبن لال سکسینہ (یو پی، جنرل) نے کہا کہ ''انھیں اس بات پر سخت صدمہ پہنچا ہے کہ ہماری حکومت دوسرے ملک سے ہماری بہنوں کی واپسی کے لیے مناسب اقدامات کرنے میں ناکام رہی۔ انھوں نے تجویز دی کہ بھارتی حکومت جوابی کارروائی کرے اور صورت حال سے مطابقت رکھنے والے اقدامات کرے۔ ایسا نہ صرف ''ہماری بہنوں'' کے لیے ضروری ہے بلکہ یہی ہماری روایت ہے۔ انھوں نے کہا مہابھارت اور رامائن مقدس ہیں، راون نے ایک عورت اُٹھائی تو پوری قوم نے ہتھیار اٹھا لیے اور جنگ چھیڑ دی اور یہاں ہزاروں خواتین اُٹھا لی گئیں اور ہم نے کون سا طریقہ اختیار کیا... کشمیر سے ہماری بہنوں کو اغوا کر کے بازاروں میں فروخت کیا گیا اور ان سے کیا کیا سلوک نہ کیا گیا۔[1] یہاں ایک اور قسم کی تنقید بھی تھی اور یہ تجویز کیا گیا کہ پاکستان میں مغوی ہندو اور سکھ عورتوں کی بازیابی کو دونوں ملکوں کے درمیان معاہدہ جنگ بندی کا حصہ بنا دیا جائے۔

جب کہ ایک رُکن نے تو ضرورت پڑنے پر کھلی جنگ کرنے کا بھی مشورہ دے ڈالا، ایک اور نے کہا:

> اگر کوئی ایسا زخم یا تکلیف دہ حقیقت ہے جس سے ہم کسی بھی حالت میں مفاہمت نہیں کر سکتے تو وہ ہندو خواتین کے اغوا اور عدم بحالی کا معاملہ ہے۔ ہم سب کو اس تاریخ سے آگاہی ہے کہ شری رام نے سیتا کے اغوا کے بعد کیا کیا تھا۔ لیکن یہاں جب کہ ہزاروں خواتین اغوا کی گئی ہیں ہم اسے نظرانداز نہیں کر سکتے، ہم ہر قسم کی جائدادوں کو بھلا سکتے ہیں، ہر چیز بھول سکتے ہیں، لیکن یہ بات ہرگز نہیں بھولیں گے... رام کے جانشین ہونے کے ناتے ہمیں ہر اس سیتا کو واپس لانا ہو گا جو زندہ ہے۔

---

1. India' Contituent Assembly of Inda (Legislative) Debates; 1949۔ یہاں ایوان سے متعلق دیگر تمام تفصیلات اس سال کی بحث میں سے لی گئی ہیں۔

MashalBooks.com

دوسری طرف بعض حلقوں کے احساسات ذرا مختلف تھے، مثال کے طور پر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کہتے ہیں کہ مسلمان خواتین کی ان کے جائز گھر (پاکستان) واپسی ایک بڑی اخلاقی ذمہ داری ہے، ہم محض اس لیے اپنی ذمہ داری سے روگردانی نہیں کر سکتے کہ دوسرا فریق ایسا کر رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کو یہ محسوس کرانا چاہیے کہ یہ اقدام نہ صرف میرٹ کے منافی ہے بلکہ ذلت آمیز ہے کہ وہ ایسے افراد کو اپنی سرزمین پر رکھے جو وہاں رہنے کے خواہاں نہیں اور انھیں اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔

لیکن حکومتی عہدے داروں نے انتقامی کارروائیوں کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ پنڈت ٹھاکر داس بھارگوا کے اس بیان کی یہ بات ناقابل فہم لگتی ہے کہ ایک ملک ان (مسلمان) لڑکیوں کو کچھ عرصہ تک یرغمال بنا کر کیوں نہیں رکھتا، پر حکومتی ترجمان گوپال سوامی آئینگر نے جواب دیا کہ ایسا کوئی اقدام کسی ''مہذب'' حکومت کو زیب نہیں دیتا۔ اس کے بجائے ایک سیکولر، اعتدال پسند ملک ہونے کے ناتے بھارت کا فرض ہے کہ وہ دوسرے ملک کو بھی اپنے رویے سے مہذب ہونے پر مجبور کر دے۔ انھوں نے ارکان پارلیمنٹ کو یاد دلایا کہ اغوا دونوں طرف کیے گئے، نیکی کے ٹھیکے دار صرف ہم ہی نہیں، یا دوسرے ملک کے لوگ ہی بُرے نہیں—— ہم بھی اتنے ہی قصوروار ہیں جتنا کہ وہ——

ہندو اور سکھ عورتوں کو اغوا کرنے والے مسلمانوں کی طرح پاکستان کو بھی اسی طرح ہانکا جا رہا تھا۔ یہ طریقہ مہذب تھا نہ اس سے مہذب رکھ رکھاؤ کا اظہار ہوتا تھا۔ رینوکا رائے، جن کا تعلق مغربی بنگال سے تھا، کا موقف بالکل واضح تھا: ''بھارت ہرگز پاکستان کے نظریات کا تابع نہیں بنے گا۔ بھارت کے اپنے مقاصد اور معیارات ہیں، چاہے پاکستان ان سے اتفاق کرے یا نہ کرے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ بھارت بھی اپنی سطح سے نیچے گر جائے اور انھی معیارات پر چلے جن کا مظاہرہ پاکستان نے کیا۔'' پنڈت ٹھاکر داس بھارگوا نے کہا: ''... جیسا کہ ہم اس وقت تک تشویش میں مبتلا ہیں، لیکن ہم اپنی اخلاقی ذمہ داریوں سے عہدہ برأ ہونے سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔'' اصل صورت حال یہ ہے کہ پاکستان نے ایسا نہیں کیا تھا، اس قضیے، کہ کس نے اخلاقیات کا مظاہرہ کیا اور کس نے نہیں کیا، کے دوران گاہے بہ گاہے اس معاملے میں ملوث اہم

کردار یعنی عورت کے حوالے سے بھی آواز بلند ہوتی رہی۔ مدراس سے رکن اسمبلی شریمتی آموسوامی نادھن نے کہا: مجھے یہ سن کر افسوس ہوا ہے کہ بعض ارکان نے جو ایسی کارروائی کی بات کی ہے۔ میرے خیال میں یہ عمل ہر لحاظ سے قطعی غیر انسانی ہوگا۔ اگر دو حکومتیں ایک دوسرے سے متفق نہیں ہو رہیں تو اس میں ظالم حالات کا شکار معصوم لڑکیوں کا کوئی قصور نہیں، ہمیں کسی طرح بھی انتقامی کارروائی کی بات نہیں کرنا چاہیے...

دوسرا مسئلہ یہ تھا: کہ ایسی مغوی عورتوں کا کیا کیا جائے جو اپنی برآمدگی میں مزاحمت کرتی تھیں۔ ان عورتوں نے حکومت کے لیے ایک مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ قانون انھیں مرضی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ حالانکہ دو آزاد ملکوں کا شہری ہونے کے ناتے انھیں اس کا حق ملنا چاہیے تھا۔ دونوں ملک اس بات پر رضامند ہوئے تھے کہ ایک مخصوص تاریخ کے بعد زبردستی مذہب اور بہ زور ہونے والی شادیوں کی قانونی حیثیت تسلیم نہیں کی جائے گی۔ تاہم اگر کوئی عورت یہ کہے کہ اس نے اپنے طور پر کوئی فیصلہ کیا تھا تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے؟ اس معاملے میں انصاف کون کرتا؟ ایسے کیسوں کا فیصلہ کرنے کے لیے جو ٹریبونل بنائے گئے وہ دونوں طرف کے پولیس افسروں پر مشتمل تھے۔ لوگ سوال کرتے تھے کہ کیا یہ لوگ خواتین کے دعوؤں کا انصاف پر مبنی فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتے تھے؟ اس مشکل سوال کا سامنا کرنے کے باوجود گوپال سوامی آئینگر یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ الزامات درست تھے۔ انھوں نے کہا کہ ''خواتین یا دیگر مغوی افراد جس ماحول سے برآمد کیے جاتے ہیں وہاں ان سے بادی النظر میں دباؤ کے بغیر فیصلہ کرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہم نے جو قانون بنایا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ایک آزادانہ ماحول میں آ کر فیصلہ کر سکیں۔'' لیکن خواتین کو آزادانہ ماحول کہاں میسر تھا—— عام طور پر یہ کیمپ ہوتا تھا—— کیا وہاں مرضی سے فیصلہ ہو سکتا تھا؟ انھیں نئے ماحول میں گھومنے پھرنے کی بہت کم سہولت ملتی، ان پر بہت زیادہ دباؤ ہوتا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو واپس چلی جائیں۔ دوسرے یہ کہ جن عورتوں کے اغوا کنندہ مردوں سے بچے بھی تھے وہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں کب ہوتی تھیں۔

جہاں اس وزیر کو اپنے بعض ساتھی ارکان اسمبلی کی حمایت حاصل ہوئی وہاں مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ رینوکا رائے (مغربی بنگال) نے کہا: اگر سینکڑوں واقعات

میں سے ایک بھی عورت کا کیس ہو جس میں وہ اپنی مرضی سے واپس نہیں جانا چاہتی تو حکومت کو اس پر توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے کہا، ''آخرکار بعض واقعات میں قانون کے تحت شادیاں ہوئیں اور ہمیں نہایت محتاط طریقے سے یہ دیکھنا ہوگا کہ ایسی عورتیں جو اتنا وقت گزرنے کے بعد اب واپس جانا نہیں چاہتیں، اُن کو جذبات میں مغلوب ہو کر واپس نہ بھیج دیا جائے، اس سے پہلے ایک اور خاتون پورنیما بینرجی نے اس حوالے سے حکومت کو خبردار کیا تھا۔ انھوں نے نشان دہی کی کہ عورتوں کو اٹھانے کے بعد کافی وقت گزر چکا ہے، اس دوران وہ:

> ایک دوسرے کے ساتھ رہتی رہیں اور ان کی باہمی وابستگی میں اضافہ ہو گیا... ایسی عورتوں کو محض ہندو اور مسلمان ہونے کے ناتے ایک دوسرے کے ملک میں نہیں بھیجا جانا چاہیے۔ اس ضمن میں یہ بھی نہ دیکھا جائے کہ انھیں کن حالات میں ان کے گھروں سے ہٹا کر اغوا کی حالت میں رکھا گیا۔

اس دوہرے حادثے کے حوالے سے تشویش میں اپنی آواز شامل کرتے ہوئے شری مہاویر تیاگی نے کہا:

> یہ لڑکیاں پہلے ہی تشدد کا نشانہ بن چکی ہیں۔ کیا یہ ایک بار پھر ان سے زیادتی نہیں ہوگی کہ انھیں دوبارہ برباد کر کے ان کی مرضی کے برخلاف مجوزہ کیمپوں میں رکھا جائے؟

البتہ وزیر صاحب اپنے موقف پر سختی سے جمے رہے۔ وہ قانون کی یہ شق تبدیل کرنے کو تیار نہیں تھے جو عورتوں کو اپنی مرضی اور فیصلہ کرنے کا اختیار انھیں دیتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں ایک بھی ایسی عورت کا پتہ نہیں چلا جس نے اپنے باپ، بھائی، ماں یا شوہر کے رابطے کے بعد اصرار کیا ہو کہ وہ بدستور اپنے اغوا کنندہ کے ساتھ رہنا چاہتی ہے—— اس طرح اغوا ہونے والی عورتوں کی ذہنی کیفیت فطری ہے جنھیں زبردستی اغوا کر کے غلط ماحول میں محبوس رکھا گیا۔ ان کا اصرار تھا کہ انھیں ایک بھی ایسی عورت کے کیس کا علم نہیں جسے بازیاب کرایا گیا اور اسے اس کی مرضی کے خلاف پاکستان دھکیل دیا گیا ہو البتہ انھوں نے اعتراف کیا کہ تحویل میں لیتے وقت عورتوں سے ان کی مرضی دریافت نہیں کی گئی۔ اس کے پیچھے یہ نظریہ دیا گیا کہ جس ماحول میں وہ

عورت رہ رہی تھی اس میں وہ آزاد نہیں تھی، اس کے پاس ذہنی طور پر یہ فیصلہ کرنے کی آزادی کا فقدان تھا کہ وہ دوبارہ واپس اپنے پُرانے ماحول کو لوٹ جائے یا نئی جگہ پر قیام کو برقرار رکھے۔

اس طرح اگر بازیاب خاتون کی طرف سے مزاحمت ایک مسئلہ تھا تو اس سے بھی بڑی پریشانی یہ سوال تھا کہ بچے کہاں جائیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ وہ لوگ جو خواتین کے اغوا کو سراسر غیر اخلاقی اور شرم ناک فعل قرار دیتے تھے وہ چاہتے تھے کہ مغوی عورتیں اپنے بچے چھوڑ کر چلی آئیں۔ پنڈت ٹھاکر داس بھارگوا نے کہا، ''آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ ہر وہ بچہ جو بھارت میں پیدا ہوا یہاں کا شہری ہے، اگر ہم یہ سوچنا شروع کر دیں کہ ہندو مرد کی بیوی مسلمان ہے تو ان بچوں کا کفیل کون ہوگا؟ انھوں نے کہا جب ایک مسلمان عورت کو بازیاب کرایا جائے تو وہ پاکستان چلی جائے گی، وہاں جا کر وہ بچے کا مذہب تو تبدیل کرا لے گی لیکن اسے بدستور ولدالحرام کہا جائے گا، اس سے بدسلوکی کی جائے اور عین ممکن ہے کہ اسے جان سے ہی مار ڈالا جائے۔ اس بحث میں بچوں کا مستقبل سب سے پریشان کن معاملہ تھا ـــــ انتہائی جذباتی ـــــ لیکن اسے عملی، مقصدیت پر مبنی اور غیر جذباتی بُنیادوں پر لیا گیا۔ لیکن ارکان اسمبلی تو غیر جذباتی ہو سکتے تھے، مائیں کیسے ہوسکتی تھیں؟ کملا بن نے بھی اس پریشانی کی نشان دہی کی: اس نے کہا، ہندو معاشرے میں مسلمان باپ اور ہندو ماں سے جنم لینے والے بچے کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر بازیاب عورتوں کے رشتہ دار بچوں کو قبول نہیں کرتے تو حکومت کو لازمی طور پر لاوارث بچوں کی ایک بڑی تعداد سنبھالنے کا کام کرنا پڑے گا، غالباً بچوں کو اپنے باپ کے پاس چھوڑنے کی تجویز کے پیچھے یہی سوچ کارفرما ہوگی، میں بچوں کے حوالے سے دوبارہ آگے جا کر بات کروں گی۔

☆☆☆

اسمبلی واحد حصہ نہیں تھی جہاں عورتوں کی قسمت پر بحث کی گئی بلکہ اس دور کے اخبارات و جرائد کے صفحات پر بھی مغوی خواتین پر مباحثے شائع کیے گئے، راشٹریہ سیوک سنگھ کے ترجمان جریدے ''دی آرگنائزر'' نے اس اِشو پر تند و تیز لہجہ اختیار کیا۔ 29 دسمبر 1949 کے شمارے میں صفحہ اوّل پر رسالے نے ''پاجی پاکستان: 25 ہزار مغوی

فروخت کر دیے'' کی سُرخی کے ساتھ ایک سٹوری شائع کی جس میں اس طرح تفصیل دی گئی: سیتا کی آبرو کے لیے شری رام نے ہتھیار اُٹھائے اور راون کو تباہ کر دیا، جب غلیظ خلجی (مسلمان بادشاہ) نے چتوڑ کو محصور کیا تو رانی پدمنی کی قیادت میں ہزاروں عورتوں نے عروسی جوڑے پہن کی ہنستے ہوئے چتا پر چڑھنا قبول کر لیا تا کہ ملیچھ حملہ آور اعلیٰ ذات کے ہندو خون کو پلید نہ کر سکیں، لیکن آج جب کہ سینکڑوں عورتیں پاکستان میں افسوس ناک حالت میں ناقابل برداشت راتیں بسر کر رہی ہیں تو آزاد، خود مختار، جمہوری ملک بھارت کی پہلی حکومت ریں، ریں کرنے کے سوا ان کے لیے کچھ نہیں کر رہی۔ اس آرٹیکل اور اس کے بعد لگاتار مختلف تحریروں میں ''آرگنائزر'' پاکستان کو مطعون کر کے اسے بونا پاکستان کا خطاب دیتا رہا۔ مسلمان مردوں کے ہاتھوں ہندو اور سکھ عورتوں کی آبرو ریزی کے حوالے سے پاکستان کو بربر، غیر مہذب اور عیاش کے الزامات دیے گئے۔ خطہ بھارت (یا بھارت ماتا کے وجود) سے جنم لینے والی پاکستانی قوم پاک ہندو عورت سے زیادتی کا استعارہ بن گئی۔ بھارتی حکومت کو جارح ملک پاکستان کے منہ توڑ جواب دینے پر مسلسل تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور ہمیشہ سے کہیں زیادہ ملک کی حفاظت کے لیے طاقت وَر فوج کی تشکیل نو ہندوؤں کی اہم ضرورت قرار دیا گیا۔ چمن لال نے اپنی کتاب ''ہندو امریکہ'' میں لکھا ہے: ہم اتنے بزدل بن چکے ہیں کہ بار بار ٹھڈے کھانے کے باوجود ... ہم بیرونی حملہ آوروں سے سچائی اور انصاف کے نام پر ایسے اپیل کرتے ہیں گویا قابض لوگ ہماری التجا کا ویسے ہی جواب دیں گے۔ ہمیں بہ حیثیت قوم یہ فوجی کمزوری دور کرنے کے لیے کیا درکار ہے۔ ہندو نسل کا جنگجو (کشتری) کہاں گیا؟[1] آرگنائزر میں لکھنے والے کئی مصنفین کے نزدیک خواتین کا اغوا اور ان سے زیادتی ایک شرم ناک فعل مگر توقع کے عین مطابق اقدام تھا، جس کی پاکستان جیسے مسلمان ملک سے اُمید کی جا سکتی تھی۔ ایک ایسی قوم جس کی بنیادیں ہندوؤں کے اثاثوں اور عورتوں کی لوٹ مار پر استوار ہیں، نے اپنے چیمپئنوں[2] کے لالچ اور حرص کی شہ مات کے لیے کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ البتہ اس باب میں ایک اور حقیقت بھی چھپی نظر آتی ہے۔ ہندوؤں

1. : ''آرگنائزر'' 10 جولائی، 1947ء۔
2. : ''آرگنائزر'' 14 دسمبر، 1949ء۔

MashalBooks.com

اور سکھوں نے بھی تو مسلمان عورتیں اغوا کی تھیں، ان کے بارے میں کیا کیا جائے؟ آئین ساز اسمبلی میں بحث کے دوران میں اس فعل کو ''ذہنی خلل'' کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہا گیا: ایسے مرد یقیناً سفلی جذبات کا شکار ہوئے اور ''آرگنائزر'' یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ کسی ہندو یا سکھ نے کوئی مسلمان عورت اغوا کی ہو، بلکہ انھوں نے تو مسلمان عورتوں کو ''پناہ'' دی:

> 1947ء کے موسم گرما میں پنجاب میں ہندو مسلم جنگ کے دوران میں نفرت اپنی خوف ناک انتہا تک پہنچ چکی تھی، دونوں طرف لاکھوں افراد کا قتل عام کیا گیا، لیکن جنگ—— جنگ سے زیادہ بدتر، خواتین کا اغوا تھا جو مسلمانوں کی قابل نفرت اور پُرانی عادت ہے، جس سے پوری ہندو اکثریت کے علاقوں میں بھی ہزاروں مسلمان بیوائیں اور بے سہارا عورتیں پیچھے رہ گئی تھیں، لیکن بازیابی کا کام شروع ہوتے ہی ہندوؤں نے ان عورتوں کو سہارا دے کر حکام کے حوالے کر دیا۔ بھارت میں شاید ہی کوئی عورت اپنی مرضی کے بغیر باقی رہ گئی ہو۔ یہاں یہ بتانا بہت ضروری ہو گا کہ کئی مسلمان عورتوں کو خود مسلمانوں نے ہی اغوا کر لیا۔

بعض اوقات جنسی ہوس میں مبتلا ہونے کے باوجود ہندو مردوں کو مجموعی طور پر بے ضرر، کمزور اور ہوس سے پاک سمجھا گیا۔ پڑھنے والوں کو بتایا گیا کہ ہندو ذہنیت دوسروں سے انصاف تو کرنے کی حامی ہے لیکن اس میں انصاف مانگنے کی ہمت کا فقدان ہوتا ہے۔[1] یہ اس لیے ہے کہ بھارت کی روایت بہت عظیم ہے اور اس کی ثقافت بہت عالی شان ہے جس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ:

> تاریخ کے تمام ادوار میں، حتیٰ کہ جب اس کے پاس طاقت ور فوج تھی اور وہ پورے براعظم ایشیا کو زیر دام لا سکتا تھا، ہندوستان نے قابض ملک کا کبھی کردار ادا نہیں کیا۔ جہاں دوسرے لوگ اپنے آبا و اجداد کی طرف سے انسانوں کو غلام بنانے اور مذہب تبدیل کرانے کی مہمات پر فخر کرتے ہیں، وہاں دانش و لیاقت سے مالا مال ہندوستان صرف اسی قدیم دَور کو یاد کرتا

1: ''آرگنائزر'' 14 دسمبر 1949ء۔

ہے جب اس کی تاب ناک تہذیب کا شہرہ چہار دانگ میں پھیلا ہوا تھا۔[1]

یہ قدیم روایت ہی تھی جس نے ہندو مردوں کو مہذب اور متحمل بنایا یہاں تک کہ انھوں نے (غلطی سے؟) مغوی عورتوں کو حکومت یا متعلقہ حکام کے حوالے از خود کر دیا۔ یہ وہی تحمل مزاجی تھی ـــــ ابھی تک اہم ـــــ جس نے بحران کی گھڑی میں ہندو مرد کو اپنی عورتوں کی حفاظت کے قابل نہ بننے دیا۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمان حکومت کی زبان میں ہتھیار اُٹھانے، جنگ کرنے اور انتقام لینے کے اعلان کیے جا رہے تھے۔ اسی طرز پر ایک اور مصنف ہمیں بتاتا ہے کہ:

> ہماری لاکھوں پاک باز ماؤں بہنوں کو جو خونی مناظر دیکھ کر خوف زدہ تھیں، اغوا کر کے پیسوں، آنوں اور پائیوں کے بدلے فروخت کر دیا گیا۔ میں نے ان میں سے کئی کو مقدس مقامات سے برآمد ہوتے دیکھا۔ ان کی پیشانیوں پر کندہ تھا، ''محمد کی جورو، میاں احمد کی جورو، حاجی حسین کی جورو،'' وغیرہ وغیرہ...
>
> ہر ہندوستانی کا اولین فریضہ ہے کہ وہ انھیں (بالعموم مہاجرین کو) مؤثر طور پر خطے کی معیشت اور معاشرے میں شریک کر لے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں، اس میں مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ یہ بالکل واضح ہے، لیکن یہ بات بھی کم واضح نہیں کہ اصل مسئلہ جو دراصل ہماری مردانگی کے لیے چیلنج ہے، وہ ہماری قوم پرستی کے لیے چیلنج سے بھی کم نہیں۔[2]

مردانگی اور قوم پرستی کو ایک جیسا قرار دینا خلاف معمول نہیں۔ اس کے لیے مردوں کو اپنی دھرتی ماتا کی حرمت کے تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ''آرگنائزر'' کے کئی مصنفین کے نزدیک اس عرصے میں بھارت ماتا کی تقدیس نہایت اہمیت کا کام تھا۔ وہ مادر گیتی جس نے ہندو نسل کو جنم دیا اور جو ہندو مذہب کا گھر تھا، یہ ملک، چاہے اسے بھارت کہا جائے یا ہندوستان، اس کو ایک ماں تصور کیا گیا اور تقسیم کو اس کے بدن کی بے حرمتی سمجھا گیا۔ 14 اگست 1947ء کو ''آرگنائزر'' کے شمارے میں صفحہ اوّل پر ایک تصویر شائع کی گئی جس میں بھارت ماتا کا نقشہ بنا تھا اور اس پر ایک عورت لیٹی تھی اور

1، 2 : ''آرگنائزر'' (بالترتیب) 14 دسمبر 1949ء، 12 جولائی 1947ء۔

اس کے جسم کا ایک حصہ کٹا ہوا تھا۔ اس میں ایک شخص جسے نہرو کے طور پر دکھایا گیا تھا، نے ہاتھ میں خنجر اٹھا رکھا تھا، ظاہر کرتا تھا کہ اس کا ذمہ دار وہی ہے اور بھارت ماتا کے متعلق کہیں ذکر کیا گیا ہے کہ ''یہی وہ عقیدہ تھا جس نے صدیوں تک ہندوستان کو مٹنے سے بچائے رکھا، یہ دھرتی فتوحات اور غلامی کی حالت میں وحشت زدہ حالت میں رہی۔ اسے دہشت اور جبر سے کبھی ایک کبھی دوسرا بیرونی عقیدہ قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا رہا۔ لیکن اس نے اپنا وہ مذہب (ہندوازم چھوڑنے سے ہمیشہ انکار کیا جو اس کی روح ہے۔''[1]

اس وعظ میں ان مغوی عورتوں کے لیے بھی سبق ہے جو بڑی آسانی سے شکار ہوئیں یا دوسروں کے مذہب کو قبول کر لیا۔ اگر ایک اچھی ہندو عورت ایک ''اچھی'' ماں کے برابر ہوتی ہے تو اس کا ایک مسلمان مرد کے ساتھ بغیر نکاح ـــــ زبردستی یا رضا کارانہ ـــــ رہنا ہندوانہ نظریے کے لیے واقعی خطرہ ہے جس سے نمٹنا ہوگا۔ اس کی ذمہ داری ان کے شوہروں اور بھائیوں پر عائد ہوتی ہے، کہ وہ ان کے لیے لڑیں، جنگ کریں، حتیٰ کہ ضرورت پڑے تو جل کر راکھ ہو جائیں اور اپنی عورتوں کو تمام تر ''ناپاکی'' کے باوجود اپنے حلقوں میں واپس لے جائیں۔ جیسا کہ ''کمل'' (مستقل لکھنے والے ایک اخبار نویس کا فرضی نام) نے بیان کیا، ''نہ صرف بھارت ورش ہماری ماں اور ہم اس کے بچے ہیں، وہ ہماری پالن ہار اور ہم اس کے احسان مند ہیں۔ وہ مقدس تھی، باہر جانے کا مطلب ہے، غیر ملکی، پلید اور ظالمانہ سرزمین پر قدم رکھا جائے، لہٰذا گھر واپسی پر ان کی تطہیر ضروری تھی۔[2]

ایک اور آرٹیکل میں رام کے اپنے بھائی سے اس فقرے کا حوالہ دیا گیا ہے:
''اے لکشمن! اس سنہرے سری لنکا نے میرے دل کو سکون نہیں پہنچایا۔ ہماری ماتا، جنم بھومی سورگ کی راحتوں سے زیادہ خوش کن ہے۔''[3]

ماں کا جو ارفع تصور پیش کیا گیا وہ وہی تھا جو مسلمان عورت کا تھا۔ اگرچہ ایسا صرف ''آرگنائزر'' کے صفحات میں ہی گاہے بگاہے دکھائی دیتا تھا اور قارئین کو ان

1: ''آرگنائزر'' 13 نومبر 1948ء۔
2: ''آرگنائزر'' 25 ستمبر 1947ء۔ 3: ''آرگنائزر'' 19 اگست 1948ء۔

MashalBooks.com

خطرات سے آگاہ کیا جاتا جو ہندو عورت کو لاحق تھے۔ ''لائف ان سندھ'' کے عنوان سے ایک آرٹیکل میں ہوندراج کرپلانی نے واویلا مچایا کہ ہندوؤں کو قدم قدم پر نفرت اور بدسلوکی کا نشانہ بنایا گیا، ''حتیٰ کہ آپ اپنے گھروں میں بھی محفوظ نہیں۔'' مسلمان عورتیں بھیس بدل کر گھروں میں داخل ہو جاتی ہیں اور پوچھتی ہیں، ''آپ کچھ چیزیں بیچنا چاہتے ہیں؟ پھر چند منٹوں کے بعد وہ کہتی ہیں کہ وہ آپ کے گھروں میں قیام کریں گی، آپ ان کو باہر نہیں نکال سکتے، کیوں کہ آپ انھیں ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتے اور کسی کے ذریعے بھی انھیں نہیں نکال سکتے...'' پھر وہ کالم نگار اپنے ہندو بھائیوں کو اشتعال دلاتے ہوئے وارننگ دیتی ہے، ''آپ صرف دو یا تین دن انھیں برداشت کر سکتے ہیں، کیوں کہ راتوں کو چیخنے چلانے والی ان مسلمان عورتوں کا مسئلہ واقعی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ پھر آپ کیا کریں گے۔'' صاف ظاہر ہے، پھر اس کے بعد ایسا کوئی راستہ نہیں تھا جس میں ہندو مرد اُن جارح مسلمان عورتوں کی موجودگی میں بے بس ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے جو زبردستی گھروں میں رہنے پر اصرار کرتی تھیں۔

☆☆☆

وسیع پیمانے پر نقل مکانی، موت، تباہی، نقصان—— اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تقسیم کس حد تک ناگزیر نظر آتی تھی، کسی نے بھی اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس عمل سے کتنی خون ریزی، دُشمنی اور نفرت پھیلے گی۔ دہلی کے ایک بڑھئی فرہاد نے کہا: ''ہم نے سوچا تھا کہ آزادی ملتے ہی دہلی کی سڑکیں سونے سے بنائی جائیں گی اور دودھ سے دھوئی جائیں گی لیکن اس کی جگہ ہمیں صرف خون کے دریا بہتے نظر آئے۔'' اس وقت تک کوئی یہ اندازہ نہ لگا سکا کہ اس صورت حال میں ''عورتیں'' اتنی اہمیت، اتنی مرکزی حیثیت بلکہ ایک مسئلے کی صورت اختیار کر جائیں گی۔ البتہ ناکافی ہی سہی حکومت بعض ایسے اقدامات کر سکتی تھی جن سے بے گھر افراد یا ان لوگوں کی جن کی جائدادیں چلی گئیں، تلافی ممکن ہوسکتی۔ لیکن جہاں اتنے بڑے پیمانے پر ریپ، اغوا ہوا ہو، یا اس مسئلے کا کیا حل ہوسکتا تھا جب ایک مغوی عورت یہ کہے کہ وہ اپنے اغوا کنندہ کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہے؟

MashalBooks.com

1947ء میں آزادی حاصل کرنے والا بھارت مسائل سے دوچار ملک تھا، جسے انتہائی سنگین پیچیدہ مشکلات سے لڑنا اور اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ریاستی اقدامات کو کتنے لوگوں نے قبول کیا یا مسترد کیا، پالیسی سطح پر ایسی کوئی مؤثر حکمت عملی اختیار نہیں کی گئی۔ اس سے بھی مایوس کن بات یہ تھی کہ مادی چیزوں پر زیادہ توجہ دی گئی، کتنا زرِ تلافی، جائداد کی ریکوری وغیرہ، لیکن جہاں عورتوں کا معاملہ درپیش آتا گفتگو قطعی مختلف بحث کی صورت اختیار کر لیتی—— وہ یہ کہ قوم کی غیرت، مردوں کی عزت...

تقسیم بذات خود—— اس کے ضمنی مضمرات سمیت سراسر گھاٹے کا سودا تھا، اگرچہ تقسیم کے نتیجے میں آزادی ملی، لیکن اس میں ایک قسم کا احساسِ شرمندگی بھی موجود تھا کہ ہندوستان نے اپنے وجود کے ایک حصے کو دوسری قوم کے حوالے کر دیا۔ قوم پرستوں کی پوری تحریک کے دوران میں عورتوں اور مردوں کو سرگرم کرنے کے لیے ہندوستان کو ماں (بھارت ماتا) کے جس روپ میں پیش کیا جاتا رہا، اب ماں کے اسی تصور کی نفی ہوتی تھی، یعنی ایک عورت کے بدن کی تذلیل کا تصور۔ ''آرگنائزر'' میں انڈیا کے نقشے کے طور پر ایک عورت کی تصویر جس کا بازو نہرو خنجر سے کاٹتے ہوئے دکھائے گئے، بھی اسی تصور کا طاقت ور خاکہ تھا۔ یہ بازو پاکستان کے طور پر ظاہر کیا گیا تھا۔

اگر ملک کے وجود کی تقسیم کو ایک قوم بہ طور ماں کے جسم کی تقسیم کے طور پر یاد کیا گیا تو دوسری طرف خواتین کا اغوا، ان سے زیادتی، ان کی زبردستی ان کے خاندانوں، برداریوں اور ملک سے علیحدگی کو جسمانی زیادتی—— نہ کہ محض استعارے کے طور پر—— پیش کیا گیا۔ ہر عورت جسے اٹھا لیا گیا وہ درحقیقت ایک ماں تھی۔ مامتا کے تقاضوں کے تحت اس کے صنف کو قانونی حیثیت میں قبول کیا جا سکتا تھا، لیکن ایک مغوی ماں، بالخصوص ایسی اغوا شدہ ماں جس نے اصل میں اپنے اغوا کار کے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی، کے ضمن میں اس صنف کے تقاضے قبول نہ کیے گئے۔ پھر بھلا ممتا کی بے حرمتی کیسے ہو سکتی تھی؟ اس حقیقت کو اس دَور کی افراتفری کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا تھا لیکن اس عمل کا تسلسل: آخر کیوں خاندانوں، برادری، قوم اور بالخصوص مردوں نے اس عمل کو

جاری رکھا؟ عورتوں کو واپس لانا ہوگا، انھیں پاک کرنا ہوگا۔ (اور اس کا مطلب تھا کہ انھیں ان کے بچوں، یعنی ان کے ناجائز تعلق کی ناجائز پیداوار سے الگ کر دیا جائے) انھیں ان کے خاندانوں سے دوبارہ ملانا ہوگا۔ صرف اسی طرح اخلاقی دستور بحال ہوسکتا تھا اور بحیثیت قوم اس کی تکمیل تب ہی ہوسکتی تھی جب ''آرگنائزر'' کے مطابق ہندوؤں کی مردانگی کو انتقام کے لیے تیار نہ کر دیا جاتا۔ اگر تقسیم کا عمل ''دوسرے'' کے نزدیک نقصان تھا، مادر گیتی کے جسم سے زیادتی و بے حرمتی کا استعارہ تھا تو خواتین کی بازیابی اس سے بالکل اُلٹ عمل تھا۔ خاتون کے وجود کی پاکی کا دوبارہ حصول، ریاست کے لیے انتہائی ضروری سمجھا گیا—— بلکہ—— ایک فرقے کی قانونی حیثیت کے مترادف تھا۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ اسمبلی میں مغوی افراد کی بازیابی کے قانون کے بارے میں تفصیلی بحث کے دوران میں ان خواتین کے لیے بہت کم کہا گیا جو اصل موضوع بحث تھیں، حتیٰ کہ آج کل کی اسمبلی بحثوں میں بھی ان عورتوں سے متعلق کچھ نئی بات نہیں، جب کہ کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ عورتوں کے لیے ہے۔ اکثر ایسی بحثوں میں خواتین کا ذکر بہت کم یا بالکل نہیں نظر آتا۔ تاہم ان کی بُنیاد پر اپنے دیگر عزائم کی تکمیل کی مشق ضرور کی جاتی ہے، بالکل اسی طرح اسمبلی میں بحث بھی ایک مشق تھی جو بھارت کے امیج کی بحالی کے نام پر ہوئی۔

شاید اس حوالے سے ہمیں انتہائی متضاد سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ: بھارتی حکومت نے مغوی خواتین کی بازیابی کے لیے اتنی غیر ضروری تاخیر سے کام کیوں لیا؟ ٹھیک اسی طرح وہ ایکٹ جس سے حکومت کو کارروائی کے اختیارات ملتے تھے، اس میں ان اختیارات کے حوالے سے اہم ترامیم کی ضرورت کیوں نہ سمجھی گئی؟ ابتدائی دِنوں میں حکومت بہ مشکل ذرا مختلف انداز میں کام کر سکی اور فیملیوں پر قانون پر عمل درآمد کے لیے دباؤ ڈالا گیا، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور بازیابی کا کام مشکل تر ہوتا چلا گیا—— صاف ظاہر تھا اس دوران میں عورتوں نے واپس جانے سے انکار کر دیا کیوں کہ اب ان کے بچے پیدا ہو چکے تھے۔ پھر حکومت نے ریکوری آپریشن جاری کیوں رکھا؟

اور اگر عورتوں کی برآمدگی حکومت کے لیے اتنی ہی اہم بن گئی تھی تو ہم یہاں

ایک اور سوال بھی اُٹھا سکتے ہیں: کہ پھر اس دوران میں ''آرگنائزر'' میں شائع ہونے والی رپورٹوں جیسی بحثوں کو کیوں اہم سمجھا گیا۔ ان دونوں صورتوں میں عورتوں کو ایک فرد کے طور پر شمار نہ کیا گیا۔ ان کی خواہشات کو بہت کم اہمیت دی گئی، عورت کو مزاحمت کا حق نہیں دیا گیا تھا، انھیں اپیل کا حق اس لیے نہیں تھا کہ ایکٹ انھیں اس بُنیادی حق کے حصول سے روکتا تھا۔ نہ صرف انھیں زبردستی بازیاب کیا گیا، اور اگر وہ اپنی برآمدگی پر اعتراض کرتیں تو انھیں (1954ء کے بعد) ایک ٹریبونل کے رُو بہ رُو کیس کرنے کی اجازت دی گئی ـــــ اگر ٹریبونل شواہد کو غیر منصفانہ خیال کرتا ـــــ تو عورتوں کے پاس اور کوئی چارہ کار باقی نہ رہتا۔ ہمارے پاس اس سوال سے فرار کا کوئی راستہ نہیں کہ اگر مردوں کی تشویش کا مرکز خواتین ہی قرار پائیں تو پھر ریکوری آپریشن کی بُنیاد کی حقیقت کیا تھی؟

قومی حمیت: وہ غیرت جو بھارت ماتا کے وجود کے حوالے سے خطرات میں پڑ گئی اور پھر اس کا دائرہ ہندو اور سکھ عورتوں، ماؤں اور متوقع ماؤں تک بڑھا دیا گیا۔ ان عورتوں کا دوسرے مذہب کے مردوں کے لیے نقصان ان کے ''اصل'' کنبوں کا بھی نقصان تھا، یہی خاندان، نہ کہ نئے خاندان ان کے قانونی گھر تھے، اور وہیں ان کی بحالی کی ضرورت تھی، اور اگر اس کا مطلب رشتوں میں خلل سمجھا گیا تو چاہے کوئی بھی وجہ تھی قبول کیا جانا چاہیے تھا۔ ایسا ہی کیا جانا چاہیے تھا۔ اس کے لیے یہ مفروضہ اختیار کیا گیا کہ دباؤ کی حالت میں عورتیں آزادانہ فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ اس بات میں کسی حد تک حقیقت ہے، لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی سچ تھا، کیوں کہ خواتین کو ان کے ''اپنے'' خاندانوں کے اندر بھی بہت کم ایسے مواقع میسر آتے تھے جب وہ آزادانہ فیصلے کر سکتی ہوں، یا اپنی رائے کا اظہار کر سکتیں، اور ستم ظریفی یہ ہے کہ ایسے خاندانوں کو ہی قانونی حیثیت دی گئی، عورتوں کو ''دوسرے'' ناقابل قبول خاندانوں سے ہٹا کر ''حقیقی'' گھروں میں لڑھکا دیا گیا اور یہ سب کچھ حکومت کے لیے آبرومندانہ عمل قرار پایا۔

اگر نو آبادیاتی نظام نے ہندوستانی مرد کو ہندو عورت کی ''بہادر مہلا'' کی شناخت کی تعمیر اور تعمیر نو کی عقلی دلیل دی تو ہندو عورت اور ماں، اپنے مرد کی سپورٹر، آزادی اور اس کے تاریک لفظ ''دوسرا'' اور تقسیم نے عورتوں کو قومی غیرت کی علامات

(other) قرار دینے کے عقلی دلائل دیے۔

یہ بات زیادہ حیران کن نہیں تھی۔ اگر 1947ء میں آزادی نوآبادیات کے خلاف قوم پرستی کی فتح تھی تب تقسیم کو اس طرح فرقہ واریت کی جیت کے طور پر بھی پیش کیا گیا۔[1] یہی چیز آج کے بھارت کے لیے دور رس نتائج کا باعث بنی۔ فرقہ واریت کا تعلق زیادہ تر پاکستان سے جوڑا گیا، اس طرح پاکستان کو ایک تفرقہ پرست اور اغوا کار ملک کے طور پر پیش کیا گیا، جو ہندو اور سکھ عورتوں کی واپسی سے انکار کرتا تھا۔ جب کہ انڈیا ایک معقول، مہذب اور فرقہ پرستی سے پاک ملک سمجھا گیا، جو اپنی اخلاقی ذمہ داریاں بہ احسن پوری کر رہا تھا۔

☆☆☆

حصہ دوم

شہادت کی روایت

تقسیم کے بعد خواتین کو جس تشدد (voilence) کا سامنا کرنا پڑا، وہ خاموشی کی کئی تہوں میں چھپا ہوا ہے۔ اگرچہ ہمیں تاریخی حوالوں سے خواتین کے ساتھ زیادتی اور ان کے اغوا کے بارے میں کچھ ہی تفصیلات کا پتہ چلتا ہے لیکن ہم ''دوسرے'' مذہب کے مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر تشدد کے بارے میں تو جانتے ہیں۔ لیکن اس بات کا کم کم ہی اعتراف دکھائی دیتا ہے کہ کتنی ہندو اور سکھ عورتیں سکھوں اور ہندوؤں کا نشانہ بنیں۔ یوں روزمرہ کی گڑ بڑ اور طوفان میں اس بات کا امکان نہیں کہ ہندو اور سکھ مرد معصوم رہے ہوں گے۔ وہ دیومالا جس کا متاثرہ افراد روز افزوں اظہار کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس بحرانی کیفیت میں خاندان اور مختلف مذاہب گرفتار رہے ہوں گے، اس میں بھلا وہ کس طرح اپنے لوگوں کے جرم کا اعتراف کر سکتے ہیں؟

میں پہلی بار 1986ء میں خاندانی اور فرقہ وارانہ تشدد کی کہانیوں سے آشنا ہوئی۔

---

1. Aijaz Ahmed, "Some Reflections on Urdu" in Seminar 359, : Julay 1989, 25.

MashalBooks.com

اس وقت مجھے اس کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ یہ واقعات کتنے بڑے پیمانے پر ہوئے۔ منگل سنگھ وہ پہلا شخص تھا جس سے ملاقات میں مجھے یہ کتاب لکھنے کے دوران میں اس حوالے سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ امرت سر بازار میں جہاں منگل سنگھ رہتا ہے، اسے ایک لیجنڈ کی حیثیت حاصل ہے، تین بھائیوں میں اب صرف وہی زندہ تھا۔ وہ تھیلے میں صرف تین کپڑوں کے ساتھ اگست 1947ء میں امرت سر کو روانہ ہوا، سرحد پار کرنے کے بعد اس نے بھارت میں مسلمانوں کی چھوڑی ایک چھوٹی سی اراضی پر قبضہ کر لیا، جو پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ اس نے کہا، ''میرا دل بہت مغموم تھا، یہ جگہ خالی اور وسیع تھی، میں نے سوچا مجھے یہیں رہنا چاہیے۔ یہ ویران اور خالی جگہ میرے لیے مناسب ہے۔'' وہیں اُس نے گھر بنایا اور نئی زندگی شروع کرنے کا تکلیف دہ عمل شروع کیا، رشتہ داروں اور دوستوں سے تھوڑا سا قرضہ لیا (اس وقت چند سو یا چند ہزار حاصل کرنا مشکل نہیں تھا کیوں کہ لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے) اور پنکھوں اور بجلی کے فاضل پرزہ جات کی دُکان شروع کی۔ اس نے شادی بھی کر لی اور نئے خاندان کا آغاز کیا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی، منگل سنگھ 70 کی دہائی میں تھا۔ وہ دادا بن چکا تھا اور اس کے گرد اہل خانہ کا ہجوم تھا۔ اس کے بیٹے کاروبار چلا رہے تھے جب کہ اس کا اپنا زیادہ وقت پوتوں اور پوتیوں کے ساتھ گزرتا۔

کئی لوگوں نے زور دیا کہ میں منگل سنگھ سے ملوں جب کہ میں بھی اس کے بارے میں کافی بے تاب تھی۔ اس کے علاقے میں اس کے ''لیجنڈ'' قرار دینے کی وجہ یہ تھی کہ تقسیم کے وقت اس نے بھائیوں کے ساتھ مل کر سرحد پار کرنے سے قبل اپنے خاندان کی 17 عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالا۔ مجھے اس کہانی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرا سوال تھا کہ آپ نے آخر کس طرح اپنے ہی بچوں، اپنے ہی خاندان والوں کو ہلاک کیا اور کیوں کیا؟ شروع میں منگل سنگھ مجھے بات کرنے سے گریزاں نظر آیا۔ ''تمھیں یہ سب دوبارہ جاننے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے پوچھا، تاہم اپنے اہل خانہ سے مشورہ کرنے کے بعد وہ مجھ سے بات کرنے پر آمادہ ہو گیا—— بہ ظاہر انھوں نے زور دیا تھا کہ وہ مجھ سے بات کر لے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اس نے کافی عرصے سے اپنے دل

پر یہ بوجھ اُٹھا رکھا تھا۔ میں نے اس سے مرنے والے اہل خانہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا: ''ہمارا خاندان کافی بڑا تھا، ان دِنوں لوگوں کے بچے بہت زیادہ ہوتے تھے۔ یوں ہماری کئی عورتیں اور ان کے بہت سے بچے ہوتے... کئی لڑکے، کئی لڑکیاں... بھتیجے اور کئی دیگر بچے... کیا خوب خاندان تھا، خوش وخرم!

پھر آخر کیوں کر انھوں نے انھیں قتل کرنے کا سوچا؟ منگل سنگھ نے یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ انھوں نے افرادِ خانہ کو مارا۔ اس کی جگہ اس نے لفظ ''شہید'' استعمال کیا۔ وہ کہتا ہے:

> گھر سے رخصت ہونے کے بعد ہمیں قریبی گہرے پانی کی حد بندی سے گزرنا تھا، اور ہم کئی افراد خانہ تھے۔ کئی عورتیں اور بچے اس پانی سے گزرنے کے قابل نہیں تھے، نہ ہی آگے جا سکتے تھے، لہٰذا ہم نے انھیں مار ڈالا — اور وہ شہید ہو گئے — ہمارے خاندان کے 17 ارکان — سترہ زندگیاں... ہمارے دل ان سے بچھڑنے کے خیال سے افسردہ تھے۔ ان کی تکلیف ہماری اپنی تکلیف تھی، لہٰذا ہم نے بھاری دل کے ساتھ سفر کیا۔ ہمارے پاس ایک بھی پیسہ نہیں تھا، جسے ہم اپنا کہہ سکتے۔ کھانے کو ایک نوالہ تک نہیں تھا... لیکن ہمیں جانا تھا، اگر ہم ایسا نہ کرتے تو مار دیے جاتے۔ وہ ایسا ہی دَور تھا...

میں نے پوچھا آخر آپ نے عورتوں اور بچوں کا ہی خون کیوں کیا؟ کیا انھیں زندہ رہنے کا چانس دینے کا حق نہیں تھا؟ کیا انھیں ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا تھا؟ منگل سنگھ مُصِر تھا کہ ان لوگوں نے خود ہی اپنی زندگی کی قربانی دینے کی پیش کش کی تھی کیوں کہ ان سے جو سلوک ہو سکتا تھا، اس پر موت کو ترجیح دی جا سکتی تھی، یعنی زیادتی اور تبدیلی مذہب! سوال یہ ہے کہ کیا واقعی انھوں نے اپنی جانیں پیش کی تھیں؟ کیا انھیں کوئی خوف نہیں تھا؟ میں نے پوچھا تو منگل سنگھ کا جواب تھا: ڈر...؟ میں تمھیں ایک بات بتا دوں، تمھیں سکھوں کی نسل کا پتہ ہے؟ ان میں خوف نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، ان لوگوں (مارے گئے افراد) میں کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ وہ سیڑھیاں اُتر کر بڑے صحن میں جمع ہوئے اور گھر کے قریب بیٹھ کر بولے، ہمیں شہید کر دو — ہم شہید بننا چاہتے

ہیں۔ اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ حتیٰ کہ چھوٹے بچوں کے تاثرات بھی یہی تھے... اس میں بھلا ڈرنے کی بات کون سی تھی؟ اصل خوف بے آبرو ہونے کا تھا، اگر انھیں مسلمان پکڑ لیتے تو ان کی آبرو، ہماری عزت، سب داؤ پر لگ جاتی، قربان ہو جاتی۔ یہ ایک شخص کی غیرت کا سوال ہے... اگر آپ کو اس پر فخر ہے تو آپ کو کوئی خوف نہیں ہو سکتا۔

لیکن کس کا فخر اور کس کو خوف تھا؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب منگل سنگھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر اس کے بیان جیسے حوالوں پر یقین کر لیا جائے تو خاندانوں اور پورے مذہب کو جس چیز کا سب سے زیادہ خوف تھا، وہ مذہب کی تبدیلی تھا۔ تشدد کا مقابلہ تو کیا جا سکتا تھا لیکن تبدیلی مذہب وہ چیز تھی جس کا سامنا کرنا مشکل تھا۔ بعض سیاق وسباق سے ان کی یہ تشویش بے سبب نہیں نظر آتی: دونوں طرف بڑے پیمانے پر لوگوں کو جبری مذہب تبدیل کرایا گیا۔ بالخصوص سکھوں میں یہ بات طے کر لی گئی کہ مرد تو مزاحمت کر سکتے ہیں لیکن عورتوں کے لیے مذہب کا بچاؤ کرنا مشکل ہوگا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مرد لڑ سکتے ہیں، ضروری ہوا تو جان بھی دے دیں گے اور ترکیب یا طاقت استعمال کر کے بھاگ بھی سکتے ہیں، لیکن عورتوں کے پاس اس کام کی طاقت نہیں، اس طرح وہ بالخصوص تبدیلی مذہب کے حوالے سے سخت موقف رکھتے تھے۔ کئی عورتوں سے زیادتی ہوگی، کئی دوسرے مذہب کے مردوں کے بیج سے حاملہ ہو جائیں گی اور اس طرح نہ صرف ان کی عزت بلکہ پوری برادری کی غیرت کا جنازہ نکل جائے گا۔ وہ عورتیں ''ناپاک'' بچوں کو جنم دیں گی جس سے پوری کمیونٹی آلودہ ہو جائے گی۔ یوں جب کہ مرد خود کو بچا سکتے تھے—— یہ بات بالکل طے تھی کہ عورتوں اور ان کے ذریعے پوری نسل کو ''بچایا'' جائے۔

منگل سنگھ سے ملنے کے چند برس بعد، میں نے تقسیم کے حوالے سے اخباری رپورٹوں کا مطالعہ شروع کیا، مجھے اس نوعیت کے خاندانی تشدد کے واقعات کی تلاش تھی۔ 15 اپریل 1947ء کی اشاعت میں انگریزی اخبار ''دی سٹیٹس مَین'' لکھتا ہے:

> ضلع راولپنڈی کے چھوٹے سے گاؤں ٹھوا خالصہ میں 90 عورتوں نے کنویں میں کود کر جان دے دی۔ اس واقعے سے پنجاب کے عوام کی ذہنی کیفیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان عورتوں نے قدیم راجپوت روایت کو

زندہ کیا ہے کیوں کہ جب ان کے مردان کی حفاظت کے لیے زندہ نہ رہے تو انھوں نے اجتماعی طور پر موت کو گلے لگا لیا۔ انھوں نے گاندھی کی ہندوستانی عورتوں کو نصیحت پر بھی عمل کیا جس میں انھوں نے قرار دیا تھا کہ معروضی حالات میں ہتھیار ڈالنے کے بجائے خودکشی کرنا اخلاقی طور پر بہتر ہے۔

ایک ماہ قبل ایک فرقہ وارانہ جتھے نے لاٹھیوں، دستی بموں اور ٹامی گنوں سے لیس ہو کر گاؤں کا گھیراؤ کر لیا۔ گاؤں والوں نے جتنا ہو سکا دفاع کیا... لیکن آخرکار مجبور ہو کر انھوں نے صلح کا پرچم بلند کر دیا۔ مذاکرات پر آمادگی ظاہر کی گئی، 10 ہزار روپے خراج کا مطالبہ کیا گیا... جو فوراً ادا کیے گئے۔ حملہ آوروں نے حلفیہ یقین دہانی کرائی کہ وہ واپس نہیں آئیں گے۔ وعدہ اگلے روز ہی توڑ دیا گیا۔ انھوں نے گاؤں والوں سے مزید رقم کا تقاضا کیا اور اس دوران میں 40 مزاحمت کاروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ تعداد میں کمی کے باعث وہ اس قتل عام کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی عورتوں نے ایک ہنگامی میٹنگ کی اور اس نتیجے پر پہنچیں کہ اب ان کے پاس عزت کے علاوہ کچھ نہیں بچا۔ 90 عورتوں نے چھوٹے سے کنویں میں چھلانگ لگائی، لیکن صرف تین بچ سکیں۔ وہ بھی اس لیے کہ کنویں میں ان سب کو غرق کرنے کے لیے کافی پانی نہیں تھا۔

یہ کہانی فرقہ وارانہ تشدد کے ان واقعات کا حوالہ دیتی ہے جو تقسیم سے چند ماہ قبل مارچ 1947ء میں رونما ہوئے۔ اس سے پہلے اسی مہینے 9 دن کے اندر راولپنڈی ضلع کے متعدد سکھ دیہات پر حملے کیے گئے۔ 6 مارچ سے 13 مارچ تک، اگرچہ بعض مقامات پر 15 مارچ تک حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حملے صوبہ بہار کے مسلمانوں پر حملوں کے انتقام میں کیے گئے۔ اس کے علاوہ لاہور میں سکھ لیڈر تارا سنگھ کے مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز بیانات پر بھی مسلمان سیاست دانوں کا ردِعمل ہوا تھا۔ اس بات کا یقین کرنا مشکل ہے کہ حملوں کی ابتدائی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ تقسیم ہو کر رہے گی تو مسلمانوں اور ہندوؤں نے ایک دوسرے پر حملے شروع کر دیے۔ ضلع راولپنڈی کے گاؤں تھمالی، ٹھوا خالصہ،

مٹور، نارا اور دیگر کئی علاقوں میں 13 مارچ کو اس وقت حملے بند ہو گئے جب فوج نے وہاں آ کر باقی ماندہ افراد کو بچا لیا۔ کئی دیہات میں تمام آبادی کو مٹا کر رکھ دیا گیا، جب کہ بعض جگہ کچھ لوگ جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔

انہی میں سے کچھ لوگ آج بھی دہلی کے متوسط طبقے کے علاقوں جنگ پورہ اور بھوگل میں آباد ہیں۔ مجھے ٹھوا خالصہ میں اجتماعی خودکشیوں کے واقعے کی بعض تفصیلات کا یہیں سے پتہ چلا۔ چونکہ وہ ٹھوا خالصہ کی تاریخ رقم کرنے کے دعوے دار تھے اس لیے وہ خود کو راولپنڈی کے دیگر افراد سے ممتاز سمجھتے ہیں۔ لوگ ان کی اس طرح بات کرتے جیسے منگل سنگھ کا ذکر کرتے ہیں—— ان کی بہت عزت و احترام کیا جاتا ہے۔ ٹھوا خالصہ کے قریبی گاؤں کے دو بھائیوں کو اپنی بہنوں کے اغوا کا ابھی تک قلق ہے۔ انھیں لگتا ہے کہ انھوں نے کوئی غلطی کی ہے۔ صاف ظاہر ہے ''قربانی'' دینے والی خواتین نے اپنے خاندانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ ٹھوا خالصہ کے سانحے کے بارے میں پہلی کہانی میں نے بسنت کور سے سنی۔ لمبی چوڑی خاتون اس وقت 70 کے پیٹے میں تھی۔ بہ قول اس کے وہ بھی کنویں میں کودنے والی عورتوں میں شامل تھی، چونکہ کنواں لاشوں سے بھر چکا تھا اس لیے وہ ڈوبنے سے محفوظ رہی۔ میں یہاں اس کے طویل انٹرویو کو دوبارہ پیش کر رہی ہوں۔

بسنت کور

میں انھیں یہ کہانیاں سنا رہی ہوں...

میرا نام بسنت کور ہے۔ میرے شوہر کا نام سنت راجہ سنگھ تھا۔ ہم 12 مارچ کو اپنے گھروں سے نکلے اور 13 مارچ کو گاؤں کے باہر ہم نے ڈیرے لگا لیے۔ شروع میں ہم نے اپنی طاقت کے مظاہرے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ لہٰذا اس کے بعد ہم نے مقابلے کے لیے مورچے سنبھال لیے۔ ہم 13 مارچ کو ٹھوا خالصہ میں اپنے گھروں سے نکلے، تین چار دن تک ہم گھروں میں محصور رہے، ہم باہر نہ نکل سکے، البتہ چھتوں کے اوپر سے کسی حد تک ہم نقل و حرکت کر سکتے تھے۔ ہمارے ایک آدمی کے پاس ہندوق تھی۔ ہم نے اسے استعمال کیا اور ان کے

دو یا تین آدمی مار ڈالے۔ لیکن ان کی جوابی کارروائی سے میرا برادرِ نسبتی (دیور) بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہ حملہ آوروں کی گولی کا نشانہ بنا۔ گولی اسے لگی اور وہ مارا گیا۔ بہرحال ہم نے بندوق اٹھائے رکھی۔ اس کے بعد چاروں طرف فائر ہی فائر ہونے لگے۔ ہم اس کی زَد میں تھے لیکن اس کا سدباب ہمارے پاس نہیں تھا۔ میرا ایک جیٹھ تھا، اس کا ایک بیٹا تھا۔ اس نے کہا مجھے افیون دو۔ اسے پانی میں ملاؤ، میرے جیٹھ نے اپنی ماں، بہن، بیوی، بیٹی اور چچا کو قتل کر دیا۔ میری بیٹی بھی مر گئی۔ ہم گاؤں کے اندر اپنے مورچے میں چلے گئے۔ تمام گاؤں والے گاؤں کے وسط میں سرداراں دی حویلی میں جمع ہو گئے، جہاں ایک کنواں بھی تھا، یہ لاجونتی کا گھر تھا۔ سردار، اس کا شوہر کچھ عرصہ پہلے مر گیا تھا لیکن اس کی بیوی اور دیگر خواتین وہیں تھیں۔ کچھ بچے بھی تھے۔ وہ سب باہر نکل آئے۔ پھر ہم سب نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا کہ ہم میں سے کوئی مسلمان نہیں بننا چاہتی، بلکہ اس کی جگہ ہم بہ خوشی موت کو ترجیح دیں گی۔ بس اس کے بعد سب کو کافی مقدار میں افیون دی گئی۔ انھیں کہا گیا کہ یہ اپنے اپنے پاس رکھیں... میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی اور جب میں واپس نیچے آئی تو وہاں میرا شوہر، میرے جیٹھ کا بیٹا، میری جیٹھانی، ان کی بیٹیاں، میرا جیٹھ، میرے پوتے اور تین پوتیاں موجود تھیں۔ وہ سب قتل کر دیے گئے تاکہ مسلمانوں کے ہتھے نہ چڑھیں۔ ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی تھی، وہ مسلمانوں کے ساتھ چلی گئی، وہ بہت خوب صورت تھی۔ ہر کسی کو فکر لگ گئی کہ اگر ایک چلی گئی ہے وہ ہماری سب لڑکیوں کو بھی لے جائیں گے... لہٰذا پھر انھوں نے تمام لڑکیوں کو جان سے مار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے جیٹھ جس کا نام ہربنس سنگھ ہے، نے اپنی بیوی، بیٹیوں اور بیٹے ـــــ بہت چھوٹا سا، صرف آٹھ یوم کا... کو قتل کر ڈالا۔ پھر میری نند کو ہلاک کیا گیا۔ اس کے بیٹے اور بیٹی کو بھی نہ چھوڑا۔ پھر 14 مارچ کو ہم جہلم چلے آئے۔ گاڑیاں آئیں اور ہمیں لے گئیں۔ ہم وہاں ایک مہینہ تک رہے، پھر دہلی پہنچ گئے۔

دہلی میں میرے چار بھائی رہ رہے تھے۔ انھوں نے اخبارات میں کیمپ کے بارے میں پڑھا تو وہاں آ کر ہمیں ڈھونڈ لیا۔ پھر آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ بچے بڑے ہو گئے اور معاملات طے ہوتے چلے گئے۔ میرے والدین تھمالی کے رہنے

والے تھے، وہاں شاید ہی کوئی زندہ بچا تھا۔ تمھیں گورمیت کی فیملی کا پتہ ہے۔ ان کی دو بہنیں تھیں، جنھیں مسلمان ساتھ لے گئے۔ پتہ نہیں وہ مرکھپ گئیں یا انھیں اٹھا لیا گیا۔ لیکن وہ یا ان کی لاشیں کبھی نہ مل سکیں... کوئی اس طرح مرا کوئی اُس طرح، کوئی یہاں تو کوئی وہاں، کسی کو کچھ علم نہیں ہو سکا، میرے اپنے والدین زندہ جلا دیے گئے۔ تمام علاقہ جیسے ایک جنگل تھا۔ وہ کوئی دیہاتی علاقہ تھا، میرا ایک بھائی زندہ بچ گیا اور نکل بھاگا۔ ایک بہن بھی بچ نکلی۔ ان دونوں کی ایک مسلمان نے مدد کی۔ ان میں کچھ اچھے بھی تھے اور انھوں نے مدد کی ـــــ اس نے پہلے انھیں گھر میں پناہ دی، پھر فوجی گاڑیوں میں سوار کرا دیا۔ وہ گاڑیاں مٹور اور دیگر مقامات پر گئیں۔ مٹور میں شاہ نواز نے انھیں یقین دلایا کہ انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔ نارا گاؤں کے لوگ وہاں سے نکل گئے لیکن آگے جا کر سب کو قتل کر دیا گیا۔ پھر میرے بھائیوں نے اخبارات پڑھے اور انھیں ہمارے بارے میں علم ہوا۔ میرے شوہر نے اپنی بیٹی، بھتیجی، اپنی بہن اور ایک پوتے کو قتل کر ڈالا، اس نے انھیں کرپان مار کے ہلاک کیا۔ میرے جیٹھ کے بیٹے نے اپنے ہاتھوں سے اپنی ماں کا خون کیا۔ پھر اپنی بیوی، بیٹی، پوتے اور پوتی کو پستول سے گولی ماردی۔ پھر میرے جیٹھ نے خود پر مٹی کا تیل چھڑکا اور خود کو آگ لگا لی۔

میری بچیاں قتل کر دی گئیں۔ پھر ماتا لاجونتی، جن کے گھر کے قریب ایک باغ میں کنواں تھا۔ پھر ہم سب اس میں کود گئیں۔ ہماری تعداد 100 کے لگ بھگ تھی... یا شاید 84... لڑکیاں اور لڑکے۔ میں نے بھی اندر چھلانگ لگائی۔ میں نے اپنے دو بچوں کو اُٹھایا اور کود گئی۔ میرے پاس کچھ زیورات تھے، کانوں اور ہاتھوں میں پہنے ہوئے تھے۔ میرے پاس 14 روپے نقد بھی تھے، میں نے سب کچھ اُٹھایا اور کنویں میں پھینک دیا۔ پھر خود چھلانگ لگا دی... لیکن یہ ایسے ہی تھا جیسے آپ جلتے ہوئے تندور میں اُپلے پھینک کر روٹیاں پکائیں اور اگر تندور میں روٹیاں لگنے کے بعد جگہ باقی نہ رہے تو اوپر والے حصے میں لگی روٹیاں کچی رہ جاتی ہیں اور انھیں باہر نکال لیا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح کنواں بھر چکا تھا اور ہم ڈوب نہ سکے... بچوں کو بچا لیا گیا۔ بعد ازاں نہرو بھی وہ کنواں دیکھنے گئے۔ انگریزوں نے بھی معائنہ کیا۔ پھر اسے بھر دیا گیا، لاشوں سے بھرے کنویں کو۔ پٹھانوں نے ان لوگوں کو باہر نکال لیا جو زندہ رہ گئے اور سب سے اوپر

تھے... جو مر گئے تھے، وہ مر گئے اور جو زندہ تھے انھیں نکال لیا گیا۔ پھر وہ چلے گئے ــــ اور جو کچھ ہمارے گاؤں میں باقی رہ گیا اسے بچا لیا گیا، ماسوائے اس لڑکی کے جسے وہ اُٹھا لے گئے تھے۔

میں بہت خوف زدہ تھی، یقیناً میں ڈری ہوئی تھی... لیکن ہم کو مسلمانوں کے ہاتھوں اغوا ہونے کا بھی خوف تھا۔ ہمارے گاؤں میں عین درمیان میں جو کنواں تھا، اس میں لڑکیوں نے چھلانگیں لگائیں۔ انھوں نے آدھی رات کو یہ کام کیا۔ کنواں مورچے کے قریب تھا اور دوسری 100 ... شاید 84 عورتیں جس کنویں میں کودیں وہ ذرا ہٹ کر تھا۔ لاجونتی کے گھر سے 20 گز دور۔ لاجونتی کے گھر کے اندر مورچے میں لوگ جمع ہو گئے۔ اس کی عمر 70-71 سال تھی۔ لمبی چوڑی عورت تھی۔ اس نے لوگوں کی بہت سیوا کی اور خود بھی کنویں میں چھلانگ لگا گئی۔ مورچہ بند کئی لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا۔ مسلمان چھتوں سے چڑھ کر اوپر آ گئے اور کئی لوگوں کو بندوقوں سے قتل کرنے کی کوشش کی... پھر ہم نے چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ ایک حملہ آور نے میرے جیٹھ کی چھاتی پر بندوق کی نوک رکھ دی۔ کئی پہلے ہی مارے جا چکے تھے اور ہم مورچے میں تھے۔ کنواں لاجونتی کے گھر سے تھوڑا سا دور باغ میں تھا۔ وہاں دو کنویں تھے، ایک باغ سے باہر اور ایک اندر تھا۔ میری نند اور اس کی بیٹی دونوں وہاں تھیں... قریب ایک برتن تھا، میں نے اس میں افیون ملا دی اور اسے کھانے کو دی جسے اس نے منہ میں رکھ لیا اور مر گئی۔ میرا خیال ہے کہ گاؤں کے کتوں نے اس کی لاش نوچی ہو گی۔ ہمارے پاس مرنے والوں کی آخری رسومات ادا کرنے کا کوئی وقت نہیں تھا، ایک گھنٹے یا ذرا دیر سے ٹرک وہاں آ گئے... صرف ایک گھنٹے بعد!

اس نے (نند نے) پاٹھ کیا اور کہا مجھے یہاں نہ پھینک کر جاؤ۔ مجھے یہ افیون دے دو۔ اس نے رب کا نام لیا اور پھر مر گئی۔ ہمارے پاس افیون تھی کیوں کہ میرے جیٹھ کا بیٹا افیون استعمال کرنے کا عادی تھی۔ لہٰذا اس نے سب کو کھانے کے لیے افیم لا دی۔ میرے جیٹھ کا بیٹا، اس کی بہو اور بیٹی بعد میں جہلم میں مر گئے۔ اس وقت 15 مارچ یا اس کے لگ بھگ تاریخ کو ہم دینہ کے کیمپ کو جا رہے تھے، یہ کیمپ جہلم کے قریب تھا۔ چار دن تک ہم لڑے اور مضبوطی سے جمے رہے۔ پھر 12 مارچ کے قریب ہم مورچہ

بند ہو گئے۔ 13 مارچ کو ہمارے لوگ مار دیے گئے، پھر شام کو ٹرک آئے اور ہمیں قریبی گاؤں روات لے گئے۔

وہ ہمیں ادھر لے آئے، (کنویں کی طرف) وہاں سے ... تمھیں بتا دوں وہاں کوئی جگہ نہیں تھی... کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا، پاس ہی کچھ لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے... لیکن میں بچوں کو کہاں سے کھانا لا کر دے سکتی تھی... میرے پاس بہ مشکل چند پیسے تھے... میرے بڑے بیٹے کے پاس ایک دوانی (دو آنے) تھے، ہم نے سوچا کہ ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں... میرے بھائی کے بچے بھی بھوکے تھے... پھر ہمیں بتایا گیا کہ دوانی کھوٹی تھی، بے کار اور ناکارہ... (روتے ہوئے) کتنی مشکلات تھیں... کھانے کو کچھ نہیں... ہمیں ان کے پیٹ بھرنا تھے... آج وہ رانیاں ہوتیں... ان میں سے کتنے تھے، جٹھانی، بچے... میں سب سے چھوٹی تھی... آج میں اپنے گھر میں بیٹھی ہوں، بچے کام کرتے ہیں اور میں انھیں کہانیاں سناتی ہوں... وہ بہرحال کہانیاں ہی ہیں... آپ سناتے جائیں، سناتے جائیں، یہاں تک کہ ہوش وحواس سے بے گانہ ہو جائیں۔

☆☆☆

انھوں نے وہ کہانیاں سنائیں، اس کی کہانیاں مت سنو... ہم بھوگل میں 13 مارچ کو یوم شہدا کے طور یاد کرتے ہیں... گورمیت نے تمھیں کیا بتایا؟ کیا اس نے تمھیں تھمالی کے بارے میں بتایا؟ شمال میں میرے والدین کا گھر تھا (مائکا) وہ وہاں سے جوان لڑکیاں اُٹھا کر لے گئے ـــــ کیا اس نے تمھیں بتایا؟ ہمارے گاؤں میں ایک مندر اور ایک گرودوارہ تھا، مسجد کوئی نہیں تھی، مسلمان باہر سے آئے تھے، تھمالی میں البتہ چند گھر مسلمانوں کے تھے ـــــ گندم، اجناس اور چنوں کی بوائی کرتے... وہ ہماری رسومات میں حصہ لیتے، وہ کچھ نہ کرتے بس ہمارا نمک کھاتے تھے۔

میرا شوہر؟ اسے میرے بھتیجے نے قتل کر ڈالا۔ میرے اپنے بھتیجے نے! کیوں کہ انھوں نے لڑکیوں، اپنی بیٹی، بہن، پوتے پوتیوں کو کرپانیں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ میرے جیٹھ کے بیٹے کے پاس پستول تھا، جس سے اس نے اپنی ماں، اپنے چچا کو قتل کر دیا... پھر میرے بھتیجے نے پستول سے میرے شوہر کو مار ڈالا۔ اس بھتیجے کی ایک ڈیڑھ سالہ بچی تھی، اسے بھی گولیاں ماری گئیں۔ ہاں جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا،

MashalBooks.com

میرے بھتیجے نے میرے شوہر کو ہلاک کیا۔ اس نے اس لیے اسے مارا کہ میرے شوہر نے مسلمان بننے سے انکار کر دیا تھا۔ ذرا تصور کرو—— 15، 20 ہزار لوگ تھے اور ہمارے پاس صرف چار بندوقیں تھیں، وہ بھی حملہ آور ساتھ لے گئے۔ اسی قسم کا واقعہ تھمالی میں رونما ہوا۔ وہاں سے بھی تمام اسلحہ لوٹ لیا گیا۔ پھر انھوں نے انھیں (گاؤں والوں کو) مار ڈالا۔ میرا بھتیجا جوان اور تگڑا تھا۔ میرے جیٹھ کے بیٹے—— اس کی دکانیں تھیں۔ یہ وہ لڑکا نہیں جس کا باپ زندہ جل گیا بلکہ دوسرا بڑا جیٹھ تھا۔ میرے آٹھ جیٹھ تھے۔ اس لڑکے نے بعد میں خودکشی کر لی۔ میرے ایک بیٹے نے اپنی بیوی کو مار ڈالا۔ اپنی بیٹی اور چھوٹے بیٹے کا خون کر دیا... ایک جیٹھ رنگ آباد آ گیا، جہاں اس کا بیٹا تھا۔ ایک بیٹا جل کر ہلاک ہو گیا۔ دوسرا جو بڑا تھا، یہ سب کچھ ہوتا دیکھتا رہا۔ وہ کچھ نہ بولتا تھا۔ لوگوں نے سوچا آخر اس کو کیوں قتل کریں۔ اس کے بچے نہیں، نہ کوئی بیٹی، نہ بیٹا، کچھ بھی نہیں۔ میرے دو جیٹھوں کی اولاد نہیں تھی... یہ سب ہمارے کنویں میں کودنے سے پہلے کے واقعات ہیں، کوئی واقعہ 12 تاریخ کو، کوئی 13 (مارچ) کو ہوا۔ پھر رات آئی تو فوجی ٹرک آ گئے۔ چار عورتوں کو کنویں سے باہر کھینچ لیا گیا۔ انھوں نے عورتوں کو بازوؤں سے پکڑا اور باہر نکال لیا، وہ مسلمان۔ چاروں عورتیں، ایک عورت تو بہت خوب صورت تھی، اس کے آٹھ بچے تھے، اسے بچا لیا گیا۔ اس نے پہلے اپنے بچوں کو دھکا دیا، پھر خود کود گئی، لیکن اسے بچا لیا گیا... تمھیں بتاؤں، تم تو اس حوالے سے کام کر رہی ہو، کئی عورتیں مر گئیں، لیکن جب پانی کم پڑ گیا تو اوپر والی عورتیں بچ گئیں۔ بیویاں، پوتے پوتیاں، بہوؤیں، برہمن زادیاں، ہمارے گاؤں میں اعلیٰ ذات کے بھی کچھ خاندان تھے، ان کی عورتیں بچوں سمیت ... بعد ازاں نہرو وہاں آئے اور رو پڑے، پھر انھوں نے کنواں بند کرا دیا، پھر فوج کے ساتھ کچھ عرصے بعد اسے دوبارہ کھلوا دیا گیا۔ کچھ ماہ کے بعد جب میں دہلی جا رہی تھی۔ دینہ کیمپ سے میرا بھائی مجھے لے گیا۔ میرے بھائی یہاں تھے، وہ ٹرک چلاتے تھے۔

ہمارے گاؤں میں چند مسلمان خاندان تھے، لیکن ہمیں کبھی کوئی مشکل نہیں آئی تھی۔ ہم اکٹھے رہتے، شادیاں ہوتی تھیں اور ہم ایک دوسرے کی تقریب میں شرکت کرتے تھے۔ ہم بہت پیار و محبت سے رہ رہے تھے۔ ہمارے قریبی دیہات تہائی،

MashalBooks.com

سینتھا، سدیوک، صدا اور دیگر چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی مسلمان پائے جاتے تھے۔ میں نے پشاور میں جنم لیا تھا۔ میں اس وقت 19 یا 20 سال کی تھی جب میں تھمالی آ گئی۔ اگرچہ میری شادی ٹھوا خالصہ میں ہوئی تھی۔ جس وقت میرے باپ کو قتل کیا گیا ان کی عمر 90 برس تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ تھمالی میں رہتے تھے اور طویل عرصے تک پنشن وصول کرتے رہے۔ 40، 45 روپے کے لگ بھگ رقم تھی۔ میرے باپ نے کہا، ''میری بیٹی تمھاری ساری بہنیں رُخصت ہو چکی ہیں۔ صرف تم باقی بچی ہو۔ اب تمھارے جانے کا وقت بھی آ گیا ہے۔ میں نے کہا اس کی ضرورت نہیں، میں نے جب مناسب سمجھا رُخصت ہو جاؤں گی—— بہرحال ہم بڑے سکون سے رہ رہے تھے... میں اس وقت پنشن لے رہی ہوں۔ البتہ یہ میرے شوہر کے نام ہے، میرے نام پر نہیں ہے۔ میں جھوٹ کیوں بولوں؟ ہم مورچے میں چینی کی چار بوریاں لائے، دو بوریاں چھوہاروں اور دو مونگ پھلی سے بھری تھیں۔ تمھیں بتاؤں ہم تھوک کے بھاؤ میں چیزیں خریدتے تھے۔ اور اس طرح ہمارے پاس گڑ، چاول وغیرہ جیسی اجناس کے پہاڑ لگے رہتے۔ دریائے جہلم ہمارے گھر سے تقریباً 12 میل کے فاصلے پر تھا۔

ہمارے گاؤں میں ہندوؤں کے گھر بھی تھے، شاید 30، 40، یا 50 تھے۔ باقی گھروں میں سردار رہتے تھے، 20 سے 25 گھر برہمنوں کے تھے۔ ٹھوا ایک قصبے کی طرح تھا، بہت بڑا تھا۔ ہندوؤں کے اپنے کاروبار تھے، عام دُکانیں، کپڑے کی دُکانیں اور سینکڑوں دیگر چیزیں، وہی لین دین، سکھ سب کے سب بہت کٹر تھے، ان سب کو مہاراجا رنجیت سنگھ کے دَور سے اراضی کے پٹے ملے تھے۔ تشدد کی ایک بڑی لہر اٹھی تھی، زیادہ شدت راولپنڈی اور لاہور میں تھی۔ ایسا لگتا تھا، انھوں نے سب کچھ ایک دِن میں ہی ختم کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ قتل و غارت کا آغاز تو راولپنڈی شہر سے ہوا لیکن وہاں کوئی خاص نقصان نہ ہوا، اصل تباہی ارد گرد کے دیہات میں آئی۔ پہلے پہل روات میں گڑ بڑ ہوئی۔ وہاں تمھیں پتہ ہے گدھوں اور گھوڑوں کی منڈی تھی۔ تمھیں شاید منڈی کی زیادہ معلومات نہ ہوں، کیا تمھیں پتہ ہے؟ لیکن تم نہیں سمجھ سکتیں۔ بچے! وہ ایک میلہ تھا، جہاں دور دور سے لوگ آتے اور اپنے گدھے گھوڑے بیچتے۔ وہاں ایک تھانہ بھی تھا، پھر چوا (شاید چوآ کڑیالہ: مترجم) تھمالی، ٹھوا، نارا، بیوال—— انھوں نے

وہاں کسی کو نہ چھوڑا، وہ تمام اسلحہ بھی لے گئے... ہمارے پاس چار بندوقیں تھیں، وہ بھی ساتھ لے گئے۔ دو مرد ایسے تھے جن میں سے ایک سرکاری ملازم اور دوسرا فوجی تھا، دونوں چھٹی پر آئے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا، روات سے تشدد پنڈی، پھر دیگر دیہات تک پھیل گیا۔

☆☆☆

عورتوں کا اغوا ان سے زیادتی، ان کی لاشوں کی بے حرمتی، ان کے جنسی اعضا پر دوسرے مذہب کی علامات کندہ کرنا ـــــ ان اقدامات کی بین الاقوامی سطح پر مذمت کی گئی لیکن اس قسم کے تشدد کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ـــــ نہ خاندانوں نے، نہ حکومت اور نہ ہی مؤرخوں نے کچھ بتایا۔ اگرچہ یہ سب کچھ چھوٹے پیمانے پر نہیں ہوا تھا، سچ تو یہ ہو کہ ہر گاؤں میں ایسی کہانی موجود ہے، تھمالی گاؤں سے جان بچانے میں کامیاب ہونے والا گورمیت سنگھ اپنی روانگی کے بارے اس طرح بتاتا ہے:

> 12 مارچ کو منہ اندھیرے 4 بجے ہم روانہ ہوئے، ہمارے اپنے خاندان اور سب لوگوں کو ہم نے گورو دوارے میں جمع کیا اور ان کی حفاظت کے لیے چند مرد وہاں بٹھا دیے، ہم نے انھیں حکم دیا کہ تمام نوجوان لڑکیوں کو مار ڈالو، اور جہاں تک گورو دوارے کا تعلق ہے، اس پر تیل چھڑک کر اسے آگ لگا دو۔
>
> ہم نے آپس میں یہ فیصلہ کیا، ہم خود کو بہت بے یارو مددگار محسوس کر رہے تھے ـــــ کتنے لوگ جمع ہو گئے تھے، ہم مکمل طور پر محاصرے میں تھے۔ اگر اپنے ارد گرد دیکھیں تو چاروں اطراف میں لوگوں کا سمندر نظر آتا تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی مرد ہی مرد تھے۔ ظاہر ہے کہ آپ خوف زدہ ہوں گے ہی... لوگ ایک دوسرے کو جمع ہو کر تسلیاں دے رہے تھے لیکن ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم بالکل بے آسرا ہیں... ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا، جو کچھ تھا وہ لے گئے تھے۔ پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ گورو دوارے میں موجود لڑکیوں اور جوان عورتوں... دو یا تین مردوں کو انھیں ختم کرنے فریضہ سونپا گیا۔ جو گورو دوارے میں تھیں، انھیں وہیں زندہ جلانے کا فیصلہ

ہوا... پہلے ہم نے اپنے ہاتھوں سے جوان لڑکیوں کا خون کیا، مٹی کا تیل گوردوارے کے اندر ان پر چھڑکا گیا اور آگ لگا دی گئی... عورتیں اور بچے... وہ بھلا کہاں بھاگ سکتے تھے۔

کئی سال گزرنے کے بعد جیسے جیسے میں نے مردوں اور عورتوں سے بات چیت کی، مجھے اس نوعیت کا رسپانس ملا، اوپر والے بیان میں اخبار ''سٹیٹس مَین'' نے جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ وہی ہے جو مختلف خاندانوں نے میرے ساتھ ملاقات میں اختیار کیا تھا کہ انھوں نے اپنے مذہب کی ''حرمت'' بچانے کے لیے سینکڑوں خواتین کو ''شہید'' کر دیا۔ بسنت کور سے ملاقات کے بعد میں اس کے بیٹے بیر بہادر سنگھ سے بھی ملی۔ اس نے ٹھوا خاصلہ میں فرقہ وارانہ فسادات کی ہمیں نسبتاً زیادہ تفصیلات بتائیں۔

گلاب سنگھ کی حویلی میں 26 لڑکیوں کو لایا گیا۔ سب سے پہلے میرا والد سنت راج سنگھ اپنی بیٹی کو لایا اور اسے قتل کرنے کے لیے صحن میں لے گیا۔ سب سے پہلے اس نے پرارتھنا کی، اس نے ''ارداس'' کی اور بولا: ''سچے بادشاہ، ہم تمھاری سِکھی کو بے آبرو نہیں ہونے دیں گے۔ اس سلسلے میں اس کے تحفظ کے لیے ہم اپنی بیٹیوں کو قربان کرنے والے ہیں۔ انھیں شہید کا رُتبہ دے دو، ہمیں معاف کر دو۔

پھر ان میں سے ایک آدمی وہ تھا جو ہمارے گاؤں میں قلی کا کام کرتا تھا۔ وہ آگے آیا اور ... میرے باپ کے پاؤں پکڑ لیے اور کہا بھاپا جی، یہاں سے بھاگنے کے قابل نہیں ہوں، مسلمان مجھے پکڑ لیں گے اور مجھے بھی مسلمان بننے پر مجبور کر دیں گے۔ لہٰذا میرے باپ نے پورا کرپان کا وار کیا اور اس کا سر قلم کر ڈالا۔ پھر نند سنگھ دھیر میرے باپ سے مخاطب ہوا: راجا سنگھ خدارا پہلے مجھے شہید کر دو، کیوں کہ میرا بیٹا لاہور میں رہتا ہے... کیا تم سوچ سکتے ہو کہ مسلمانوں کو اپنی یہ داڑھی منڈوانے اور ایک شیخ (نومسلم) کی حیثیت سے لاہور جانے کی اجازت دے سکتا ہوں؟ اس بنا پر مجھے قتل کر ڈالو، میرے باپ نے اسے بھی مار ڈالا، اس نے دو افراد کا خون کیا اور تیسری میری بہن تھی، مان کور... وہ آگے آئی اور میرے باپ کے قدموں

میں بیٹھ گئی، میں بالکل اس کے دائیں جانب کھڑا تھا اور بچوں کی طرح اس کا کرتا کھینچ رہا تھا، میں اس کے ساتھ لپٹ رہا تھا... لیکن جب میرے باپ نے وار کرنے کے لیے تلوار اُٹھائی تو اس کے ذہن میں شاید کوئی شک یا خوف دَر آیا، یا شاید کرپان میری بہن کے دوپٹے میں اُلجھ گئی... کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، وہ ایسا دہشت ناک، ایسا خوف ناک منظر تھا۔ پھر میری بہن نے اپنے ہاتھ سے اپنے بال کھولے اور اپنی گردن آگے کر دی... اور میرے باپ نے پھر خود اس کا دوپٹہ ہٹایا اور کرپان کا وار کر کے اس کا سر تن سے جدا کر دیا... سر دور جا گرا۔ میں سیڑھیاں اُتر گیا، میں رو رہا تھا، کیوں کہ اس دوران میں مجھے مسلسل کرپان چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آخرکار 25 لڑکیوں کو قتل کیا گیا۔ انھیں کاٹ پھینکا گیا، ایک لڑکی، میرے تایا کی بہو جو حاملہ تھی... اسے قتل نہ کیا گیا اور بعد ازاں میرے تایا کے بیٹے نے اسے اپنے پستول سے گولی مار دی ـــــ لیکن وہ پھر بچ گئی۔ اس نے ہمیں کہا، مجھے قتل کر دو، میں نہیں بچوں گی۔ میرے پیٹ میں بچہ ہے وہ زخمی ہو گیا ہے۔ پیٹ میں ایک بڑا سوراخ تھا جہاں سے خون رِس رہا تھا، اس کا نام ہرنام کور تھا، پھر میرے ماں اور چچا وہاں مل بیٹھ کر غور کرنے لگے، ہرنام نے کہا: مجھے کچھ افیون دے دو، ہم نے اس کا بندوبست کیا، ان دِنوں لوگ افیم کھانے کے عادی تھے۔ ایک برتن میں ہم نے افیون تھوک کے ذریعے ملائی... اس نے کہا: جاپ جی صاحب پاٹ... بالکل ایسے جیسے... جاپ جی صاحب بھوگ، مکمل طور پر نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی موت کے لیے تیار تھی... یہ کام چند لوگ کر سکتے تھے... اس نے موت کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا اور وہ جب چاہتی موت کو گلے لگا سکتی تھی۔ اس نے تقریباً آدھ گھنٹے تک پاٹ کی... پھر جیسے ہی اس نے آخری اشلوک پڑھا اس کی سانس رُک گئی، وہ جانتی تھی اسے مرنا تھا... اسے کتنا کنٹرول تھا... موت پر۔

بعد میں بیر بہادر سنگھ کنویں میں عورتوں کے چھلانگ لگانے کے واقعے کا بھی

عینی شاہد ہوا، ان عورتوں نے اپنی غیرت کے امتحان کے بجائے زندگیاں دینا گوارہ کیا تھا، اس واقعے کو آج کل ایک فلم ''تمس'' میں بھی فلمایا گیا ہے، جس میں لمبی چوڑی پنجابی خواتین اپنے مذہب کی خاطر کنویں میں کود گئیں اور کنویں نے ہی ان کی قربانی قبول کر لی۔ حقیقت اس سے قطعی مختلف ہوگی۔ زندہ بچ جانے والوں میں سے زیادہ تر مرد ہیں، اس الم ناک واقعے کو ہیروانہ (heroic) اور غیرت کے پہلوؤں کے حوالے سے بیان کیا گیا۔ بیر بہادر کے الفاظ میں:

... کنویں پر سردارنی گلاب کور نے میری موجودگی میں کہا: ''سچے بادشاہ، ہمیں اپنی لڑکیاں بچانے کی توفیق دے... 25 لڑکیوں کو قتل کرنے کا واقعہ پہلے ہی رونما ہو چکا ہے—— وہ جانتی تھی کہ سنت راجا سنگھ نے اپنی بیٹیوں اور خواتین خانہ کو قتل کر دیا تھا... اب جو بچ گئی ہیں ہمیں ان کی عزتیں خطرے میں نہیں ڈالنا چاہئیں۔ ہمیں انہیں اغوا کرنے کی اجازت نہیں دینا چاہیے، لہٰذا کنویں پر باہمی مشاورت کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا اور پھر کہا: ہم پیاسی ہیں، ہمیں پانی دو، پس مسلمان انھیں کنویں پر لے گئے... میں اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ 25 خواتین کا واقعہ رونما ہو چکا تھا... اس طرح کنویں پر بیٹھتے ہوئے ماتا لاجونتی، جنھیں سردارنی گلاب کور بھی کہا جاتا تھا، انھوں نے دو لفظ کہے اور پھر کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ ان کے پیچھے تقریباً 30 عورتیں بھی کود گئیں... کنواں مکمل طور پر بھر گیا، ایک خاتون جس کا نام بسنت کور تھا، اس کے 6 بچے تھے، وہ بچ گئی۔ اس نے 4 دفعہ چھلانگ لگائی، لیکن کنواں تو بھرا ہوا تھا... وہ باہر آتی، پھر کود جاتی، پھر آتی دوبارہ چھلانگ لگاتی، وہ اپنے بچوں کو دیکھتی، پھر اپنی طرف نظر دوڑاتی... آج بھی وہ زندہ ہے۔

کئی دیہات میں حملہ آوروں اور محصورین میں مذاکرات بھی ہوئے۔ تھمالی سے تعلق رکھنے والے کلونت سنگھ نے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے، جس میں حملہ آوروں اور محصورین کے درمیان ایک سمجھوتے پر اتفاق ہوا کہ ہمیں جانے دیا جائے گا۔ کلونت سنگھ کے مطابق معاہدے میں 13 سے 16 ہزار روپے رقم اور اسلحہ حوالے کرنے پر اتفاق کیا

گیا۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد رات کو انھوں نے فائرنگ شروع کر دی، لہٰذا ہماری بہنوں اور بیٹیوں نے اپنی آبرو بچانے کے لیے—— ان کے رشتہ داروں، ہمارے ویروں نے عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالا... گورو دوارے میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اپنے ہی خاندانوں کے ہاتھ سے ماری جانے والی عورتوں کے بارے میں کوئی ریکارڈ دست یاب نہیں۔ مغوی عورتوں کے برعکس، یہاں مختلف خاندانوں نے عورتوں کی اموات کی رپورٹ درج نہیں کرائی کیوں کہ اس کے ذمہ دار وہ خود تھے۔ لیکن جہاں اغوا شدہ خواتین کو بعد میں خاموشی کی دُنیا میں دھکیلا گیا، وہاں اپنے ہی ہاتھوں مار دی گئی عورتوں کو شہادت کے رُتبے پر فائز کر دیا گیا۔

اجتماعی خودکشیوں اور اپنے ہی رشتہ داروں کے ہاتھوں مارے جانے والی عورتوں کی کہانیاں کثرت سے ہمارے اردگرد پائی جاتی ہیں۔ آج نصف صدی گزرنے کے بعد یہ کہانیاں اور دیگر داستانیں زندہ ہیں، انھیں نہ صرف سکھ مذہب کی مردانگی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے (اگرچہ یہ صرف عورتیں تھیں، جنھیں موت کا سامنا کرنا پڑا، ان کو اپنی زندگیاں قربان کرنے کا فیصلہ بھی مردوں کے ایما پر کرنا پڑا۔ اس عمل کو بہادری کے طور پر جانا جاتا ہے، کیوں کہ صرف اسی طرح وہ موت سے بدتر حالات سے ''بچ'' سکتی تھیں) بلکہ انھیں ان عورتوں کی دلیری کی مثال سمجھا جاتا ہے جنھوں نے ''اپنی مرضی'' سے زندگیاں قربان کر دیں۔ گورو دواروں میں ہر سال تعزیتی مجلسوں میں ان عورتوں کی بہادری اور قربانیوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جسے مرد، عورتیں اور بچے سنتے ہیں۔ انھیں ان کی بہنوں کے واقعات سنا کر ان کے ذہن بھی اس نہج پر ڈھالے جاتے ہیں کہ جب کبھی قوم، یا دھرم خطرے میں پڑ جائے، تمھارا فرض بالکل واضح ہے، تقسیم کے دوران میں مرنے والی کئی عورتوں کی قربانیوں کا راجپوتوں کی عورتوں کی بے انتہا قربانی سے موازنہ کیا جاتا ہے، جنھوں نے جنگ میں اپنے شوہروں کی ہلاکت کے بعد اجتماعی طور پر خود سوزی کر لی تھی۔ یہ بات خلاف معمول نہیں کہ اس واقعے کا تعلق قربانی سے جوڑ لیا جائے۔ جہاں عورتوں کی شہادت کا تذکرہ ہوتا ہے وہیں ان خواتین کا ذکر بھی ہوتا ہے جن کی زندگیاں بچا لی گئیں۔ اگرچہ واضح طور پر اعتراف نہیں کیا جاتا، البتہ بچ جانے والی عورتوں کو قربانی والیوں کے مقابلے میں ''کم تر'' سمجھا جاتا ہے۔ اس سوال کہ ٹھوا

خالصہ میں 90 عورتوں کی اجتماعی ''خودکشی'' کے بعد کوئی خاتون باقی بچی تھی، کے جواب میں بیر بہادر سنگھ نے کہا:

> ...ہاں کئی عورتیں بچ گئی تھیں، ہماری رشتہ دار خواتین میں سے اکثر مر گئی تھیں، پھر کئی نے کنویں میں چھلانگ لگا دی تاہم باقی ماندہ خواتین کو بچا لیا گیا تھا کیوں کہ مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ وہ خودکشی کر رہی ہیں۔ وہ جنھوں نے قربانی دی... اگر ہمارے خاندان کی خواتین نے قربانی نہ دی ہوتی اور وہ جنھوں نے کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی جان دی ایسا نہ کرتیں تو باقی بچنے والی عورتیں کبھی زندہ نہ رہ سکتیں۔

وہ جو زندہ بچ گئیں، آج حیات نہیں ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ بیر بہادر سنگھ یا دیگر کئی مردوں کے نزدیک لفظ ''زندہ رہنا'' کے معنی زیادہ اہم نہیں (بالخصوص جس کا تعلق خواتین سے ہو۔ ان عورتوں کا کیا بنتا اگر کچھ عورتوں نے اپنی زندگیاں داؤ پر نہ لگائی ہوتیں؟ امکان تھا کہ انھیں اغوا کیا جاتا، ان سے زیادتی کی جاتی اور عین ممکن تھا کہ انھیں تبدیلی مذہب پر مجبور کر دیا جاتا۔ ان سب کو موت کا سامنا کرنا پڑتا لیکن کچھ خواتین کی قربانی نے باقی عورتوں اور مردوں کو بچا لیا۔ یہ منطق پیش کی جاتی کہ اس عظیم قربانی کی قوت کو جارح افراد بھی ماننے پر مجبور ہو گئے، جب انھوں نے دیکھا کہ وہ عورتیں کتنی طاقت وَر ہیں۔ اپنے مذہب کی عزت کے تحفظ کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں تو وہ پیچھے ہٹ گئے اور اس عظیم قربانی کے ذریعے انھوں نے اپنی زندگی سے ہاتھ نہیں دھوئے—— بلکہ انھوں نے ایک طرف تو شہادت پا کر دائمی زندگی پا لی، دوسری طرف پورے مذہب کی لاج رکھ لی۔ ان واقعات کے حوالے سے یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ کسی مذہب کی غیرت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی عورتوں کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔ عام حالات میں مرد اپنی عورتوں کی آبرو کا تحفظ کر کے اس ذمہ داری سے عہد برأ ہو سکتے ہیں۔ لیکن غیر معمولی حالات میں مردوں کو انتقامی حملوں کے ذریعے خواتین کی حرمت کی حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ بیر بہادر نے کہا: ''میرے باپ نے تو پہلا قدم اُٹھایا اور باقی کا سارا کام سردارنی لاجونتی... ماتا لاجونتی... نے کیا۔ اس نے اپنی زندگی قربان کر کے باقی تمام سکھوں کو بچا لیا—— اس کی تقلید میں ایک سو لڑکیوں نے خودکشی کی۔

اور اس طرح معاملات ہمیشہ یونہی آسان ثابت نہیں ہوتے کیوں کہ جب وہ ان کے بچاؤ کے لیے آتے ہیں تو دیگر کئی قسم کے دلائل سر اٹھا لیتے ہیں، تاہم ہر کیس میں مشترکہ فیکٹر خواتین کے زخموں پر مرہم رکھنا تھا۔ کئی دیہات میں جہاں مذاکرات ہوئے وہاں اکثر آزادی کے لیے عورتوں کی تجارت کی گئی۔ ٹھوا خالصہ میں بچنے والے بتاتے ہیں کہ گاؤں میں ایک ایسی عورت تھی جس کے مراسم ایک مسلمان سے تھے۔ حملے شروع ہونے سے قبل حملہ آوروں نے کہا: اس عورت کو ہمارے حوالے کر دیا جائے تو پورے گاؤں کو آزادی دے دی جائے گی۔ جیسا کہ بیر بہادر کہتا ہے:

> ...یہ ویسے ہی تھا، جب لڑائی پوری طرح چھڑ گئی تو صلح کی کوششیں بھی کی گئیں۔ آخر کار لڑائی کا مطلب ہے صلح! لہٰذا مسلمان معاملہ فہمی کے لیے آئے، انھوں نے پیش کش کی: اگر وہ لڑکی ان کے حوالے کر دی جائے تو ہم سب کو گھروں میں رہنے اجازت دے دی جائے گی۔ وہاں ایک مسلمان تھا، وہ بہت طاقت وَر تھا، وہ لوفر قسم کا انسان تھا اور کھیتی باڑی کرتا تھا۔ لیکن اس لڑکی کا طلب گار تھا۔ اس کے اس لڑکی سے بعض نوعیت کے مراسم تھے۔ وہ مُصِر تھے: اگر ہم لڑکی ان کے حوالے کر دیں تو وہ واپس چلے جائیں گے اور (لوگ آپس میں چہ می گوئیاں کرنے لگے: کہ وہ لڑکی تو بہت خراب ہے۔ اس کے اس مرد سے تعلقات ہیں۔ اس کو اپنے ساتھ رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟ تمھیں پتہ ہے نا جب زندگی بچانا ہو تو پھر کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی: مصنفہ) لہٰذا اسے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا... وہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ آخر لڑکی کیا چاہتی ہے، اصل مسئلہ گاؤں کی غیرت کا تھا۔

بالآخر وہ عورت مسلمانوں کے حوالے نہیں کی گئی۔ مذاکرات ناکام ہو گئے۔ بعد ازاں وہ مسلمان اسے اُس ٹرانزٹ کیمپ سے لے گئے جہاں ٹھوا خالصہ کے زندہ بچ جانے والے مکین پناہ گزین تھے۔ ہر لحاظ سے وہ اپنی مرضی سے گئی تھی اور بالآخر مسلمان خاندان میں شادی کر لی۔ اپنی پوری کہانی میں بیر بہادر مسلسل مردوں اور عورتوں کی قربانیوں کا ذکر کرتا رہا۔ بالخصوص اپنے خاندان کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ، اس کے اہل خانہ اور دیگر

زندہ بچنے والے یہی کہتے ہیں کہ ان کی زندگی مرنے والوں کی وجہ سے ہے۔

ہمارے چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں، ایک شخص کیا کر سکتا ہے؟ میرے خیال میں وہ تمام لوگ بہت قابل احترام ہیں جنھوں نے اپنے بچے قتل کیے، جو کنویں میں کود گئے، اور انھوں نے ہمیں بچا لیا... آپ شہید ہونے والے کسی شخص کے خاندان کو لے لیں، آپ محسوس کریں گے کہ اس میں اضافہ ہوا ہے۔ خون ایک ایسی ہی چیز ہے، اس طرح ان کے زیر استعمال چیزیں بھی اہم ہیں۔

اس وقت کو یاد کرتے ہوئے اس نے کہا: آج بھی جب میں یاد کرتا ہوں... میں رو پڑتا ہوں، میرا دل روشن ہو جاتا ہے۔ ایک باپ جو اپنی بیٹی کو قتل کرتا ہے، وہ کتنا شکستہ دل ہوا ہوگا! کتنی بے بسی اس نے محسوس کی ہوگی!!

میرے نزدیک وجہ نزاع یہ نہیں کہ وہ عورتیں جو اپنے خاندان والوں کے ہاتھوں یا فسادات میں ماری گئیں، تمام متاثرین تھیں، جنھیں زبردستی اپنی جانیں لینے پر مجبور کر دیا گیا، یا انھیں اپنے ہی قبیلے کے افراد نے قتل کر ڈالا، یا پھر وہ ایک قسم کے مذہبی اتفاق رائے کے تحت اپنے مردوں یا بزرگوں کے فیصلے کا شکار ہوئی تھیں، لیکن ہم آخر کس طرح ان واقعات کی ''سچائی'' جان سکیں گے؟ اگر اغوا شدہ خواتین کو دیکھا جائے تو ہمیں ایسا کوئی راستہ نہیں ملتا جس کے ذریعے ہم با آسانی ان عورتوں کی آوازوں کا پتہ چلائیں۔ بسنت کور کو چھوڑ کر اوپر میں نے جو حوالہ جات بیان کیے ہیں وہ تمام مردوں کی زبان سے بتائے گئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے ہم ان آوازوں کے ذریعے خواتین کے محسوسات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں مرضی اور زبردستی کے درمیان لکیر اس سے زیادہ خوف ناک ہے جتنا کہ ان حوالہ جات سے عکاسی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر بیر بہادر سنگھ نے ان چند خواتین جنھوں نے کنویں میں چھلانگ لگائی لیکن بچ گئیں کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ ان میں اس کی ماں بسنت کور بھی شامل تھی۔ لہٰذا جب بسنت کور نے اس واقعے کو اپنی زبان سے بیان کیا تو شروع میں ہمیں اس کا یقین نہیں آیا، تاہم بعد ازاں جب اس کی تصدیق ہوگئی کہ یہ وہی خاتون ہے۔ میں صرف یہ

اندازہ لگا سکی ہوں کہ بیر بہادر سنگھ یہ بتانے میں بہت شرم اور بے عزتی محسوس کرتا ہے کہ اس کی ماں قربانی دینے والی عورتوں میں شامل نہیں۔ اس کی بہ نسبت اسے اپنی بہن کا ذکر کرنا بہت ہی آسان لگا، جس نے ''آبرومندانہ موت'' قبول کی۔ ٹھوا خالصہ اور اس کے گرد ونواح میں مسلمانوں کے حملے 8 روز تک جاری رہے اور آخری روز اجتماعی طور پر کنویں میں ڈوبنے کا واقعہ پیش آیا۔ ان چند ایام میں گاؤں کا تقریباً ہر شخص آگاہ تھا کہ کن معاملات پر بحث جاری ہے۔ جیسا کہ زندہ بچ جانے والے لوگ بتاتے ہیں، اگرچہ ان بحثوں میں زیادہ کردار مردوں کا تھا، تاہم چند عورتیں بھی اس میں شامل تھیں۔ ان ممتاز عورتوں میں سردارنی گلاب کور، جسے ماتا لاجونتی کے نام سے بھی جانا جاتا تھا، گاؤں کی اہم ترین شخصیت تھیں۔ وہ اس طرح ممتاز خاتون تھی جیسے اس کا شوہر گلاب سنگھ تھا۔ بچنے والے لوگ بتاتے ہیں، نہ صرف اس خاتون نے فیصلہ کیا بلکہ ''بلا خوف و خطر'' عورتوں کو اس کنویں کی طرف لے گئی۔ اس طرح اس نے ایک جرأت مند، دلیر اور بہادر پنجابی خاتون کی روایت برقرار رکھی۔ اگر عورتیں بھی گاؤں میں چلنے والی بحثوں سے آگاہ تھیں، بلکہ اس میں شامل تھیں تو کیا پھر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان کا اپنی زندگیاں ختم کرنے کا فیصلہ دراصل اپنے مذہب کے بہترین مفاد میں تھا؟ کیا ان کی اموات مذہبی نظریے سے ہم آہنگ تھیں ـــــ اور کیا وہ اس نظریے کا حصہ تھیں؟ ـــــ کہ ایک مذہب کی عزت و وقار اس میں ہے کہ وہ ''بیرونی'' مذہب کے مردوں سے اپنی عورتوں کو ''بچائیں''۔ یہاں فطری محافظ بُنیادی طور پر مرد ہوتے ہیں لیکن اس صورت حال میں وہ بھی بے دست و پا تھے، اور عورتوں کو تحفظ دینے کے قابل نہیں تھے۔ چونکہ خواتین اس بات کو جانتی تھیں، تو پھر کیا کوئی یہ تجویز کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے لوگوں کی غیرت بچانے کے لیے اپنی زندگیاں قربان کر سکتی تھیں؟ تو پھر مذہبی اتفاق رائے کے وہ مشترکہ متاثرین اور ایجنٹ کہاں ہیں جن سے میں نے اوپر والی بات چیت کی؟ ان کے فیصلوں میں ''مرضی'' کہاں شروع ہوتی ہے اور کہاں زبردستی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ان کی خامشی کہاں چھپی ہے؟

کیا ان واقعات کی سچائی جانچنے کا کوئی تسلی بخش راستہ موجود ہے؟ بہرحال اس حوالے سے کوئی چوائس اتنی آسان نہیں اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس واقعہ کو دراصل یہ

شکل میری مداخلت کے باعث ملی۔ اب بھی میرے نزدیک یہ واقعہ اور اس جیسے دیگر واقعات اس لیے اہم ہیں کہ یہ مرضی اور زبردستی کے سوال پر روشنی ڈالتے ہیں اور یہ کہ کیا عورتیں نشانہ بنیں یا اپنی قسمت کا فیصلہ انھوں نے خود کیا۔ مجھے یہ حقیقت جان کر دھچکا پہنچا کہ تقسیم کے حوالے سے تفصیلات میں ایسے واقعات کو پُرتشدد واقعات کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ دوسری طرف ہم اس وائلنس کو چھو کر نہیں گزرے جو ہمارے اندر خاندانوں کے درمیان، برادریوں کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ اس کی جگہ ان واقعات کو بہادرانہ فعل، مسلط کردہ تشدد بلکہ زبردستی قرار دیا گیا، جن کے نتیجے میں کئی عورتوں کو موت کے منہ میں جانا پڑا۔ ہم نے کبھی مزید تشدد کے ممکنہ نتائج کے بارے میں غور کیا نہ برسوں پر محیط ان کی اہمیت کا سوچا، جس کے باعث مزید تشدد کو ہوا ملی۔

تقسیم کے دوران میں نظر آنے والے تشدد کے بارے میں ایک دیومالائی تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ یہ زیادہ تر مردوں سے متعلق تھا، اور یہ کہ عورتیں فرقہ وارانہ نفرت کا شکار ہوئیں، وہ اس کا حصہ تھیں نہ کسی کی آلہ کار۔ اس موقف کا بیشتر حصہ اس پیش گوئی پر مبنی ہے یعنی ہم تشدد کو کس طرح لیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تشدد یا فسادات کے بارے میں ہمارا عقیدہ اتنا مذہبی نوعیت کا ہے کہ ہمارے لیے اس میں خواتین کے حوالے سے پہلو تلاش کرنا مشکل ہے، کیوں کہ گھریلو امور کے نگرانوں کو فساد برپا کرنے والی مخلوق سمجھنا مشکل ہے۔ ٹھوا خالصہ میں مرنے والی عورتوں نے خود موت کا ''انتخاب'' کیا تھا یا نہیں، اس سے قطع نظر یہ واقعہ اگرچہ مختلف تھا مگر پُرتشدد نہیں، جس کو ایک آدمی تقسیم کا مرئی اور معمول کے مطابق عمل قرار دے سکتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر خاندان اور مذہب کی سرحدوں سے بہت دُور تشدد کا مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔ تشدد کا تعلق ''دوسرے'' سے جوڑا جاتا ہے۔ یہاں ایک اور اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ہندو اور سکھ مذہب کی کئی عورتوں نے اپنے ہم مذہب مردوں کو اپنے منصوبہ کاروں کے روپ میں دیکھا—— اور جہاں ''رضا کارانہ'' خودکشیاں ہوئیں، وہاں بڑے پیمانے پر قتل بھی کیے گئے۔

خواتین کو اپنے ہی خاندان، اپنے ہی مذہب دونوں کے تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ میں فیملی اور کمیونٹی وائلنس کی اس بحث کا اختتام ایک خاتون پرکاش ونتی کی کہانی

سے کروں گی جس سے میری ملاقات جالندھر کے گاندھی وِنیتا آشرم میں ہوئی۔ پرکاش ونتی کی کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے:

وہ، اس کا شوہر اور چھوٹا بچہ شیخوپورہ میں رہتے تھے۔ 1947ء میں وہ کوئی 20 سال کی ہوگی۔ جب تقسیم ایک حقیقت نظر آنے لگی تو اس کے گاؤں کے ہندو بچاؤ کے لیے ایک رائس مل میں جمع ہوئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وہاں حملہ ہوگیا اور حملہ آوروں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ اس کا شوہر اس کے پاس آیا اور تجویز دی کہ وہ اسے (پرکاش کو) قتل کر دے، ورنہ وہ تمھیں ''بے آبرو'' کر دیں گے۔ اس کے بعد اسے بہت کم یاد آتا ہے، صرف یہ یاد ہے کہ شوہر نے اس پر وار کیا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ صاف ظاہر ہے حملہ آور اسے مردہ سمجھ کر چلے گئے اور جب وہ ہوش میں آئی تو اپنی 2 لڑکیوں کے ساتھ بوریوں کے پیچھے چھپ گئی اور حملہ آوروں کی واپسی کا انتظار کرنے لگیں۔ بعد میں پرکاش ونتی کو اپنے شوہر اور بچے کی لاشیں مل گئیں جو دیگر لاشوں کے ساتھ وہاں پڑی تھیں۔ میں نے پوچھا تمھیں شوہر پر غصہ نہیں آیا؟ وہ بولی: ''وہ آخر کیا کرتا، وہ اکیلا تھا۔'' اس نے اگرچہ اپنے شوہر کا دفاع نہیں کیا لیکن اس کے اس فعل کی ''منطق'' ضرور پیش کر دی۔ مجھے اکثر حیرانی ہوتی ہے کہ یہ وہی عورتیں ہیں جن کے بارے میں مَیں ذکر کر رہی ہوں، ایسی رائے رکھتی ہیں، لیکن دوسری طرف ان کے لیے جو آج ان کہانیوں کو ہیروازم، بہادری، قربانی، غیرت کے طور پر یاد کرتی ہیں، یہ ایک حقیقت پسندانہ ایجنڈا ہے۔

جیسا کہ ہم سانحہ ٹھوا خالصہ میں کام آنے والے افراد کی یاد میں تعزیتی جلسوں میں دیکھتے ہیں، مردوں کے لیے ان کی خواتین کی طرف تشدد (voilence) پر آمادگی کو مختلف انداز میں دیکھا جاتا ہے، اس طرح خواتین کو تشدد پسند مخلوق کے روپ میں نہیں دیکھا جا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افعال کو ہیروانہ اقدام، بہادری جیسے الفاظ دیے جاتے ہیں۔ ایسے بیانات کا مقصد عورتوں کو ان کی اوقات میں دیکھنا ہوتا ہے۔ اسی لیے انھیں (non voilent) قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے افعال کو قربانی کے آرام بخش الفاظ پہنائے جاتے ہیں۔

حصہ سوم

بیر بہادر سنگھ

''تم شہید ہونے والوں کا خاندان دیکھ لو، تم دیکھو گے کہ اس کی نسل جڑ پکڑے گی اور پھلے پھولے گی...''

میں نے اوپر جو الفاظ بیان کیے ہیں وہ بیر بہادر سنگھ کے ہیں جس سے کتاب پڑھنے والا اب تک خوب آشنا ہو چکا ہوگا۔ میں نے یہاں اس کے انٹرویو کی مکمل تفصیل دینے کی کوشش کی ہے، کیوں کہ اس نے کئی ایسی باتیں کی ہیں جن سے میں چونک گئی اور وہ مجھے بہت اہم محسوس ہوئیں۔ ان باتوں کا میں نے اوپر ذکر نہیں۔ یہ انٹرویو 1990ء میں دہلی میں ہوا۔ اس وقت بیر بہادر 60 کے پھیرے میں تھا۔ دیگر کئی لوگوں کی طرح بیر بہادر سے بھی میری ملاقات اتفاقیہ ہوئی۔ کئی ماہ سے میں اور سدیش مختلف لوگوں سے رابطے اور ملاقاتیں کر رہے تھے۔ ہماری توجہ راولپنڈی میں مارچ 1947ء کے فسادات میں زندہ بچ جانے والوں پر مرکوز تھی۔ یہ لوگ ان دِنوں دہلی میں بھوگل اور جنگ پورہ میں رہائش پذیر تھے، اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، آپ کسی کمیونٹی کے ایک شخص سے باتیں کر رہے ہوں تو کوئی آپ کو ایک اور آدمی کے پاس لے جاتا ہے، وہ کسی اور سے رابطہ کرا دیتا ہے۔ اس طرح معاملہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پہلے کسی نے ہمیں بیر بہادر کی ماں بسنت کور کا پتہ دیا، وہ بھوگل کے ایک گھر میں رہتی تھی۔ اس کے ساتھ انٹرویو کے دوران میں ہماری ملاقات بیر بہادر سے ہوگئی۔ لمبا چوڑا، گٹھے وجود اور گھنی داڑھی والا بیر بہادر دہلی میں ایک چھوٹا مگر کامیاب جنرل سٹور چلا رہا تھا۔ جن لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی ان میں سب سے زیادہ بیر بہادر سیاست میں براہِ راست ملوث تھا۔ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کا رُکن ہونے کے علاوہ وہ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد کے فسادات سے متاثرہ سکھ خاندانوں کی سرگرمی سے مدد کرتا رہا۔ اس طرح اس کے سکھ سیاست دانوں سے مسلسل روابط تھے۔ 1984 کے بعد جنم لینے والے شکوک وشبہات کے تحت اسے بھی گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اسے دہشت گرد کا الزام دیا

گیا۔ اس نے انٹرویو میں واقعے کی مکمل تفصیل بتائی ہے اور نہایت مایوسی اور بے بسی سے اس احساس بے وفائی کا اظہار کیا جو 1984ء کے بعد اکثر سکھوں کی زبان پر تھا۔ بیر بہادر اور اس کے اہل خانہ نے 1984ء میں خاصا نقصان برداشت کیا۔ اس کے انٹرویو میں احساسِ بے وفائی کی دو وجوہات ملتی ہیں: ایک تو وہ قصور وار نہیں تھے، اور پھر بھی انھیں سزا ملی۔ دوسرے یہ کہ حکومت نے ان لوگوں کے لیے کچھ نہیں کیا جن کے خون سے آزادی حاصل ہوئی۔ اس سے اُس کی مراد یہ ہے کہ وہ سکھ جو تقسیم کے بعد بھارت آئے اور انھوں نے ''دوسرے لوگوں'' سے لڑائی کی اور اپنے خاندانوں کی قربانی دی۔ اس کے باپ کی طرح دیگر سکھ جن کا ذکر اس انٹرویو میں ایک متاثرہ شخص کے طور کیا گیا ہے، نے اپنے ملک اور مذہب کی غیرت کے لیے اپنے ہی خاندانوں کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ بالکل اسی طرح اس کی بیٹی مان کور تھی جس نے سکھ کاز کے لیے اپنے باپ کے ہاتھوں اپنی گردن کٹوائی اور شہید کا درجہ حاصل کیا۔

جب میں نے پہلی بار بیر بہادر کی کہانی سنی اور اس کے بعد ہر بار جب بھی میں نے اس کا مطالبہ کیا، مجھے اس کے بعد ہر بار جب بھی میں نے اس کا مطالعہ کیا، مجھے اس کی باتوں میں عورتوں کی موت کے حوالے سے درد، فخر اور احساس زیاں محسوس کر کے جھٹکا سا لگا۔ اس کی بہن مان کور جس نے اپنے باپ کے ہاتھوں اپنا سر کٹوایا، نہ صرف ایسی عورت ثابت ہوئی جس نے اپنے مذہب کی حرمت کے لیے جان قربان کی بلکہ اس نے وطن کی آزادی کے لیے بھی اپنا خون بہایا۔ اس کی یاد میں مقامی گوردوارے میں جو تقریب ہر سال ہوتی ہے، اس میں بیر بہادر ان عورتوں کی تفصیل بتاتا ہے جنھوں نے خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ بیر بہادر سنگھ کے نزدیک انہی بہادرانہ کاموں نے ٹھوا خالصہ کو ارد گرد کے دیگر سکھ دیہات سے ممتاز کر دیا۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ ٹھوا خالصہ کے مردوں نے اپنی عورتوں کو اغوا کرنے کی اجازت نہیں دی، اور یہ کہ انھوں نے بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا، اس کی بجائے انھوں نے خواتین کو شہادت کی ترغیب دی۔

بیر بہادر سے ملاقاتوں میں ایک موقع پر ہم وہ کتاب بھی اپنے ساتھ لے گئیں جس کا میں نے پہلے حوالہ دیا تھا۔ کتاب میں پاکستان میں اغوا ہونے والی عورتوں

MashalBooks.com

کی ضلع بہ ضلع فہرست دی گئی ہے۔ ہم اس سے اس کتاب کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھیں کہ کیا وہ اس میں شامل کسی نام کو پہچانتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہم ایسا کر سکتے بیر بہادر نے پورے وثوق سے کہا کتاب میں ٹھوا خالصہ کا کوئی نام نہیں۔ یہ اگرچہ درست نہیں تھا، دیگر دیہات کی طرح ٹھوا خالصہ کا ذکر بھی کتاب میں موجود تھا۔ تاہم ہم نے محسوس کیا کہ گاؤں کی عورتوں کی شہادت کو مبنی برحق ثابت کرنے کے لیے اس کا یہ تردید کرنا ضروری تھا کہ گاؤں میں کسی سے ریپ (rape) ہوا یا کوئی عورت اغوا کی گئی۔ اگرچہ اس شہادت کا خاص مقصد ریپ اور اغوا سے بچنا تھا تاہم اگر اس کا کہیں وقوع ہو گیا تو بھی اس کی نشان دہی نہیں کی گئی۔ اس طرح کی اموات گویا ضائع ہو گئیں۔

بیر بہادر کے بیانات میں کسی قسم کا احساسِ سرزنش، یا اپنے ہی لوگوں کو ہلاک کرنے کی منطق کا کوئی جواز فراہم نہیں کیا گیا۔ تقسیم کے متعلق کہی جانے والی کہانیوں میں ایک اور بات کا اکثر ذکر ملتا ہے کہ لوگوں نے آزادی کے لیے بیٹیوں کا تبادلہ کیا۔ بیر بہادر بھی ایک ایسی کہانی سناتا ہے جس میں گاؤں والوں نے اپنے بچاؤ کے لیے ایک لڑکی مسلمانوں کے حوالے کر دی۔ وہ کہتا ہے، ''جب زندگی بچانے کا معاملہ ہو تو اور کوئی چیز اہم نہیں رہتی۔'' بیر بہادر کے باپ نے، جس نے اپنی لڑکیوں اور عورتوں کو ''شہید'' کرنے کا فیصلہ کیا، گاؤں والوں کو اس اقدام سے روکا تھا۔ میں اس نکتے پر چونک گئی کہ بیر بہادر اس تمام صورت حال میں اپنے باپ کو مجبور اور خدا کی مرضی پر چلنے والا قرار دیتا ہے۔ جب اس نے اپنی بیٹی کو قتل کرنا چاہا تو پہلی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے دوسری بار کوشش کی اور کامیاب رہا۔ بیر بہادر کی نظر میں دونوں باپ اور بیٹی جانتے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ دونوں میں کسی لفظ کا تبادلہ نہیں ہوا۔ ''گفتگو کے لیے صرف کرپان کی زبان کافی تھی۔''

بیر بہادر بار بار ان چیزوں کا ذکر کرتا ہے جن کا تعلق ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے تھا۔ وہ تقسیم کا ذمہ دار ہندوؤں کو قرار دیتا ہے جو اس کے مطابق (اس میں سکھوں کو بھی کسی حد تک شامل کرتا ہے) مسلمانوں کو کتے کے برابر درجہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ اپنی زندگی کے آنے والے برسوں میں بیر بہادر نے سیاست میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ میں پچھلے کئی برسوں سے دوبارہ اس کے ساتھ نہیں ملی لیکن میرا خیال ہے ان دِنوں

وہ بی جے پی (بھارتیہ جنتا پارٹی) کا رُکن ہے، اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ابتدا میں ہندو مسلم تعلقات پر کھلے دُلّے خیالات رکھنے کے باوجود وہ بی جے پی کے اس پرانے مؤقف سے کیوں اتفاق کرتا ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ پورے انٹرویو کے دوران میں مَیں اس تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال سے حیران ہوتی رہی۔ پہلے اس کی طرف سے ہندوؤں کی شناخت اور ان کے مسلمانوں کے ساتھ رویے کا اعتراف، پھر اس کے اندر سکھ شناخت کا بڑھتا ہوا احساس اور ہندو ملک میں اجنبی ہونے کا تاثر، پھر مسلمانوں کے ساتھ تقسیم کے عمل کے بعد کا احساس اور اس کا یہ خوف کہ اب وہ زیادہ آبادی کی بنا پر بھارت پر قبضہ کر لیں گے، اس کے نتیجے میں اس کی سیاسی وابستگی اور اس کی مذہبی شناخت ہے۔ میرے نزدیک ان تمام وجوہات کی بنا پر یہ انٹرویو کافی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

بیر بہادر سنگھ

میرا نام بیر بہادر سنگھ ہے۔ میرے باپ کا نام سنت راجا سنگھ ہے۔ میرا گاؤں ٹھوا خالصہ ہے جو ضلع راولپنڈی کی تحصیل کہوٹہ میں ہے۔ ہمارا گاؤں ضلع راولپنڈی میں واقع ہے اور پورے ضلع میں ایک بڑا گاؤں ہونے کے ناتے گوجر خان کے بعد اسے ماڈل گاؤں سمجھا جاتا تھا۔ وہاں ہول سیل دُکانیں اور اندازاً 50، 60 بڑے تاجر تھے، اور ہمارے اردگرد جو چھوٹے دیہات تھے ان میں کوئی دُکان نہیں تھی۔ یہ مسلمانوں کے گاؤں تھے، یہی وجہ تھی کہ ہر کوئی خریداری کے لیے ٹھوا خالصہ آتا۔ اس طرح جتھوں کے جتھے وہاں آتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک مسلمان گاؤں کی عورت ٹھوا خالصہ آتی تو وہ تھوڑی تھوڑی چیزیں خریدنے کے بجائے پورے مہینے کا راشن اور دیگر اشیا خریدتی، کیوں کہ اس کا گاؤں کافی دُور ہوتا تھا اور 20، 25 کے لگ بھگ مرد اور عورتیں اکٹھے ہو کر اشیائے ضرورت خریدنے وہاں آتے۔ ٹھوا خالصہ میں بالکل ایک قصبے کی طرح اچھی خاصی رونق ہوتی۔ یہاں کی ایک بڑی چیز سنت اوتار سنگھ جی تھے جو مستاوانا صاحب سے آئے تھے۔ انھوں نے یہاں گوردوارہ دُکھ بھجنی صاحب (Dukh Bhajni Sahib) بنوایا تھا، جو بہت مقدس اور مشہور تھا اور دور دراز سے لوگ یہاں آتے تھے۔ ہر سال

یہاں ایک میلہ ہوتا تھا جس میں ہزاروں ہندو اور سکھ جمع ہوتے تھے، حتیٰ کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد بھی جمع ہو کر اس بزرگ کو خراج عقیدت پیش کرتی۔ جس جگہ ٹھوا خالصہ سے میرا تعلق تھا وہاں قریب ہی ایک اور گاؤں سینتھہ (Saintha) تھا، جہاں 30، 40 خاندان آباد تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور چھوٹے دیہات تھے۔ سینتھہ میں میرے باپ کی دُکان تھی اور میری ابتدائی پرورش اسی گاؤں میں ہوئی۔ میرے اُستاد مسلمان تھے اور صرف ہمارا گھر چھوڑ کر باقی تمام گھرانے مسلمانوں کے تھے... ہمارے علاقوں میں وہ لوگ جو قصبوں میں رہتے تھے وہ ارد گرد کے چھوٹے دیہات میں چلے جاتے اور نہ صرف وہاں چھوٹی موٹی دُکان کھول لیتے بلکہ بعض اوقات اپنا کنبہ بھی وہیں لے جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مجھے وہاں سکول میں داخل کرایا گیا تو میں نے پہلی سے پانچویں جماعت تک وہیں پڑھائی کی... وہاں ایک مسلمان عورت تھی، ہم اسے دادی، دادی کہہ کر پکارتے تھے، اس کا نام ماں حسینی تھا اور میرا معمول تھا کہ میں جا کر اس کی گود کی ایک طرف بیٹھ جاتا جب کہ اس کی اپنی پوتی دوسری طرف بیٹھی ہوتی۔ میں اس لڑکی کی چُٹیا کھینچتا تو جواباً وہ میرا جوڑا پکڑ کر کھینچتی اور مجھے گود سے ہٹانے کی کوشش کرتی۔ میں کہتا یہ میری دادی ہے، وہ کہتی، نہیں یہ میری دادی ہے۔ ذرا دیکھنا: اس وقت لڑکی بہت چھوٹی تھی جب ہم نے کھیلنا شروع کیا، میں پانچویں میں تھا اور وہ عمر میں مجھ سے چھوٹی تھی اور اب تو اس کا بیٹا جوان آدمی ہے۔ وہ دُہئی میں تھا اور مجھے خط لکھتا تو ماموں جی کہہ کر پکارتا۔ اس لڑکی کے بیٹے کی عمر اب 40 سال ہے۔ اس نے اپنے ننھیال کے گھر پر میرا خط دیکھ کر پوچھا کہ یہ آدمی کون ہے۔ اس کے ماما نے اسے بتایا کہ یہ تمھارا ماما ہے۔ ہمارے درمیان اتنے اچھے تعلقات تھے۔ جب کبھی ہمارے ہاں کوئی تقریب ہوتی تو ہم مسلمانوں کو بھی اس میں مدعو کرتے۔ وہ ہمارے گھروں میں بیٹھ کر کھاتے لیکن ہم ان کے گھر جا کر کچھ نہیں کھاتے تھے، اور یہ بہت بُری بات تھی، جس کا احساس مجھے اب ہوتا ہے۔ اگر وہ کبھی ہمارے گھر آتے تو ہم نے ایک کونے میں 2 برتن رکھے ہوتے، ہم ان سے کہتے، انھیں اُٹھاؤ اور کھانا کھاؤ۔ پھر وہ کھانا کھا کر خود ہی برتن دھوتے اور انھیں واپس اسی جگہ رکھ دیتے۔ یہ کتنی خوف ناک بات تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ ہم جب ان کے گھروں میں جاتے اور شادی یا دیگر

تقریبات میں شرکت کرتے تو وہ ہماری دل سے عزت اور احترام کرتے اور ہمیں سبزی، دال، چکن، حتیٰ کہ مٹن کچی حالت میں دیتے۔ ہمارا ان کے ساتھ برتاؤ اتنا گھٹیا تھا کہ مجھے بتاتے شرم آ رہی ہے۔ ایک مہمان ہمارے گھر میں آتا ہے اور ہم اسے کہتے ہیں کہ وہ برتن لاؤ اور دھو ڈالو۔ ہماری کوئی ماں یا بہن انھیں روٹی دینے لگتی تو ایک فاصلے سے روٹی کو ان کی طرف پھینک دیتی۔ انھیں اس کا خوف ہوتا مبادا پلیٹ سے ان کا ہاتھ لگنے سے وہ پلید ہو جائیں... مسلمان ہم سے نہایت اچھا سلوک کرتے اور ہم ان کے ساتھ کتنے شرم ناک طریقے سے پیش آتے۔ اگر ایک مسلمان سڑک پر آ رہا ہوتا اور ہمارے ساتھ ہاتھ ملاتا تو اگر ہمارے دوسرے ہاتھ میں کھانے کی کوئی چیز ہوتی، وہ ناپاک ہو جاتی اور ہم اسے ہرگز نہ کھاتے، لیکن اگر ہم نے ایک ہاتھ میں کتا پکڑا ہوتا تو پھر دوسرے ہاتھ میں پکڑے کھانے پر کچھ فرق نہ پڑتا۔ کوئی مسلمان آ کر ہمارے ساتھ ہاتھ ملاتا تو ہماری دادیاں اور مائیں کہتیں، بیٹا یہ چیز اب نہ کھانا، یہ ناپاک ہو چکی ہے۔ ان کے ساتھ ہمارا سلوک ایسا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی گاؤں میں دو مختلف لوگ رہ رہے ہوں، ایک تو دوسرے کو نہایت عزت دے جب کہ دوسرا اس کو کتے کے برابر سمجھنے کو بھی تیار نہ ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ ہماری ماؤں اور بہنوں کو ''دیدی'' کہتے، ہمیں بھائی، بہن اور باپ کا درجہ دیتے، جب ہمیں ضرورت پڑتی وہ ہماری مدد کرتے، اس کے باوجود اگر وہ ہمارے گھروں میں آتے تو ہم ان کے ساتھ بُرا سلوک کرتے۔ یہ واقعی بہت خوف ناک بات تھی۔ یہی وجہ تھی، انھوں نے سوچا ہوگا: یہ کیا ہے، کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

دو لوگ ایک گاؤں میں رہ رہے ہیں، ایک تو دوسرے سے بہت محبت کرے، جب کہ دوسرا اس سے اتنی نفرت کرے کہ اس کے ہاتھوں سے پکا کھانا تک نہ کھائے اور اسے چھوئے بھی نہیں... اگر ایک مسلمان آپ سے ہاتھ ملاتا ہے اور آپ نے ہاتھ میں چیز پکڑی ہو، آپ سمجھ لیں کہ وہ چیز ہے ہی نہیں، تباہ ہوگئی، ختم ہوگئی...

ہم سکھوں اور ہندوؤں کی نیچ ذاتوں سے اتنی بُری طرح پیش نہ آتے جتنا بُرا سلوک ہمارا مسلمانوں سے ہوتا۔ میں واقعی آج یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے بہت شرم آ رہی ہے، میں ایک مسلمان کے گھر گیا۔ اس نے پوچھا کیا کھاؤ گے؟ میں نے کہا میں کیا

کچھ نہیں کھاؤں گا، تم ہی بتا دو، میں ہر چیز کھا لوں گا؛ تمھارے پاس کھانے پلانے کے لیے کیا ہے؟

اگر آپ کسی کے گھر جائیں تو وہ آپ سے اتنی نفرت کرے کہ آپ کو کھانے کی پلیٹ خود اٹھانا پڑے اور خود ہی اہتمام کرنا پڑے... کیا میں انسان ہوں کہ آپ کے گھر میں اس طرح کھانا پسند کروں گا؟

سکھ مذہب میں بھی برہمن ازم موجود تھا۔ ہم سب اس دھرم کانت (Dharam Kanta) کا شکار تھے۔ یہی وہ اُلجھن تھی جس کی بنا پر نفرت پروان چڑھتی رہی۔ اس کے علاوہ تو اتنی محبت تھی، اتنی چاہت تھی... اگر تم میرے بچپن کی کہانیوں پر غور کرو، مجھے آج بھی خط ملتے ہیں... حتیٰ کہ ہمارے فرسٹ کزن اور قریبی رشتہ دار ہمارے اتنے قریب نہ سمجھے جاتے جتنے ہمارے دوست مسلمان قریب تھے۔ ہمیں تو تقسیم کے بعد پاکستان چھوڑنے پر بتایا گیا کہ جس عورت کو ہم دادی سمجھے جاتے تھے وہ تو ہماری دادی نہیں تھی بلکہ ایک مسلمانی تھی۔ اس کے گھر پر انجیر کا باغ تھا۔ اس نے ایک درخت میرے لیے مخصوص کر رکھا تھا جس کا پھل وہ کسی مسجد کو بھی نہ دیتی، وہ صرف میرے لیے تھا۔ اس کا پوتا مجھے بچاتے ہوئے مر گیا... میں چھوٹا تھا، تمھیں کھیتوں کا پتہ ہے نا جو کسانوں کے پاس ہوتے ہیں... آدمی کھڑا ہوتا اور اس کے سامنے بیل ہل میں جتے ہوتے تھے، ایک بار میں اس کی ٹانگ کے درمیان کھڑا تھا، اس کا نام عارف تھا... اس دوران میں ایک سانپ میری طرف بڑھنے لگا۔ کیوں کہ میں اس کی ٹانگوں کے درمیان کھڑا تھا، عارف پاؤں سے ننگا تھا، تمھیں پتہ ہے کسان کے پاس جوتے یا کوئی اور چیز نہیں ہوتی، وہ ایسا رہنا ہی پسند کرتا ہے اور سانپ نے اسے ڈس لیا، اس کا (بوڑھی دادی کا) ایک ہی پوتا تھا، وہ بھی مر گیا۔ لیکن اس بے چاری نے کبھی ایک لفظ تک مجھے نہ کہا، کبھی شکوہ نہ کیا... وہ کہتی تھی، میرے پوتے کی روح اس بچے (بیر بہادر) کے اندر ہے... کتنی خدا ترس خاتون تھی۔ میں نے آج تک اپنی زندگی میں ایسی خاتون نہیں دیکھی... وہ خود ہل چلاتی تھی... ہاں خود، وہ ابھی جوان تھی کہ بیوہ ہو گئی، مسلمان اکثر دوسری شادی کر لیتے ہیں لیکن وہ واحد مسلمان عورت میں نے دیکھی جس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اپنا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی۔ ہل تک چلا لیتی... عام طور پر عورتیں کھیتی

باڑی کا کام نہیں کرتیں۔ ہاں بھارتی پنجاب میں اب انھیں ٹریکٹر پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اب تو وہ ٹریکٹر چلا بھی لیتی ہیں۔ یوں ہمارے مسلمانوں کے ساتھ قریبی تعلقات اور رابطے تھے۔ یہ صرف برہمنی رویہ اور سیاست تھی جس نے ہمیں تباہ کر کے رکھ دیا۔ برہمنوں نے لوگوں کو ایسے جال میں پھنسا دیا اور ایسی نفرت بوئی ہے کہ شاید اگلی سو نسلوں تک ہمیں وہ سزا بھگتنا پڑے گی، جو انھوں نے ہمارے لیے تیار کی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بزرگ مسلمانوں کے حوالے سے قصوروار تھے۔ انھوں نے ان کے خلاف اتنے گناہ کیے کہ اگلے کئی سو سال کے لیے ہمیں ہر وہ سزا ملنا چاہیے جس کے ہم مستحق ہیں۔

مسلمانوں نے ہم پر یقین کیا، اتنا اعتبار کیا... کہ مثال کے طور پر وہ جو ورکر تھے... وہ جو ہماری خدمت کرتے تھے... اگر کسی کے لیے کہیں سے منی آرڈر آتا تو کوئی ان کے گھر دینے نہ جاتا، وہاں صرف ایک ڈاک خانہ تھا... ہمارے گاؤں میں پوسٹ آفس تھا اور ارد گرد کئی چھوٹے دیہات تھے، وہ خود ہی وہاں اپنی ڈاک اور منی آرڈر وصول کرنے آتے۔

(ڈاک خانہ) ٹھوا خالصہ میں تھا لیکن ڈاکیہ لوگوں کو خط یا منی آرڈر ان کے گھروں میں نہیں پہنچاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان جب اپنے گھروں سے دور کام کاج کے لیے جاتے تھے تو وہ ہمارا پتہ دے جاتے... منی آرڈر آتے تو انھیں رقم ہمارے گھر سے ملتی۔ میرا باپ ایک رجسٹر میں ان کا اندراج کر لیتا کہ یہ رقم فلاں کی ہے اور یہ رقم فلاں کی ہے—— اور پھر جب وہ لوگ واپس آتے تو اسی رقم سے اپنے استعمال کی اشیا خرید لیتے۔ ایک طرح سے یہ معاملہ ایڈوانس رقم وصول کرنے جیسا تھا۔ اگر سو، سو روپے کے 100 منی آرڈر ہوں تو 10 ہزار رقم بن جاتی ہے، جس سے آپ دُکان کے لیے سامان اور سودا خرید سکتے ہیں... وہ لوگ ہم پر کتنا بھروسا کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ہم نے یہ ہرگز نہ سوچا کہ انسانوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کیا جائے... میں یہ نہیں کہتا کہ آپ کو مذہب تبدیل کر کے مسلمان بن جانا چاہیے، بہرحال مذہب کا اپنا مقام ہے لیکن میں یہ کہہ رہا ہوں کہ انسانیت کی بھی کوئی جگہ ہے جسے ہم نے بالکل نظرانداز کر دیا، ایسے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ وہی لوگ جو ہمارا خیال رکھتے تھے،

MashalBooks.com

جب ان سے تقسیم سے متعلق پوچھا گیا اور دریافت کیا گیا کہ سکھوں نے آپ کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا— اگر میں سکھ ہو کر بھی آپ کو بتا رہا ہوں کہ کس بُری طرح ہم نے مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ کیا تو پھر جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو بتائے گا تو ظاہر ہے اس میں کچھ اضافہ کر کے بتائے گا اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ تمام مسلمانوں نے کہا تھا، ہمارا ان کے ساتھ برتاؤ انتہائی بُرا تھا اور وہ ہمارے ساتھ مزید نہیں رہنا چاہتے۔ کوئی شک نہیں، انھیں ہمارے ساتھ آخر کیوں کر رہنا چاہیے تھا؟ کیوں؟ الگ ہو کر انھوں نے اچھا کیا۔ ہم ان کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں تھے۔ بعد میں ہم نے ان کے ہاتھوں ہر قسم کی سزا اُٹھائی، انھوں نے ہمیں مارا پیٹا، اس کی وجہ ہمارا سلوک ہی تھا، ورنہ بھلا کوئی حقیقی بھائی اور بہن ایک دوسرے کو قتل یا تشدد کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔ بہرحال ہم سے گناہ سرزَد ہوئے... کسی سے بہت نفرت، اپنے اندر کسی کے لیے بے انتہا نفرت... انسانیت اسے کیسے معاف کر سکتی ہے؟

☆☆☆

ٹھوا خالصہ میں جب لڑائی اور گڑ بڑ کا آغاز ہوا تو یہ سلسلہ تین دن تک جاری رہا، ہمارے جوانوں نے 3 روز تک مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو باہر رکھا... لیکن جب مسلمانوں کی تعداد ہزاروں ہو گئی تو بھی ہم لڑتے رہے۔ آخر میں ایک سمجھوتے پر اتفاق ہوا، کچھ مسلمان مذاکرات کے لیے آگے آئے۔ معاہدے میں کوئی اور شرط نہیں تھی... صرف ایک لڑکی تھی جو اب بھی پاکستان میں ہے... درحقیقت ہر کوئی اس کے بارے میں جانتا تھا، حتیٰ کہ بچہ ہونے کے باوجود مجھے بھی پتہ تھا، لہٰذا پورے گاؤں کو پتہ ہو گا... جو بات بچے کو معلوم ہو بڑوں کو تو معلوم ہو گی ہی... اس لڑکی کے ان میں سے (مسلمانوں میں سے) ایک کے ساتھ مراسم تھے، لہٰذا مسلمانوں نے کہا، یہ لڑکی ہمارے حوالے کر دو، لیکن میرے باپ نے کہا ہم اس قسم کے لوگ نہیں جو اس قسم کا دھندہ کرتے ہیں۔ تمھیں رقم چاہیے تو تم لے جاؤ، تمھیں جو کچھ چاہیے لے لو، لیکن... حتیٰ کہ کابل قندھار میں جب غزنوی (محمود غزنوی) ہماری عورتوں کو لے گیا، ہم انھیں واپس لے آئے اور آج تم لوگ ہم سے کہہ رہے ہو کہ ہم تمھیں یہ لڑکی حوالے کر دیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو گا اور وہ، وہ سات بھائی تھے۔ میرا باپ اور اس کے بھائی، اور دو بہنیں، ان تمام

بہن بھائیوں کے بچے، یہ ملا کر 25 یا 26 لڑکیاں بنتی تھیں، لڑکے اس کے علاوہ تھے... لہٰذا یہ سب نوجوان... نوجوان، غیر شادی شدہ اور شادی شدہ، میرا باپ اور چچا اوتار سنگھ، انھوں نے سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور ان سے کہا، کچھ بھی ہو جائے ہم ان کی یہ شرط نہیں مانیں گے۔ اس کے بجائے ہم تم سب کو قتل کر ڈالیں گے، اس بات پر کوئی احتجاج بلند ہوا نہ کوئی شور اُٹھا، ان سب نے، تمام عورتوں نے کہا، ہمیں مار ڈالو...

اس گاؤں میں ہزار بارہ سو لوگ رہتے تھے، ایک شخص سردار گلاب سنگھ تھا—— ہم سب اس کی حویلی کے اندر جمع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا گھر تھا جس میں ہم سب آ گئے... گلاب سنگھ کی حویلی میں 26 لڑکیوں کو ایک طرف کر دیا گیا، سب سے پہلے میرا باپ سنت راجا سنگھ اپنی بیٹی کو پکڑ کر صحن میں لایا تا کہ اسے قتل کر سکے۔ سب سے پہلے اس نے پرارتھنا کی، اس نے ارداس کی اور بولا: سچے بادشاہ، ہم تمھاری سکھی پر آنچ نہیں آنے دیں گے اور سکھی (سکھ مذہب کی حرمت) بچانے کے لیے ہم اپنی بیٹیوں کا خون کرنے والے ہیں، انھیں شہید کرنے والے ہیں، ہمیں معاف کر دو۔ پھر... گاؤں میں قلی کا کام کرنے والا ایک آدمی تھا وہ آگے آیا اور میرے باپ کے پاؤں پکڑے اور بولا، بھا پا جی! پہلے مجھے قتل کرو کیوں کہ میرے پاؤں سوج چکے ہیں اور میں بھاگنے کے قابل نہیں—— تم سب بھاگ جاؤ گے لیکن میں ایسا نہیں کر سکوں گا۔ پھر مسلمان مجھے پکڑ لیں گے اور زبردستی مجھے مسلمان بنا لیں گے، لہٰذا میرے باپ نے فوراً وار کر کے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کے بعد چیف جسٹس آف پنجاب جسٹس ہرنام سنگھ، ان کے بہنوئی سردار نند سنگھ دھیر نے میرے باپ سے کہا، پلیز راجا پہلے مجھے قتل کر دو کیوں کہ میرے بیٹے لاہور میں رہتے ہیں... کیا تم سوچ سکتے ہو کہ میں مسلمانوں کو اپنی داڑھی منڈوانے اور لاہور میں ایک شیخ (نومسلم) کے طور پر بھجوانے کی اجازت دے سکتا ہوں۔ اس لیے مجھے مار ڈالو، پھر میرے باپ نے اسے بھی قتل کر دیا۔ اس نے دو افراد کو قتل کیا۔ تیسری میری بہن تھی مان کور... میری بہن آگے آئی اور باپ کے سامنے آ کر بیٹھ گئی، میں ان کے بالکل سامنے کھڑا تھا اور بچوں کی طرح اس کا (باپ کا) کرتا کھینچ رہا تھا۔ میں اس سے لپٹ رہا تھا... لیکن جب میرے باپ نے کرپان اُٹھائی اور وار کیا... تو کوئی شک یا خوف اس کے ذہن میں دَر آیا، یا شاید کرپان دوپٹے میں اُلجھ

گئی... کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا... وہ ایسا ہی خوف ناک اور دہشت انگیز لمحہ تھا، پھر میری بہن نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بال کھولے اور انہیں آگے کر لیا... اور میرے باپ نے اپنے ہاتھ سے دوپٹہ ہٹایا اور کرپان کا وار کیا، اور گردن کاٹ ڈالی... وہ دُور وہاں جا گری، میں رینگتا ہوا سیڑھیاں اترا، میں رو رہا تھا، ہچکیاں لے رہا تھا۔ مجھے اس دوران میں مسلسل کرپان چلنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں... 25 لڑکیوں کا خون کیا گیا۔ انھیں کاٹ ڈالا گیا، ایک لڑکی، میرے تایا کی بہو جو حاملہ تھی... کسی وجہ سے اسے قتل نہ کیا گیا اور بعد میں میرے تایا کے بیٹے نے اسے گولی مار دی اور پھر خود پر فائر کر لیا۔ وہ اور اس کا والد دونوں شہید ہو گئے... وہ (بہو) بچ گئی، اس لڑکی نے ہم سے کہا، مجھے مار ڈالو کیوں کہ میں بچ نہیں سکوں گی، میری کوکھ میں ایک بچہ ہے، میں کیسے بچوں گی؟

اس کا خون نکل رہا تھا، پھر میری ماں اور چچا اس کے قریب بیٹھ گئے، اس کا نام ہرنام کور تھا، انھوں نے کچھ افیون حاصل کی... ان دِنوں لوگ گاؤں میں افیون کا عام استعمال کرتے تھے۔۔۔ انھوں نے افیم اپنے تھوک میں ملائی اور اسے گرم کیا، وہ کہنے لگی، جاپ جی صاحب پاٹھ اور بولی وا گورو مجھے شہید ہونا نصیب کر دو اور جیسے ہی پاٹھ مکمل ہوا اس کی زندگی کی سانسیں بھی مکمل ہو گئیں۔ یہ واقعی ایسے تھا... تمھیں پتہ ہے ناں بہت کم لوگ اس طرح سے موت کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اس کو واقعی اپنی موت پر کنٹرول تھا اور جیسے ہی آخری اشلوک پڑھا، وہ چل بسی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ مر رہی ہے، آخری اشلوک تھا... پان گرو پان پتا، ماتا تت مہات... میں اسے پورا یاد نہیں کر سکتا، بہرحال اس وقت اس کی زندگی مکمل ہو گئی۔

اس رات وہاں دو لڑکیاں تھیں۔ فیصلہ ہوا کہ انھیں حویلی کے کنویں میں پھینک دیا جائے گا، صبح کے وقت ہم نے سوچا وہ مر چکی ہوں گی، وہ بہت گہرا کنواں تھا، راولپنڈی ضلع میں کنویں بہت گہرے ہوتے ہیں اور آپ ان میں جھانکیں تو آپ کو نیچے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ صبح کو ہمیں کنویں میں سے آوازیں سنائی دیں۔ وہ باہر آنے کی التجائیں کر رہی تھیں، لہٰذا ہم نے مسلمانوں سے کہا کہ ہماری دو لڑکیاں کنویں سے پانی بھرتے نیچے گر گئی ہیں، تم انھیں نکالنے میں ہماری مدد کر سکتے ہو؟ انھوں نے لمبے لمبے رسے منگوائے اور پھر لڑکیوں کو نکالا گیا اور وہ زندہ تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی کلائیوں میں

چوڑیاں تک نہیں ٹوٹی تھیں وہاں ایک ہری سنگھ تھا، اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں نکل جاؤں۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکا، اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ مسلمانوں نے اس کی زبان کاٹ دی ہے۔ کیوں کہ اس نے مسلمان بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے سر تو نہیں کٹوانا چاہتا تھا لیکن زبان کٹوانے پر تیار ہو گیا۔ ایک بھی شخص، کوئی ایک، مسلمان بننے پر آمادہ ہو گیا، ہم سب وہاں سے نکلے اور دریا کے کنارے پر پہنچے۔

☆☆☆

1945ء میں ہم سینتھہ (Saintha) سے ٹھوا خالصہ آ گئے تھے۔ چھ ماہ بعد ہم وہاں گئے اور جب واپس آئے تو ہمیں تحفوں سے لدے دو اونٹ ملے: وہاں کے مسلمانوں نے ہمیں کدو، پیٹھے، آم، دال، گھی کے تقریباً 16 من تحائف دیے۔ راشن، سامان کے 16 من بلکہ اس طرح جس طرح وہ پیروں کو نذرانے دیتے تھے ہمیں بھی اس طرح تحفے دیے گئے۔ ہر گھر سے آٹا، گڑ، دال اور کئی دوسری چیزیں انھوں نے ہمارے گھروں میں ڈال دیں۔

مسلمان عام طور پر کھیتی باڑی اور نوکری چاکری کا کام کرتے تھے۔ بعض گھروں میں ایک آدھ آدمی فوج میں بھرتی تھا، جو اپنے گھر میں تنخواہ بھجواتا۔ منی آرڈر عموماً ہمارے پتے پر آتے، وہ بہت اچھے لوگ تھے، وہ چوری چکاری کرتے نہ ہمیں ڈراتے دھمکاتے تھے، حتیٰ کہ جب انھیں پتہ چل گیا کہ پاکستان بننے والا ہے، وہ متفکر تھے کہ ہمیں (ہندوؤں اور سکھوں کو) یہاں سے چلے جانا چاہیے تاکہ ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ وہاں سے ہم باعزت طریقے سے گئے اور جب شورش کا آغاز ہوا تو لوگ وہاں سے آئے۔ تمھیں میں نے حسیناں کے بارے میں بتایا ہے ناں، ایک دن اس کا بیٹا سجاول خان ہمارے پاس آیا اور پیش کش کی: اگر ہم پسند کریں تو ہمارے گھر آ جائیں۔ وہ بچوں سمیت آیا تھا، لیکن ہم شکوک وشبہات کا شکار تھے اور آج میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ کیا کہہ رہا تھا، اس کے چہرے، اس کی داڑھی کے تاثرات—— وہاں خلوص اور ہمدردی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا، ہم نے اس کے بارے میں غلط اندازہ لگایا کہ ہم مشکلات میں گھر چکے ہیں اور وہ ہماری مدد کرنے آئے تھے، اور ہم نے انکار کر دیا۔

MashalBooks.com

راولپنڈی میں وہ لوگ جن کی دُکانیں تھیں، ان کی اپنی زمینیں بھی تھیں۔ وہ مسلمانوں کی جائدادیں بھی بطور گارنٹی رکھتے تھے۔ یوں کہہ لیں کہ وہ زمین کے بدلے انھیں قرضے دیتے تھے۔ وہاں سکھ بھی تھے جو زمین داری کرتے تھے، ان کے گھروں میں بھینسیں، گائیں اور دیگر ڈھور ڈنگر ہوتے تھے اور ان کے لیے چارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس طرح وہ اپنی زمین کو گارنٹی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ زیادہ تر دُکان داری کرتے تھے۔ تھوڑا منافع، صاف ستھرا کام... ہم لوگ زیادہ فضول خرچی نہیں کرتے تھے، مجھے یاد ہے جب میں پانچویں کلاس میں تھا، ایک دن میرے والد نے مجھے کہا، بیٹا! تم بہت فضول خرچی کرتے ہو، کیا تمھیں پتہ نہیں کہ ہمیں ہر روز اخراجات کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے؟ تمھیں روپے دھیان سے خرچ کرنا چاہئیں۔ لوگ اپنی گزر اوقات کے لیے کافی کما لیتے اور اس پر مطمئن و مسرور تھے۔ میں ہر روز اپنی دُکان صبح سویرے کھولتا تھا، میرے والد گورودوارے سے صبح 9 بجے واپس آتے اور دُکان میں بیٹھ جاتے، میں نے جو کچھ سیکھا ہے انہی سے سیکھا ہے۔ صاف، ایمان دارانہ کاروبار۔ اگر چھوٹی لڑکی آتی تو وہ اسے بیٹی کہتے، اگر بڑی ہوتی تو اسے بہن کہہ کر پکارتے، وہ ہر گاہک سے عزت و احترام سے پیش آتے۔

ہم دُکان کے لیے سودا سلف گوجر خان سے خریدتے تھے، سامان اونٹوں پر لاد کر لایا جاتا تھا۔ دُکان دار جاتا اور لے آتا۔ ان دنوں ٹرک نہیں ہوتے تھے، ٹھوا خالصہ سے راولپنڈی کے لیے بسیں چلتی تھیں۔ راولپنڈی تقریباً 20 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں تمام مذاہب کے درمیان اتنی محبت تھی کہ کوئی بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی پروا نہیں کرتا تھا۔ مسلمان زیادہ دل گردے والے تھے۔ اجناس، پھل، ساری پیداوار ان کے پاس تھی اور وہ بہت شائستہ تھے۔ جب بھی کوئی ان کے گھر جاتا، یوں کہہ لیں اگر کوئی سکھ جاتا، وہ اسے ''سکی راس'' (پکائے بغیر چیزیں) دیتے۔ درحقیقت اگر ایک مسلمان ایسا نہ کرتا تو اسے گاؤں کے دوسرے مسلمان اچھا نہ سمجھتے۔ وہ کہتے: دیکھو! شاہ جی تمھارے گھر آئے اور تم نے انھیں کچھ پیش نہیں کیا، کوئی پوچھ کر چیزیں نہ دیتا، بلکہ وہ خود ہی لے آتے۔ وہ نہایت دھیمے لہجے میں کہتے، تم ہماری پکائی چیزیں تو نہیں کھاتے، بعض اوقات وہ ایک برتن لاتے... تمھیں بتاؤں وہ برتن جیسے کہ

ہم گھروں میں دودھ پینے کے لیے استعمال کرتے ہیں، البتہ مہمانوں کو غیر استعمال شدہ برتن میں دودھ دیا جاتا، بالکل نئے برتن میں۔ ہم نے کبھی ان سے پوچھا نہیں کہ اگر ہم ان کے برتن میں کچھ کھا پی لیں گے تو کیا فرق پڑے گا؟ کیا ہو جائے گا؟ اگر ہم ایک برتن میں کھانے کے عادی ہوتے تو متحد رہتے اور یہ اختلافات پیدا نہ ہوتے۔ ہزاروں جانیں ضائع نہ ہوتیں، کوئی تقسیم نہ ہوتی۔ کیا مسلمان اب ہندوستان میں نہیں رہے یا ہندو پاکستان میں نہیں رہتے؟ یہ سب کچھ صرف سیاست ہی نہیں، برہمنیت کے باعث بھی ہے۔ ان دِنوں مجھے ڈر ہے، بلکہ حیرت ہے کہ ہریجن تک ہمارے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب ہریجن جنھیں ہم شودر کہتے ہیں انھیں اپنی لڑکیاں دیتے ہیں نہ ان کی لڑکیوں سے شادی کرتے ہیں، انھیں کوئی عزت نہیں دی جاتی۔ میں تمھیں بتا رہا ہوں یہ بہت خطرناک بات ہے۔ وہ بغاوت پر اُتر سکتے ہیں، دیکھو ذرا کانشی رام (ہریجنوں کا لیڈر) جلسوں میں کیا کہتا ہے—— وہ کہتا ہے، اسے برہمنیت کی کوئی ضرورت نہیں، تم دیکھ رہی ہو، غم و غصے کی ابتدا ہو رہی ہے۔ ہریجنوں، مسلمانوں، ہر کسی کے ساتھ ہمارا رویہ ایک جیسا ہونا چاہیے۔ کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ ایک شخص جس کے چار دوست ہیں اسے فخر کرنا چاہیے کہ ایک مسلمان دوست بھی ہے، ایک ہندو، ایک سکھ اور دیگر... میں نے پوری کوشش کی کہ ہر قسم کے طبقے (class) میں اپنے دوست بناؤں۔

☆☆☆

جب (1984ء میں) گڑبڑ شروع ہوئی تو (اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھوں پر حملوں کے واقعات کی طرف اشارہ ہے: مترجم) میرے کئی دوستوں—— میرا ایک دوست ہے، گپتا جی، منوہر گپتا جی—— جب حملہ آور آئے تو وہ میری دُکان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ انھوں نے پوچھا، بیر بہادر سنگھ کون ہے؟ وہ بولا، ہاں میں ہوں، وہ تین دن تک ہمارے گھر پر رہا، اس نے ہمیں دیوان دیا اور مشق کرائی کہ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کہا، اگر کوئی خطرہ ہو اور وہ (حملہ آور) دروازہ توڑ ڈالیں، اس نے ہمیں کچھ سیندور پاؤڈر دیا اور کہا، اگر ایسا ہو جائے ہم سب نیچے بیٹھ جائیں گے اور ہم کہیں گے کہ یہ ہمارے گورو جی آئے ہیں۔ اس نے ہمیں بتایا کہ تم کو

اپنے بال کھولنا پڑیں گے اور درمیان میں بیٹھ جاؤ۔ ہم تمھارے اردگرد بیٹھ جائیں گے اور پرارتھنا کریں گے اور کہیں گے ہمارے گورو جی آئے ہیں۔ تمھیں بتاؤں جب ایک شخص تمھاری خیرخواہی چاہے، تمھیں اپنا گورو بنا لے، تمھاری زندگی بچائے، اس سے بڑی اور کیا بات ہو گی؟ یہ حقیقی عظمت ہے، میرے مسلمان دوستوں نے مجھے فون کیا، اس طرح ہندوؤں اور سکھ دوستوں نے رابطہ کیا... سکھوں کے ساتھ 1984ء میں کیا ہوا، ہم اس پر بہت دکھی ہیں، میرا خاندان پاکستان میں کام آ گیا، میری ماں اور دو بھائی یہاں آ گئے۔ ہمیں کوئی زمین ملی نہ گھر، حکومت سے کوئی مدد نہیں ملی۔ ہم نے پیسہ پیسہ جوڑا، سخت محنت کی اور اپنے طور پر چھوٹا فارم بنایا، اور پھر گھر بنایا۔ سب کچھ لوٹ لیا گیا، تباہ کر دیا گیا، میں نے بھارتی حکومت سے 4 ہزار بطخیں خریدیں—— اس کے لیے اجازت لی، میرا خواب تھا کہ میں انھیں یوپی میں جہاں ہریجن رہتے ہیں، جوہڑوں میں چھوڑ دوں گا۔ میں یوپی میں بطخوں کے انڈوں کی بہت زیادہ پیداوار کرنا چاہتا تھا، کیوں کہ ان میں بہت زیادہ وٹامن ہوتے ہیں اور یہ مرغی کے انڈوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ ان (بطخوں) پر خرچ بھی کم آتا ہے کیوں کہ بطخیں جوہڑوں میں خود خوراک ڈھونڈتی ہیں۔ انھیں تلف کر دیا گیا۔ میرا ٹیوب وَیل اُکھاڑ کر تباہ و برباد کر دیا گیا۔ فارم ضلع غازی آباد میں تھا، جن لوگوں نے ایسا کیا اُن کی شناخت ہو گئی، لیکن ان کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ حکومت بھلا ان لوگوں کے لیے کیا کرتی جن کا خون آزادی کے لیے بہایا گیا—— اگر ہم میں اپنی دھرتی کے لیے کوئی محبت نہ ہوتی تو یہ ایک دوسری بات ہوتی—— اگر ہم مسلمان بن جاتے تو وہاں رہ سکتے تھے، لیکن ہم نے کہا: ''نہیں، ہمارا تعلق ہندوستان سے ہے، اس وقت ماسٹر تارا سنگھ نے کہا تھا کہ ہندو اور سکھ ایک ہیں، اور ہم ہیں! مجھے بھی یقین ہے کہ ہم ایک ہی ہیں۔ میرے گاؤں ٹھوا خالصہ میں ہماری دُکان کے پیچھے ایک مندر تھا، جو ہزاروں سال پُرانا ہو گا، جب کہ گورودوارہ دو یا تین سو سال قدیم تھا، سکھ مذہب اس سے زیادہ پُرانا نہیں۔ اس کا مطلب ہے، میرے باپ دادا اور بزرگ عبادت کرنے یقیناً اس مندر میں جاتے ہوں گے۔ بہرحال وہ مسجد نہیں جا سکتے تھے۔ وہ یقیناً مندر جاتے ہوں گے، لہٰذا ہم جدا کیسے ہو سکتے ہیں؟ گورو گرنتھ صاحب میں بھی ذکر ہے کہ ہم ایک ہیں، ہندو ہماری جڑ ہیں،

اگر جڑیں مر جائیں تو درخت کہاں باقی رہتا؟ ہندوؤں کے لیے سکھ جنگ جُو ہیں۔ اگر آپ جنگ جوؤں کو مار دیں گے تو گھر کی حفاظت کون کرے گا؟ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ اگر گھر کے سب لوگ جنگ جُو کو گھیر لیں گے تو وہ جوابی وار تو کرے گا۔ جو کچھ 1984ء میں ہوا میں اسے نہیں مانتا۔ آج تک کسی بلوائی کو سزا نہیں دی گئی۔ مجھے افسوس ہے کہ بے گناہ لوگوں کے نام ایف آئی آر میں درج کیے گئے۔ اگر ایک مجرم کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ لیکن اس قسم کی قانونی کارروائی... یہ نہ صرف سمرن جیت سنگھ مان کا سوال ہے بلکہ ہر سکھ نے سوچنا شروع کر دیا۔ وہ حیران ہوا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟ حتیٰ کہ ایک شخص کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد، سزا دینے کا عمل جاری رہتا، گزشتہ برس میں پکڑا گیا... کیا میں تمھاری ٹیپ ریکارڈر میں یہ ریکارڈ کرا دوں؟ میں ایسا چاہتا ہوں۔ تفصیل یہ ہے کہ 24 اکتوبر کو پنجاب میں کانگریس کا وزیر پربودھ چندر انتقال کر گیا۔ وہ میرا دوست تھا۔ میرا ایک اور دوست وریندر سنگھ اور میں اس کے گھر گئے اور واپسی پر پرتھوی راج روڈ پر ایک کار تھی جہاں کچھ لوگ سڑک پر زخمی پڑے تھے۔ کئی مردہ نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا، وہ بوٹا سنگھ کا بیٹا تھا جو درد سے کراہ رہا تھا اور لوگوں کو رُکنے کا کہہ رہا تھا، لیکن کوئی بھی رُکنے پر تیار نہیں تھا۔ میں رُک گیا، میں نے بوٹا سنگھ کے بیٹے، اس کے گن مین اور دوست کو ہسپتال پہنچایا۔ وہ امریکن ہسپتال تھا، جہاں انھیں داخل کرا دیا گیا۔ میری کار خون سے بھر گئی لیکن میں نے یہ سب کچھ انسانیت کے لیے کیا۔ میں خود کو اس کام سے روک نہیں سکتا تھا۔ ایک شخص مر گیا، لیکن جو زخمی تھے ــــ وہ ایک ہندو تھے ــــ ہم اسے ہسپتال میں لے گئے اور داخل کرا دیا۔ پھر شاید 15 دن گزرے ہوں گے (میں نے احمقانہ طور پر اس حوالے سے واقعہ اسے بتایا اور یاد کیا، جس پر بوٹا سنگھ نے میرا شکریہ ادا کیا) میں گھر پر لیٹا ہوا تھا، وہ آئے اور مجھے قابو کر لیا۔ تم نے اخبارات میں پڑھا ہوگا، جن میں خبر تھی کہ دہلی میں گوردوارہ بنگلہ صاحب کے نزدیک سے پانچ دہشت گرد پکڑے گئے، وہ رات کے 2 بجے میٹنگ کر رہے تھے۔ انھوں نے راجیو (گاندھی) کو قتل کرنے اور پارلیمنٹ ہاؤس کو اڑانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ کیا ہم پہلے دہشت گرد تھے؟ بوٹا سنگھ کا بیٹا ہمارے ساتھ تھا، ہمیں کیا ضرورت تھی، ہم اسے وہاں سے لے گئے تھے۔ ہم نے ایک انسان کی

طرح کردار ادا کیا، لیکن بوٹا سنگھ نے ہمیں 5 ماہ تک جیل میں رکھا اور ہم پر دہشت گرد ہونے کا لیبل لگا دیا۔ 24 گھنٹے تک ہم 6×8 سائز کے کمرے میں بند رہے، جہاں کوئی روشنی نہیں تھی۔ ہم نے گورنر کو خطوط لکھے اور روشنی مہیا کرنے کی درخواست کی۔ مجھے پوجا (پاٹھ) کی عادت تھی، میں نے وہاں چار بھوگ (Bhog) کیے۔ یہ پھانسی کے کمرے میں رہنے والی کیفیت تھی۔ ہر وقت جیل کا عملہ ہمیں بتاتا کہ بلاّ کو یہیں پھانسی دی گئی تھی، فلاں فلاں کو یہاں لٹکایا گیا، اور پھانسی سے پہلے انھیں یہیں رکھا گیا۔ پھر انھیں لٹکا دیا گیا۔ میں اکثر سوچتا، جن لوگوں کو پھانسی دی گئی وہ راتوں کو مجھے نظر آئے۔ مجھے لگتا ان کا ہیولیٰ میرے سامنے ہے، مقبول بھٹ، بلاّ، رنگا... جس جس کو پھانسی دی گئی، وہ کہتے ہم انھیں پہلے یہیں لائے تھے۔ ضمانت کی تمام درخواستیں حتیٰ کہ ہائی کورٹ میں بھی مسترد کر دی گئیں۔ آخر کار انھوں نے تحریری طور پر بتایا کہ ہم نے بیر بہادر سنگھ کو گرفتار کر لیا لیکن اس کا براہِ راست جرم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اکتوبر 1987ء میں ہوا اور آخر کار دسمبر میں ہائی کورٹ نے مجھے رہا کر دیا۔ مئی 1988ء میں حکومت نے تحریراً سیشن کورٹ کو بتایا کہ ہمارا اس تمام معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں دہشت گرد نہیں ہوں، میں شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کا رُکن ہوں اور بس۔ جیل میں ہم تنہا تھے، ہاں تنہا، ہم پانچوں کو الگ الگ رکھا گیا، تنہائی میں، پھانسی والے کمرے کے دو حصے تھے۔ ایک وہ جہاں پھانسی پر لٹکایا جاتا تھا جب کہ دوسرا خالی تھا۔ ہمیں ان میں قید رکھا گیا، وہاں چھوٹے سے باتھ روم تھے جن میں پانی اور مچھر بھرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں اور کوئی سہولت حاصل نہیں تھی، ہماری لیٹرین بھی وہی تھی اور خوراک بھی وہیں دی جاتی۔ ہم سوچتے کہ ہم تو محبّ الوطن لوگوں کی اولاد ہیں۔ ہم ان قیدیوں کے بارے میں سوچتے جنھوں نے یہاں وقت گزارا ہوتا لیکن میں ـــــ اگر میں خود کو قابو میں نہ رکھتا تو یہ تجربہ مجھے واقعی دہشت گرد بننے پر مجبور کر دیتا۔

میں غصے سے بھرا ہوا تھا لیکن مجھ میں لڑائی کی طاقت نہیں تھی، میرا ایک خاندان ہے، بیٹیاں ہیں، میں آخر کیوں کر ایسا کرتا؟ کیا میں کوئی 22 سالہ نوجوان تھا؟ یقیناً کچھ نہ کچھ ہوا ہو گا، اس طرح کے سینکڑوں کیس ہوں گے، جہاں جوان لوگ دہشت گرد بن گئے۔ آخر کار یہ ایک حکومت (State) ہے، انھیں دیکھنا چاہیے ـــــ

ایک 70 سالہ بوڑھا، انھوں نے اسے دہشت گرد بنا ڈالا۔ میرا ریکارڈ دیکھ لو، میں میونسپل کارپوریشن کا چیئرمین رہا ہوں، ایس جی پی سی (SGPC) کا رُکن رہ چکا ہوں۔ میرے خلاف کوئی مقدمہ نہیں۔ میں نے دیانت دارانہ زندگی گزاری۔ میرا خاندانی پس منظر دیکھو، میرا باپ...

میرا باپ ایک قوم پرست تھا، وہ آزادی کی جنگ میں آگے آگے تھا۔ اس نے جیل کاٹی۔ یہی وجہ ہے کہ میری ماں کو پنشن ملتی ہے۔ ایک طرف وہ آپ کو پنشن دیتے ہیں، دوسری جانب آپ پر دہشت گرد ہونے کا لیبل لگایا جاتا ہے۔ یہی وہ الجھن ہے جو بار بار آپ کو تنگ کرتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ کے اپنے بہن بھائی آپ کے لیے کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ میں کبھی کبھار بیوی اور بچوں سے ملاقات کرتا تھا لیکن اکثر میں ٹھیک سے ان کی شکل نہ دیکھ سکتا۔ ہم صرف اشاروں میں گفت گو کر سکتے تھے۔ ان کے اور میرے درمیان پولیس ہوتی... آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟ اس میں کون سا انصاف ہے؟ کیا یہ جمہوریت ہے؟ کسی کو اس طرح پکڑ لینا اور اسے دہشت گرد بنا دینا۔ وہ جو ایس جی پی سی کا رُکن ہو اسے بھی... یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ میں پوری زندگی یہ نہیں بھلا سکوں گا۔ انھوں نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا، اس کے باوجود بھارت ہمارا وطن ہے، سب سکھ ایسا ہی سوچتے ہیں۔ کوئی بھی خالصتان نہیں چاہتا۔ یہ نعرہ ''راج کرے گا خالصہ'' بہت شروع میں لگایا گیا تھا۔

☆☆☆

مسئلہ یہ ہے کہ سکھوں پر بہت زیادہ حملے ہوئے کیوں کہ سکھوں کی شناخت کرنا بہت آسان ہے، جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ظاہری فرق زیادہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ سکھوں میں اس بات کا خوف پایا جاتا تھا مبادا کسی ہندو پر حملہ کرتے وقت مسلمانوں کو نشانہ بنا لیا جائے۔ سکھوں کی پہچان بہت آسان ہے اور پھر انھوں نے اپنی کرپانیں نکال لیں۔ تمھیں پتہ ہے میری بہن کو قتل کرنے کے بعد میرے باپ نے سات مسلمانوں کو بھی مار ڈالا تھا۔ اس کی ان سے کوئی دُشمنی نہیں تھی۔ درحقیقت وہاں محبت کا پرچار ہوتا تھا لیکن جب صورت حال تبدیل ہوئی تو کرپانیں نکل آئیں۔ گورو گوبند سنگھ نے سکھوں کو یہی تربیت دی تھی۔ اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ انگریزوں

نے بھی اسے تسلیم کیا تھا۔ یہ صرف حکومت تھی... قطع نظر اس کے کہ گزشتہ 40 برس سے ہمارے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے۔ تم دیکھ سکتی ہو سکھ تاریخ رقم کرتے رہے۔ 1984ء میں مَیں پنجاب کے گورنر سے ملا، میں نے کہا کہ یہ سب کچھ دیکھ کر واقعی مجھے صدمہ ہوا ہے۔ میں ایس جی پی سی (شرومنی گورو دوارہ پربندھک کمیٹی) کا رُکن ہوں، لیکن میں لوگوں سے یہ نہیں پوچھ سکتا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ اس نے پوچھا: تم چاہتے کیا ہو؟ میں بولا: میں فسادات زدہ علاقوں میں جانا چاہتا ہوں، اس نے ہمیں ایک کار دی اور ساتھ کچھ ملازمین بھیج دیے۔ میرے خیال میں مَیں پہلا سکھ تھا جس نے ان بُرے حالات میں پورے شہر کا چکر لگایا۔ میں شکار پور گیا۔ میں ہر جگہ گیا۔ انھوں نے چند لوگ میرے ساتھ بھیجے تھے۔ میں شکر گزار ہوں شکار پور میں ہم نے زخمیوں کی مدد کی اور انھیں سنتاں دا ڈیرہ پر لے گئے۔ سڑک پر ایک لڑکی بیٹھی تھی اور اس کا نومولود بچہ دودھ کے لیے اس کی چھاتی کی طرف دیکھ رہا تھا، ہم نے کار روک لی۔ میں نے اس سے کہا: بی بی، لیکن وہ مر چکی تھی، لہٰذا ہم نے بچہ اُٹھا لیا اور اسے کیمپ بھجوا دیا۔ یہ وہ حالت تھی جس میں ہمیں کئی خواتین نظر آئیں۔ نوجوان سکھ، جنھوں نے یہ سب کچھ دیکھا ہوگا کسی چیز پر ان کا اعتماد کیسے بحال ہو سکتا ہے؟ بہرحال اعتبار، اعتبار کا متقاضی ہوتا ہے اور بد اعتمادی، بداعتمادی کو جنم دیتی ہے۔ میں نے بتایا ہے ناں کہ ہم نے تقسیم کے وقت سجاول خان پر شبہہ کیا تھا، ہمیں اس پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔ اعتماد بہت بڑی چیز ہے، حتیٰ کہ دُشمن بھی اعتبار کا مستحق ہے... اگر آپ اس پر اعتماد ظاہر کریں گے تو وہ جھوٹ نہیں بولے گا، دھوکا نہیں دے گا۔

وہ دو لڑکیاں (بہنیں) جو کنویں میں گر کر بھی بچ گئیں ان کے باپ کو مسلمانوں نے زخمی کیا تھا، اس کی ٹانگ پر گولی ماری گئی تھی۔ اس وقت وہ ہمارا لیڈر تھا، پرتاپ سنگھ دھیر۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکی کا نام مہندر کور تھا۔ ہم اس (پرتاپ سنگھ) کی چارپائی اُٹھاتے اور وہ جو کچھ کہتا ہم اس پر عمل کرتے۔ اگر اس نے کہا ہوتا تو ہم مسلمان بھی بن جاتے۔ ہم ایسا ضرور کر گزرتے۔ لیکن اس نے کہا کہ اس کے بجائے ہم اپنے ٹکڑے ٹکڑے کر لیں گے... زندگی بچانے کے لیے ہم اپنے دھرم تبدیل نہیں کریں گے۔ اس نے کہا میں تو نیم مردہ ہو چکا ہوں۔ اگر تم مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو اور

ہر ٹکڑے کے ساتھ مجھ سے پوچھو تو بھی میں مذہب نہیں بدلوں گا، اور اس نے یہ کہا ہی تھا کہ لاجونتی اور دیگر عورتیں کنویں میں کود گئیں۔ پھر مسلمان بولے یہاں تو یہ لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں، پس انھوں نے دوسرے گاؤں تھمالی کو جانے کا فیصلہ کر لیا جو ٹھوا خالصہ سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، ہمارا گاؤں تھوڑا قریب اور پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھا۔ کئی لوگ لوٹنے آ گئے۔ کچھ لوگ جو بعد میں وہاں گئے بتاتے ہیں کہ وہاں کوئی اینٹ تک نہیں باقی چھوڑی گئی۔ کئی دن سے لڑائی جاری تھی، وہاں ایک بڑی جی دار عورت تھی، وہ میری رشتہ دار تھی اور اس کا نام دیوان کور تھا۔ اس نے پگڑی باندھی اور لڑنے چلی گئی۔ اس کی لاش گاؤں سے کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی ملی۔ لوگ اسے کہتے رہے اکیلی نہ جاؤ، اس نے کہا، کیا بکتے ہو، میں گورو گوبند سنگھ کی بیٹی ہوں اور وہ ان پر قہر بن کر ٹوٹ پڑی۔ وہاں گاؤں میں اب بھی کئی خواتین زندہ بچ گئی تھیں۔ ہمارے خاندان کی اکثر عورتیں مر گئیں اور پھر وہ جنھوں نے کنویں میں چھلانگ لگا دی، تاہم دیگر کو بچا لیا گیا، کیوں کہ مسلمانوں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ لوگ قربانیاں دے رہے ہیں۔ وہ جنھوں نے قربانیاں دیں... اگر ہمارے خاندان کی عورتوں کو قتل نہ کیا جاتا اور وہ جنھوں نے کنویں میں چھلانگ لگائیں اپنی جانیں نہ دیتیں تو جو خواتین بچ گئیں وہ آج کبھی زندہ نہ رہتیں۔ مسلمان اس کام کے لیے وہاں آئے۔ تم مجھے یہ کہنے پر معاف کر دو لیکن ہمارے گاؤں کے مسلمان اتنے اچھے نہیں تھے۔ مثال کے طور پر ہمارے بچے صاف ستھرے تھے اور اچھا لباس پہنتے تھے، لیکن مسلمان آٹھ، آٹھ دن تک غسل نہ کرتے، صابن نام کی کوئی چیز انھوں نے نہیں سنی تھی۔ اس لیے وہ بہت بدنما نظر آتے، ہماری عورتیں بہت حسین تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے انھیں اُٹھانے کا منصوبہ بنایا، لیکن میرے باپ نے عہد کیا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ تاریخ ہر روز تبدیل نہیں ہوتی۔ ہم روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اس نے کہا تھا، ہم کتنے دن زندہ رہ لیں گے۔ شاید 10 سال، شاید 20 برس، پھر کیا ہو گا؟ اس کے بعد تو ہمیں مرنا ہی ہو گا۔ ہم عزت کی موت مریں گے۔ اس کے بعد کا سارا کام... پہلا قدم میرے باپ نے اُٹھایا اور پھر سارا کام سردارنی لاجونتی نے کیا۔ ہمارے علاقے میں صرف دو وکیل تھے، ایک جسٹس برنام سنگھ اور ایک سنت گلاب سنگھ تھا۔ جسٹس ہرنام سنگھ ہائی کورٹ کے جج بن

گئے اور گلاب سنگھ سنت بن گیا۔ اس نے درویشی کا راستہ اختیار کر لیا۔ وہ بہت ادبی اور پڑھا لکھا انسان تھا۔ ماتا لاجونتی اس کی بیوی تھی، جس نے اپنی جان قربان کر کے دوسرے سکھوں کو بچا لیا۔ اس طرح 26 اور ... ان کی تعداد 100 کے لگ بھگ بنتی ہے۔ پھر ہمارے گاؤں کے مسلمانوں نے... ایک شخص ہری سنگھ تھا، ایک اور تھا، گرنتھی جسے وہ پکڑ کر لے گئے۔ پہلے انھوں نے اس کا ہاتھ کاٹا، پھر بازو! لیکن وہ مسلمان بننے سے انکار کرتا رہا۔ اس نے کہا تم مجھے جان سے مار ڈالو، انھوں نے اسے مار ڈالا، پھر ہمارا ایک رشتہ دار گوربخش سنگھ دھیر ـــــ وہ اب مر چکا ہے، انھوں نے اس کی چھاتی پر بندوق رکھ دی، بتاؤ، تمھارا باپ کدھر ہے، اس کا باپ رات کو بھاگ نکلا تھا، وہ 20 کلومیٹر کا سفر کر کے راولپنڈی پہنچ گیا اور ڈسٹرکٹ کلکٹر سے ملا اور وہاں سے فوج لانے کا بندو بست کیا۔ اصل قربانی ماتا لاجونتی نے دی، یا ان لڑکیوں نے دی جنھوں نے اس کی تقلید میں کنویں میں چھلانگ لگائی، دیکھو اس نے کون سا ہتھیار استعمال کیا، جو وقت کے لحاظ سے کتنا موزوں تھا، وہ سنت راجا سنگھ سے متاثر ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹیوں کو کاٹ ڈالا۔ پھر اُن لڑکیوں اور اِن لڑکیوں میں کیا فرق تھا؟ اگر وہ ان میں سے ایک بھی لے گئے تو بے عزتی ہو گی۔ جس لڑکی کے بارے میں وہ (مسلمان) کہہ رہے تھے ہم اسے اپنے ساتھ لائے وہ زندہ تھی... اسے ہم کیمپ میں لے آئے جہاں سے وہ بھاگ کر منٹگمری (موجودہ ساہیوال) چلی گئی اور مسلمان مرد سے شادی کر لی۔ وہ اب بھی ہمارے گاؤں میں رہتی ہے۔

بالکل ایسا ہی اس وقت ہوا تھا۔ لڑائی شروع ہوئی تو مفاہمت کی کوشش بھی ہوئی۔ بہرحال لڑائی کا ایک معنی مفاہمت بھی ہے۔ لہٰذا مسلمان مفاہمت کے لیے آئے۔ انھوں نے شرط لگائی، اگر ہم لڑکی ان کے حوالے کر دیں تو ہمیں گاؤں میں رہنے کی اجازت ہو گی۔ وہاں ایک مسلمان تھا، لوفر قسم کا، وہ کھیتی باڑی کرتا تھا، لیکن وہ اس لڑکی کو چاہتا تھا، اس کے لڑکی سے بعض قسم کے مراسم بھی تھے۔ وہ اس لڑکی کا مطالبہ کرتے رہے، وہ کہتے لڑکی دو تو ہم مسلمانوں کو واپس بھیج دیں گے۔ پھر ہمارے لوگ آپس میں بحث کرنے لگے اور کہا یہ ایک بدکردار لڑکی ہے۔ اس کے اس مسلمان سے مراسم ہیں، اسے اپنے پاس رکھنے کا کیا جواز ہے؟ تمھیں بتاؤں جب زندگی بچانے کا

مرحلہ آئے تو پھر کسی چیز کی پروا نہیں رہتی، لہٰذا ایک قسم سے اسے حوالے کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔

اس وقت یہ سوال پیدا نہیں ہوا تھا کہ لڑکی کیا چاہتی تھی۔ وہ صرف گاؤں کی غیرت کا سوال تھا، میرے باپ نے کہا، ایسا کیوں کر ہو گا، ہماری تاریخ گواہ ہے، قندھار اور کابل میں غزنوی (محمود غزنوی) ہماری جو عورتیں لے گیا تھا ہم انھیں بھی واپس لے آئے اور اب ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ ہماری عورتیں لے جاؤ، صرف زندگی بچانے کی خاطر؟ ہم ایسا کیوں کریں گے؟ یہ لڑکی بھی میری بیٹی ہے، تم سب ایک طرف ہو جاؤ، دیکھو میں کس طرح اسے ان کے حوالے کرنے دیتا ہوں، لہٰذا اس نے لڑکی کو ایک طرف کیا اور میدان میں چلا گیا، وہ اکیلے ہی لڑنے لگا اور مسلمانوں کو مار بھگایا۔ پھر ہم نے چارپائی اٹھائی، جس پر پرتاپ سنگھ بیٹھا تھا۔۔۔ اس نے کہا، چلو لڑکی انھیں دے دیں، پھر فوج آ گئی۔ وہ لڑکی بھی ہمارے ساتھ ٹرکوں میں بیٹھ گئی۔ پہلے ہم جہلم گئے... گوجر خان نہیں گئے۔ پھر رات کو روات گئے، اس کے بعد واہ کیمپ (Wah Camp) میں قیام کیا۔ لڑکی ہمارے ساتھ رہی۔ اس کے منٹگمری میں کچھ رشتہ دار تھے، وہاں زیادہ گڑبڑ نہیں تھی... جب ہمارے راولپنڈی میں فسادات شروع ہوئے تو بھی دیگر شہروں میں لوگ گھروں میں سکون سے رہ رہے تھے۔ ہمارے لیے مشکل تو مارچ میں شروع ہو گئی تھی۔ جہلم میں ایک سردار ہرنام سنگھ تھا، اس نے لوگوں کی بہت مدد کی۔ وہ مختلف چیزیں جمع کرتا اور پھر انھیں ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتا۔ ہمارے حالات اتنے بُرے تھے، کچھ بھی نہیں تھا، ایک پائی تک نہیں تھی، ایک بار میں نے اپنی جیب میں ہاتھ مارا تو دو آنے مل گئے، وہ میں نے اپنے بھتیجے کو دیے اور کہا جاؤ کچھ چھولے لے آؤ۔ روات کی طرف جاتے ہوئے ہمیں سخت بھوک لگ رہی تھی، لیکن راستے میں ساری بھوک پیاس ماری گئی... جب آپ نے ایک ہاتھ میں ماں کا ہاتھ تھام رکھا ہو، دوسرے میں چھوٹا بچہ ہو اور ساتھ ہی چھوٹا بھائی ہو تو بھوک محسوس کرنے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے؟ لیکن آخر انسان، انسان ہے، لوگوں کو بھوک لگتی ہے، لہٰذا میرا بھتیجا، مجھے یاد ہے اس نے کیا کہا تھا: کہ سکہ کھوٹا تھا، اور میں رو پڑا۔ پھر میں نے اپنا ہاتھ دوسری جیب میں مارا، اس میں ایک خط تھا جو میرے باپ نے اپنی سالی کے نام لکھا تھا۔ وہ اتفاق سے

میری جیب میں رہ گیا۔ میرے پاس اپنے باپ کی ایک چادر تھی، کبھی میں خط پڑھتا اور کبھی چادر کو چوم لیتا، وہ خط میں نے برسوں اپنے پاس رکھا، اب معلوم نہیں وہ کدھر ہے۔ جب کبھی میں دُکھ محسوس کرتا، رو پڑتا تو وہ خط پڑھ کر دل کو تسلی ہوتی۔ لیکن آنسو بھی اچھی علامت ہوتے ہیں۔ جو چیز بھی اُبل پڑتی ہے، اچھی ہوتی ہے۔ اس روز میں کتنا رویا تھا کہ سکہ کھوٹا تھا۔

روات کیمپ میں ایک کمرہ تھا جہاں دری بچھی ہوئی تھی، ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ ہمیں بتایا گیا کہ یہ جگہ تمھارے لیے نہیں اور وہاں ایک اور کمرہ تھا۔ لہٰذا ہم نے چادر اور بوری اُٹھائی اور جو کچھ سامان تھا اس میں ہمیں ایک چھوٹی سی پوٹلی ملی جس میں 50 روپے بندھے تھے۔ جب میں نے اسے کھولا اور 50 روپے نظر آئے، میں بولا، ارے اس میں 50 روپے ہیں، کیا اس کا کوئی مالک ہے؟ اور دیگر لوگوں نے بھی کمال ایمان داری کا مظاہرہ کیا۔ وہ وقت ہی ایسا تھا، ہر کوئی ہزاروں روپے چھوڑ کر آیا تھا، لہٰذا کسی نے ان روپوں کا دعویٰ نہ کیا۔ شاید وہ پہلے ہی سے وہاں پڑے تھے، یا وہ دری میں چھپے تھے۔ بہرحال ان سے اگلے دو ماہ کے لیے گزارے کا بندوبست ہو گیا۔ پھر پشاور سے ہمارے بعض عزیزوں نے ہمیں 50 روپے کا منی آرڈر بھجوا دیا اور ہم دہلی میں مقیم کچھ رشتہ داروں کے ساتھ یہاں آ گئے۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا، ہم جوان تھے، شاید 16 سال عمر تھی اور تمھیں پتہ ہے ناں خشک دودھ اور سارڈین مچھلی ـــــ سارڈین مچھلی چپٹی ہوتی ہے، اس طرح ہم مچھلی کے ڈبوں کو کٹوروں کے طور پر استعمال کرتے جب کہ خشک دودھ کے ڈبے بجانے کے کام آتے۔ ہم پتھر سے ان کے کنارے سیدھے کرتے اور انھیں استعمال کر لیتے۔ حتیٰ کہ اچھے بھلے کھاتے پیتے لوگ بھی ہم سے ڈبوں کی فرمائش کرتے۔ تمھیں پتہ ہے فوجی چیزیں استعمال کر کے ڈبے پھینک دیتے ہیں، ہم انھیں اُٹھا لیتے، پھر ہتھوڑے سے سیدھا کر کے قابل استعمال بنا لیتے۔ پھر ہم لوگوں سے کہتے، تایا جی، یہ لے لیں، چاچی جی یہ لے لو۔ ہم ہر کسی کو ڈبے دے دیتے۔ لوگوں کی امداد کرنے کی میری یہ ابتدائی شکل تھی۔ کچھ ہم اپنے لیے جمع کر لیتے، باقی رشتہ داروں اور دیگر لوگوں کو دے دیتے۔ میرا معمول تھا کہ ڈبے اٹھاتا۔ انھیں احتیاط سے صاف کرتا اور پھر آگے دے دیتا۔ اور جب کھانے کا وقت آتا ہم ان ڈبوں

کو برتنوں کے طور پر استعمال کرتے، شروع میں صرف یہی تھا، پھر آہستہ آہستہ ہم یہاں تک آ گئے۔

ہاں تو وہ لڑکی، جب ہم یہاں آئے، ہم منٹگمری کے قریب تھے، جہاں سے وہ لڑکی کو ساتھ لے گئے۔ اسے ڈھول ڈھمکے سے لے جایا گیا۔ پھر گاؤں میں ہم نے سنا کہ وہ بس سٹینڈ کے قریب رہی تھی۔ اس نے اس آدمی سے شادی کر لی تھی اور حاملہ تھی۔ وہ اسے ساتھ لے گیا، وہ بہت خوب صورت تھی۔ وہ شادی شدہ تھی، یقیناً اس کا لڑکا اب بڑا ہو گیا ہو گا۔ ان کا ایک ہوٹل تھا، اس کے شوہر کا دو سال پہلے ہی انتقال ہوا، وہ غیر معمولی طور پر حسین تھی۔ اس طرح کی کئی دیگر چیزیں تھیں... وہ کئی لوگوں کی موت کی ذمہ دار تھی۔ وہ مسلمانوں کا مکمل طور پر سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ تمام دیہات کو ایک ہی رات میں گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ اس وقت یہ صورت حال تھی کہ جہاں ایک گاؤں سکھوں کا ہوتا تھا، وہاں 30 یا 40 دیہات مسلمانوں کے ہوتے تھے، لہٰذا سکھ کہاں جاتے؟ انھیں پانی، کھانا اور راشن چاہیے تھا۔ تمھیں بتاؤں مسلمانوں نے بعض خوف ناک کام کیے۔۔۔ انھوں نے میدان جنگ میں کبھی کوئی لڑائی نہیں کی تھی، کھلے مقام پر۔ وہ ہمیشہ پشت پر وار کریں گے، ایک مسلمان کبھی کسی سکھ سے دو بدو مقابلہ نہیں کر سکتا، وہ تمھارے سامان کو آگ لگا دیں گے، تمھارا گھر، تمھارا گاؤں جلا دیں گے، لہٰذا جب انھوں نے گاؤں کا محاصرہ کیا، انھوں نے گھروں کو نذر آتش کرنا شروع کر دیا اور آگ تو بہت دہشت ناک چیز ہوتی ہے۔ جس لمحے کوئی شخص دھواں دیکھتا ہے وہ خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ ہم پوری طرح گھیرے میں تھے۔ ہمارے چاروں طرف شعلے تھے، ایک شخص کیا کر سکتا ہے؟ میرے خیال میں وہ لوگ خراج عقیدت کے قابل ہیں جنھوں نے اپنے بچوں کو قتل کیا، جنھوں نے کنویں میں چھلانگیں لگائیں اور ہمیں بچا لیا... تم کسی شہید ہونے والے کا خاندان لے لو، تم دیکھو گی کہ وہ تیزی سے پھل پھول رہا ہے۔ خون ایک ایسی چیز ہے جس طرح آپ کسی درخت کو پانی دیں تو وہ پھلتا پھولتا ہے، اسی طرح شہید کی چیز میں بھی برکت ہوتی ہے، میرے گھر میں، میرا بیٹا مر گیا۔۔۔ یہ پاکستان بننے کے بعد کی بات ہے۔ ہماری شادی، جو فارم پر ہوئی، کے بعد، یہاں جہاں میں بیٹھا ہوں، کوئی موت نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا ایک طرح کی برکت تھی۔ یوں کہہ لیں گھروں کی تمام

چیزیں تباہ کر دی گئیں اور کچھ وقت کے لیے جو بچا اسے محفوظ کر لیا گیا۔ بہادری کبھی ضائع نہیں جاتی، نہیں جاتی ناں؟ جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے ہم اس کے مطابق زندگی گزارتے ہیں—— میرے پانچ بیٹے ہیں، میری ماں وہ واقعات یاد کرتے پورا پورا دن روتی رہتی ہے، وہ روتی ہے اور اپنے مرے خاندان کے لیے بین کرتی ہے، پورا دن روتی رہے گی، لیکن واہگو روضرور اس کی سنے گا، اب ہم تین بھائی ہیں، ہم سب کے بچے ہیں۔ میرے پانچ لڑکے اور پوتے پوتیاں ہیں۔ ہمارا بہت اچھا، بڑا کنبہ ہے اور اب تو میری ماں شکایت کرتی ہے کہ وہ شور شرابے کے باعث سو بھی نہیں سکتی، گھر میں کوئی سکون نہیں، لہٰذا آپ کو قسمت کے معجزے پر خوش ہونا چاہیے۔

☆☆☆

میری دو بہنیں تھیں، ایک کلکتہ میں تھی، دوسری وہ ہے جو پہلے شہید ہوئی اور اس نے کتنی جرأت سے یہ سب کچھ کیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس جیسا اور کوئی نہیں دیکھا۔ وہ بالکل اس طرح بیٹھی تھی، پنجوں کے بل، اور اس کے پیچھے میرا باپ کھڑا تھا، جب کہ آگے میں کھڑا تھا۔ باپ اور بیٹی ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ تلوار سونتے ہوئے، وہ بیٹھ گیا اور ارداس کی اور جب اس نے اسے مارنے کی کوشش کی، کوئی چیز اس کے راستے میں آن کھڑی ہوئی، شاید وہ ایک باپ کی اپنی بیٹی سے وابستگی ہو گی۔ پھر میری بہن... لفظوں کا کوئی تبادلہ نہیں ہوا، باپ اور بیٹی کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کرپان کی زبان کافی تھی۔ دونوں افسردہ تھے کہ وار ضائع گیا۔ پھر میری بہن نے اپنی چٹیا ایک طرف کر دی اور میرے باپ نے اس طرح وار کیا اور اس کا سر دور جا گرا... کچھ لوگ سیڑھیوں کے اوپر تھے اور کچھ نیچے۔ پورا گاؤں وہاں تھا... سیڑھیوں کے نیچے، کچھ نیچے کچھ کمرے تھے اور کچھ اوپر تھے۔ وہاں کوئی لمبی چوڑی سکیم نہیں تھی تاہم اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ پورا گھر تباہ ہو جائے گا۔ تمام لڑکیاں جوان تھیں، صرف ایک فرق یہ تھا کہ میرا باپ اپنے ساتوں بھائیوں میں چھوٹا تھا۔ میں نے تمھیں اوتار سنگھ کے بارے میں بتایا تھا، وہ لڑکی جو حاملہ تھی، وہ اس کا پہلا بچہ تھا... ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ چاچا اور بھتیجا دونوں جوان تھے۔ بڑے بھائی کا بیٹا اور چاچا تقریباً ہم عمر لگتے تھے۔ وہ تمام جوان تھے، گھر میں کئی مرد تھے، تم

تصور کرو کہ جہاں صرف 26 لڑکیاں تھیں، وہاں مرد کتنے ہوں گے۔ 15 یا 20 جوان تھے۔ ان سب نے سوچا ہم سب برباد ہو جائیں گے اور چاچا نے کہا یہی مناسب فیصلہ ہے، ایسا ہی کرو لہٰذا وہ سب اس کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے سوچا، اگر مسلمان یہ لڑکیاں لے گئے... کسے پتہ تھا، زندگی کتنی باقی ہے۔ آج فرض کرو انھوں نے وہ کام نہ کیا ہوتا تو کیا میری بہن کا نام مغوی عورتوں کی اس کتاب میں درج نہ ہوتا جو آج تمھارے پاس ہے؟ (وہ اغوا ہونے والی عورتوں سے متعلق فہرست پر مشتمل اس کتاب کا حوالہ دے رہا تھا جو میرے پاس تھی) یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے زندگیاں بچائیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی عورتوں کو شرم ناک زندگی گزارنے کے لیے چھوڑنے کے بجائے انھیں قتل کر دیں گے۔ تم پوری کتاب دیکھ لو، تم کو کہیں ہمارے گاؤں کی عورتوں کے نام نظر نہیں آئیں گے۔ جو نام تمھیں تھمالی اور دوسرے دیہات کی عورتوں کے نظر آ رہے ہیں ان بے چاروں کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ فرض کرو اگر 10 لوگ جمع ہو کر آئیں اور ہماری لڑکیوں کو لے جائیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ وہاں تو بہت سے لوگ تھے، حدنگاہ تک لوگ تھے۔ ایسا لگتا تھا دُنیا کی سرحدیں ٹوٹ گئی ہیں اور لوگ وہاں دَر آئے تھے۔

ہاں بعض لوگ تھے جو اپنی لڑکیاں وہاں سے نکال لے گئے تھے۔ صرف ہمارا گھرانہ باقی رہ گیا، باقی چلے گئے۔ اوپر سیڑھیوں میں ہم اکیلے رہ گئے، جو اوپر تھے، ختم کر دیے گئے۔ انھوں نے (یعنی سکھوں نے) مردوں کو قتل نہ کیا، میں خود اوپر تھا، مجھے کچھ نہ کہا تھا۔ بس مجھے ایک طرف کر دیا گیا، میں نے اتنا دہشت انگیز منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ آج بھی جب مجھے یاد آتا ہے... میں رو پڑتا ہوں۔ اس طرح میرا دل ہلکا ہونے میں مدد ملتی ہے۔ ایک باپ جو اپنے ہاتھوں سے بیٹی قتل کرتا ہے وہ کتنا لاچار ہو گا۔ اس کے اندر چھریاں چلتی ہوں، اس خیال سے کہ کوئی اس کی بیٹی لے جائے گا اور میری پوری زندگی، مجھے لگے گا... وہ (مسلمان) انھیں صرف مذہب کی بنا پر لے جانا چاہتے تھے۔

یہ بھی (1984ء) ٹھیک اُسی طرح تھا۔ لوگوں کو زبردستی بال منڈوانے پر مجبور کر دیا گیا۔ مذہب بدلنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ بالکل ویسے تھا، لوگ لڑے اور مرے، ایک

عورت تھی جس کا شوہر دہلی میں کام کرتا تھا اور اس کا تبادلہ انبالہ ہو گیا۔ اس کا بھائی پٹیالہ میں ملازم تھا۔ اس کا تبادلہ دہلی ہو گیا، لہٰذا اس نے سوچا، میری بہن کا اتنا بڑا گھر ہے۔ ہم وہاں ٹھہر جائیں گے، اس طرح شوہر انبالہ جب کہ بہن بھائی دہلی میں رہنے لگے۔ عورت کے بچے تھے، وہ پالم کے قریب پالم کالونی میں رہتے تھے۔ ان کے گھر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ بے چاری بہن دہائیاں دیتی رہی کہ اس کے بھائی کو نہ مارو، انھوں نے اسے کہا، تم چلی جاؤ ہم عورتوں کو قتل نہیں کرتے، تمھیں بھی نہیں ماریں گے۔ لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے، اس عورت نے مجھے خود بتایا، انھوں (ہندو جنونیوں) نے اس کے بھائی کو نوکیلے سوؤں سے مارنا شروع کر دیا۔ قتل کیا اور چلے گئے۔ اور وہ بھائی کی لاش کے پاس اکیلی رہ گئی۔ وہ حیران تھی کہ اب کیا کرے، کبھی وہ کھڑکیوں سے لکڑی توڑتی اور گھر لے آتی۔ پھر اسے کتاب ملی، ایک کرسی... جو کچھ اس کے ہاتھ لگا اس نے جمع کیا اور بھائی کے لیے چتا تیار کر لی۔ اس کے باوجود وہ لاش کو پوری طرح جلا نہ سکی۔ صرف ایک رویے کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا... اگر پاکستان بنا تو وہ ہمارے رویے کی وجہ سے بنا، اور یہ سکھ ہی تھے جنھوں نے ہندوستان کی تخلیق میں مدد کی۔ ہم نے اس کا جھنڈا بلند رکھا، مسلمانوں سے پہلے تاریخ کیا کہتی ہے؟ سکھ بہرحال ہندو تھے جو سکھ بن گئے اور اب ہندو سوچتے ہیں وہ ہم سے الگ ہیں یا سکھ خود کو علیحدہ خیال کرتے ہیں۔ ہم تو ملک کے سنتری ہیں، پورے ہندوستانی معاشرے کے محافظ۔ تم ہمیں ان میں سے کوئی بھی نام دے سکتی ہو، سردار، بزرگ، چھوٹے... لیکن اگر ہم اجنبی تھے...

تم دیکھ سکتی ہو بھارت میں مسلمانوں کی آبادی کس طرح بڑھ رہی ہے۔ میرا خیال ہے، پاکستان بنتے وقت یہ 7 کروڑ تھے۔ میں نہیں سمجھتا میں غلط کہہ رہا ہوں، اب یہ تقریباً 16 کروڑ ہیں۔ اگر 40 برس (انٹرویو کے وقت) میں تعداد اتنی ہو گئی تو اگلے 40 برس میں کیا ہو گا؟ میرا ایک مسلمان دوست تھا، میں بھوگل سے بلدیہ کا الیکشن لڑا کرتا تھا۔ وہ یعنی اقبال، میرے پاس آیا اور کہا: میرے بچے کی سال گرہ ہے، تم ضرور آنا۔ میں نے کہا، یقیناً میں آؤں گا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا اقبال صاحب آپ کے کتنے بچے ہیں؟ اس نے کہا، اسے بھول جاؤ یار، میں بعد میں بتا دوں گا۔ میں نے دوبارہ پوچھا، مجھے بتاؤ، یا مجھے بتانا چاہیے کہ میرے کتنے بچے ہیں۔ میرے پانچ بیٹے اور

دو بیٹیاں ہیں۔ اس نے کہا چھوڑو میں پھر کبھی بتا دوں گا؟ تم اندازہ لگا سکتی ہو بچے بہت زیادہ ہوں گے۔ میں نے کہا بتاؤ تو کتنے ہیں؟ اس نے کہا 18، اٹھارہ بچے... اگر تم ان اٹھارہ کو ضرب دو ہمارے ووٹوں کا کیا بنے گا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ خالصتان کے نام پر تم نے (ہندوؤں نے) سکھوں کو نظرانداز کر دیا اور پھر تم دوسروں کو خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ تو دیش بھگتی نہیں، یہ کرسی بھگتی ہے۔ دیش بھگتی تو یہ ہے کہ تم پورے ہندوستان کو آزاد سمجھو، ہندوستان ایک گورودوارہ تحریک کی بنا پر آزاد ہوا اور تحریک آزادی کے جرم میں جن 117 لوگوں کو تختہ دار پر چڑھایا گیا ان میں 92 سکھ تھے۔ 117 میں سے 92 سکھ، تم خود ہی اس شرح کا اندازہ لگا سکتی ہو، یہ لوگ، کیا یہ جنگ جوٗنسل (Martial Race) سے تھے، یہ بہت طاقت وَر لوگ ہیں، ہمیں انھیں ساتھ ملا کر رکھنا چاہیے۔ ہماری سیانی عورتیں کہتی ہیں اگر ایک گائے سمجھ دار ہے اور دودھ دیتی ہے تو کبھی کبھی اس کی لات کھانے میں کیا حرج ہے۔ یہی ہمارے معاملے میں ہے۔ لیکن وہ جو دودھ نہیں دیتی اس کی پروا کس کو کرنا چاہیے؟



MashalBooks.com

6

بچے

MashalBooks.com

MashalBooks.com

تقسیم کی جو تاریخ میں نے دیکھی، اس میں بچوں کے بارے میں کچھ ذکر نہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، تاریخ کے موضوع کے طور پر بچوں کا سامنا کرنا بہت مشکل ہے۔ مورّخ یہ سوال کر سکتا ہے کہ بچوں پر جو گزری اسے کیسے بیان کرو گے۔ بچے بن کر؟ تاریخ کے آلہ کے طور پر یادیں زیادہ تر قابل اعتماد نہیں ہوتیں۔ ان سے حقائق سامنے نہیں آتے۔ بچپن کی یادیں بلوغت کے تجربات سے چھن کر آتی ہیں۔ اس طرح یہ خودنوشت کے طور پر تو قابل قبول ہو سکتی ہیں لیکن ضروری نہیں کہ انھیں تاریخ بھی مان لیا جائے۔ پھر ہم بچوں کے تجربات کی تفہیم کس طرح کرتے ہیں؟

جہاں تک تقسیم کی تاریخ کا تعلق ہے، اس میں یہ بات خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ اس تاریخ کا اتنا زیادہ حصہ بچوں کے گرد گھومتا ہے کہ اس کا نظر نہ آنا الم ناک ہے۔ بھارت اور پاکستان بچوں کے لیے اس طرح نہیں لڑے جس طرح عورتوں پر یا ہر یجنوں کے معاملے پر لڑے حالانکہ یہ اغوا شدہ بچے ہی تھے جنھوں نے سب سے بڑا چیلنج کھڑا کیا، کیوں کہ جس طرح ایک اغوا شدہ اور بے آبرو کی جانے والی عورت مذہب کے دائرے میں واپس لائی جا سکتی ہے اور یہ کہہ لیجیے ''پاک'' کی جا سکتی ہے، ایک بچہ جس میں دو مذاہب کا خون یکساں مقدار میں مل گیا ہو، اسے اتنی آسانی سے دوبارہ جنم نہیں دیا جا سکتا۔ اگر تعداد کی کوئی اہمیت ہے تو وہ ہمیں بچوں کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر سکتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تقسیم کے وقت 75 ہزار سے ایک لاکھ تک عورتیں اغوا کی گئیں، اس تعداد کے صرف ایک معمولی حصے کو تلاش کرنے میں 10 سال لگے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ان میں سے نصف عورتوں کے بچے ہوئے تو ان کی تعداد 50 ہزار بنتی ہے۔ اور ان کے علاوہ بہت سے ایسے بچے بھی تھے جو چھوڑ دیے گئے یا پیچھے رہ گئے — ان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ کیا ہم اس تاریخ کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔

لیکن بیش تر ریکارڈ بچوں کے بارے میں معلومات سے تہی دامن ہے، تقریباً ہر اس شخص نے جس سے میں ملی، سینکڑوں چھوڑے گئے بے یار و مددگار اور گم شدہ بچوں کا ذکر کیا۔ کچھ وہ جو گھر والوں سے چھوٹ گئے اور کچھ وہ جو اغوا کر لیے گئے۔ ان میں سے کچھ ہسپتالوں میں تھے اور انھیں کبھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ ان کے گھر والوں کے ساتھ کیا بیتی۔ بعض کے تمام رشتے دار مارے گئے۔ یونائیٹڈ کونسل آف ریلیف اینڈ ویلفیئر کا ریکارڈ اکٹھا کرنے والی ایک کارکن ساوِتری مکھیجانی نے اس وقت کا ذکر کیا جب لاہور میں ایک بڑا کیمپ بند کیا گیا۔ اس وقت تقسیم کے چند ماہ بعد وہ دہلی میں سکول آف سوشل ورک کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ کیمپ بند ہونے کے کچھ ہی وقت بعد انھیں معلوم ہوا کہ کچھ بچے پیچھے رہ گئے ہیں، بظاہر جن کا کوئی نہیں ہے۔ ان کا کیا کیا جائے؟ انھیں دہلی بھیج دیا گیا اور مردولا سارا بھائی نے انھیں ایک گھر میں رکھ لیا۔ اس کے بعد سکول آف سوشل ورک کے سماجی کارکنوں نے آل انڈیا ریڈیو سے انھیں اپنانے کی اپیل نشر کرائی۔ بہت بڑی تعداد میں پوسٹ کارڈ آنا شروع ہوئے، لیکن یہاں بھی روزمرہ زندگی کی طرح ہر کوئی لڑکے کو اپنانا چاہتا تھا۔ اور یہاں معاملہ یہ تھا کہ معمول کے مطابق ان بچوں کی اکثریت لڑکیوں کی تھی۔ اب کیا کیا جائے؟ آخرکار اکثر کو اپنا لیا گیا اور پھر ایک دن ایک شخص آیا اور ان سے کہنے لگا جو چھوٹی سی بچی وہ لے کر گیا تھا، وہ بہت شرارتی ہے۔ سماجی کارکنوں کا کہنا تھا کہ بیش تر لوگ ان بچوں کو اپنانے کے بجائے ان سے گھریلو کام لینے کی نیت رکھتے تھے۔ شرارتی ہونا ہرگز پسندیدہ نہیں تھا۔ ساوِتری کو بالکل یاد نہیں کہ اس چھوٹی سی بچی کے ساتھ کیا ہوا۔ تاہم اسے یہ یقین تھا کہ جہاں نوعمر لڑکوں کو قانونی طور پر اپنانے میں ترجیح دی جاتی تھی، وہاں نوعمر لڑکیوں کی بھی بعض ''دوسری خدمات'' کے لیے کافی طلب تھی۔ اس نے بتایا:

> جب ہم دہلی آئے تو میں سماجی کام کیا کرتی تھی۔ ہم ابھی دہلی پہنچے ہی تھے کہ ہمیں معلوم ہوا کہ ہندوؤں نے نقل مکانی کی ہے اور بعض بھارتی ڈاکٹروں کو کیمپوں میں مقیم ہندوؤں کی مدد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ پاکستان کے پاس ڈاکٹروں کی کمی تھی۔ جب وہ لوگ کیمپ بند کر رہے تھے تو ایسا وقت بھی آیا کہ کیمپ میں آٹھ یا دس لڑے باقی رہ گئے۔ بھارتی ڈاکٹر

انھیں بھارت لے آئے کیوں کہ وہ انھیں وہاں نہیں چھوڑ سکتے تھے، خواہ ان میں کوئی مسلمان ہی ہوتا، تاہم انھیں پتہ تھا کہ یہ ہندو بچے ہی ہیں۔ اس وقت تک رامیشوری نہرو اور رکشا سرن ایک گھر چلا رہے تھے۔ ان بچوں کو وہاں ٹھہرایا گیا اور سکول میں ہمارے ایک اُستاد نے آل انڈیا ریڈیو سے یہ اپیل نشر کی کہ ہمارے پاس یہ آٹھ یا دس بچے ہیں، کیا کوئی رضا کارانہ طور پر انھیں اپنائے گا۔ آٹھ دس کی تعداد کوئی زیادہ نہیں ہوتی۔ میں اس وقت سکول میں تھی کہ پوسٹ کارڈ آنا شروع وہ گئے۔ ہر شخص لڑکے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ پھر ان کا یہ تقاضا بھی تھا کہ لڑکا خوب صورت اور صحت مند ہونا چاہیے۔ کوئی بھی لڑکی نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال ایک آدمی آیا اور ایک لڑکی کو لے گیا۔ لیکن دو تین روز بعد وہ لڑکی کو یہ کہہ کر واپس دے گیا کہ یہ بہت شرارتی ہے۔ اب اگر بچے شرارتی نہیں ہوں گے تو کیا ہوں گے... مجھے نہیں پتہ کہ پھر ان بچوں کا کیا ہوا، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ ہندو والدین اپنے بچوں کو چھوڑ گئے۔ آپ جانتے ہیں لوگوں کی ذہنی ساخت بدل گئی تھی۔ اہم بات اپنی جان بچانا تھا، چنانچہ بچوں کو چھوڑ آئے۔

تقسیم کے کئی دہائیوں بعد میری ملاقات ترلوک سنگھ سے ہوئی۔ وہ 9 برس کا تھا جب اس کے باپ اور دو چچاؤں نے فیصلہ کیا کہ بھارت فرار ہونے کے لیے وہ اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیں۔ ان کے دیہات پاکستان کے حصے میں چلے گئے تھے۔ سکھوں پر پہلے ہی حملے ہو رہے تھے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ تشدد قریب آتا جا رہا تھا۔ ترلوک کا چچا منگل سنگھ اور اس کے دونوں بھائی جانتے تھے کہ وہ فرار کی کوشش کر سکتے ہیں (یا اس کوشش میں مارے جا سکتے ہیں) لیکن ان کی عورتوں اور بچوں کے لیے کوئی موقع نہیں ہے۔ انھوں نے جو فیصلہ کیا وہ ان دنوں ہندوؤں اور سکھوں میں عام ہو گیا تھا، یعنی ان لوگوں کو قتل کر دیا جاتا جو کمزور ہیں۔ ان میں عورتیں بچے اور بوڑھے شامل تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ ان کی وجہ سے فرار مشکل ہو جاتا بلکہ یہ وجہ بھی تھی کہ عورتوں کی آبروریزی ہو سکتی ہے اور کمزور ہونے کی وجہ سے ان کو مذہب تبدیل کرنے کے لیے بھی مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں ان کے مذہب کی توہین

کے مترادف ہوتیں (اور ان کی مردانگی کے بھی)۔ بچے بھی تبدیلی مذہب کا شکار بنائے جا سکتے تھے یا محض انھیں اغوا ہی کر لیا جاتا۔ یہ دونوں مذاہب میں واقع ہو چکا تھا اس لیے یہ محض کوئی تصوراتی خوف نہیں تھا۔

ترلوک نے اپنے بڑوں کو ہونے والی خاندانی اموات پر بحث کرتے سنا۔ وہ اسے شہادت قرار دے رہے تھے۔ 9 بجے کے قریب اس نے سوچا کہ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ اور چچا سے کہا کہ وہ فرار ہونے اور راستے میں مارے جانے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہے۔ اسے کوشش کرنے کا موقع دیا جائے۔ انھوں نے یہ موقع دے دیا لیکن گھر کے باقی افراد کے لیے یہ انتخاب نہیں تھا۔ ان میں سے 17 افراد اپنے مردوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ ترلوک بچ نکلا۔

جب میں اسے ملی تو ترلوک امرت سر سے بہ مشکل 30 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں میں رہتا تھا، جہاں اس کی کپڑے کی دُکان تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ اس وقت کو بھولنا چاہتا ہے مگر بھلا نہیں پاتا۔ اپنے باپ اور ایک چچا کی وفات کے بعد وہ اور منگل سنگھ اصل خاندان کے دو ہی افراد باقی رہ گئے تھے۔ اب دونوں کے نئے خاندان ہیں اور قدرتی طور سے ان میں سے کسی خاندان کو ان اذیتوں سے کوئی دلچسپی نہیں جن سے یہ دونوں گزرے۔ ایک پُرتجسس شراکت کے تحت ترلوک اور اس کا چچا مسلسل رابطے میں رہے، لیکن شاذ ہی کبھی دونوں نے اس وقت کی کوئی بات کی ہو۔ دونوں ہی اس دغا کو سمجھتے ہیں جو ان کے تعلقات کی تہہ میں ہے۔ اگر اس کا چچا اس کی استدعا نہ مانتا تو ترلوک بھی اپنے دوسرے اہل خاندان کی طرح ہلاک کر دیا جاتا۔ جب وہ منگل سنگھ سے ملتا تھا تو اسے اس بات کا علم ہوتا تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں مارا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دونوں ایک قسم کی سازشی خاموشی کے رشتے میں بھی بندھے ہوئے تھے۔ وہ اموات ہر وقت ان کے گرد منڈلاتی رہتی تھیں، لیکن انھوں نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ کبھی کبھی جب منگل سنگھ سالانہ پاٹھ (تمام مرنے والوں کی یاد میں 2 گھنٹے کی عبادت) کے لیے گولڈن ٹیمپل جاتا تو ترلوک بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ دعا کرتے اور خاموشی سے مرنے والوں کو یاد کرتے اور اپنے گھروں کو لوٹ آتے۔ اس نجی زیارت میں خاندان کا کوئی دوسرا رُکن ان کے ساتھ نہیں جاتا تھا۔

☆☆☆

ترلوک کی کہانی غیر معمولی نہیں تھی۔ ان میں سے بہت سے لوگ جن کی کہانیاں میں نے سنیں اور جو اَب 50 کے پیٹے میں تھے، اُس وقت بچے تھے۔ وہ یہ کہانیاں بالغ کے طور پر سناتے تھے۔ ان تجربات کو بیان کرتے جو ان کو بچپن میں پیش آئے۔ بڑے لوگوں کے برعکس بچوں کے پاس ان تجربات کو بیان کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ انھیں خود بھی سمجھ سکیں یا دوسروں کو بتا سکیں۔ ترلوک کو بھی ان واقعات کو بیان کرنے کے قابل ہونے میں کئی برس لگ گئے جو اسے پیش آئے۔ بہت سارے بچے یتیم خانوں یا بے سہارا بچوں کے گھروں میں پروان چڑھے۔ کچھ نے اپنی زندگی گلیوں میں گزار دی۔ چند ایک کو گھروں میں لے پالک بننے کی رعایت بھی ملی۔ اپنی بیش تر زندگی میں غالباً انھیں کوئی نہیں ملا جسے وہ اپنے تجربات کی روداد سناتے، نہ ہی شاید وہ اس قابل تھے۔ اذیت و تکلیف کے تجربات سے گزرنے والے بالغ افراد کے پاس مختلف تجربات کی تاریخ ہوتی ہے۔ کچھ اپنے تجربات، کچھ دوسروں کے جن کی مدد سے وہ اپنا تجربہ بیان کر سکتے ہیں لیکن بچوں کے پاس ایسا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ جدائی کی لعنت، اپنی زندگی کی اس زبردست چیر پھاڑ کی لعنت، وہ اسے کہاں تلاش کریں؟ تقسیم سے بچ نکلنے والے بہت سے بچے شدید نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئے۔ انھیں معلوم ہوا کہ وہ اب خاندانوں میں نہیں رہ سکتے۔ کلونت سنگھ بھی ایسا ہی ایک بچہ تھا۔

جب میں کلونت سے ملی تو وہ 60 سال کا ہونے والا تھا۔ ایک نرم مزاج، لمبا اور دُبلا آدمی جس کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ اس کا ایک بازو کہنی تک کٹا ہوا تھا۔ تقسیم کا ایک ورثہ! اس نے ہمیں بتایا کہ وہ ایک ہسپتال میں ٹیکنیشن کے طور پر کام کرتا ہے اور باقی وقت پوجا پاٹھ اور سماجی کاموں میں صرف کرتا ہے، ایک طرح سے گرونانک کا شکریہ ادا کرنے کا طریقہ کہ اس نے اس کی جان بچائی، اس کا زندہ رہنا ممکن بنایا۔

کلونت سنگھ اپنے وقت میں سے دو یا تین گھنٹے دہلی کے سیس گنج گوردوارے میں سماجی کاموں پر لگاتا تھا۔ وہ ہر روز وہاں جاتا، فرش دھوتا اور صاف کرتا، کاؤنٹر کی نگرانی کرتا جہاں لوگ اپنے جوتے چھوڑ جاتے، اور ہر وہ کام کرتا جس کا اس سے تقاضا کیا جاتا۔ تقسیم اس کے لیے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ایک دردناک تجربہ تھی۔

اس کے تقریباً تمام اہل خانہ مارے گئے تھے۔ اسے یاد ہے کہ وہ اپنے مردہ باپ کے پہلو میں پڑا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف مشعلوں کی حدّت بڑھتی جا رہی تھی۔ حملہ آوروں کو روکنے کے لیے اس کے گاؤں والوں نے کانٹوں کی باڑ لگا دی تھی لیکن یہ کوئی رُکاوٹ ثابت نہ ہوئی اور کلونت کو یاد ہے کہ اس کے ایک طرف کانٹے تھے اور دوسری طرف شعلے:

> میں چھوٹا تھا، میری ماں نے میرے باپ کو قتل ہوتے دیکھا۔ انھوں نے اس کے سینکڑوں ٹکڑے کر دیے۔ پہلا وار گردن پر کیا، اس کے بعد اس کے سینکڑوں ٹکڑے کر ڈالے۔ اس وقت میں کانپ رہا تھا۔ میرے قدموں میں بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر طرف آگ لگ رہی تھی۔ پیاس سے میری جان نکلی جا رہی تھی۔ انھوں نے میری آواز سنی۔ میری ماں نے اس کے ہاتھ پکڑے اور میری چاچی نے پاؤں۔ چھ ماہ کی بیٹی۔ سب سے پہلے انھوں نے ارداس کی۔ اور اسے آگ میں پھینک دیا۔ پھر انھوں نے کہا، بی بیو، ہماری عزت خطرے میں ہے۔ ہم اپنی عزت اور بچوں میں سے ایک کو بچائیں گے۔ اور اس کے بعد ایک ایک کر کے انھوں نے اپنے تمام بچے آگ میں پھینک دیے۔ میری ماں نے پکڑ کر مجھے اپنے باپ کی لاش کے نیچے چھپا دیا۔ چاروں طرف آگ تھی اور مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی، اور گرمی کی وجہ سے میری ٹانگیں جلنے لگیں۔
>
> (کچھ دیر بعد) میں اُٹھ بیٹھا۔ میرا ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ میرا جسم جلا ہوا تھا۔ میں نیچے آ گیا۔ پھر انھوں نے مجھے اُٹھایا۔ جب وہ مجھے لائے تو میں کانٹوں پر چل رہا تھا۔ بہت بڑے کانٹے، لیکن اس وقت مجھے ان کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

کلونت نے ایک سال سے زیادہ عرصہ، مارچ 1948ء تک، راولپنڈی کے ہسپتال میں گزارا۔ جب وہ ٹھیک ہوا تو دہلی اپنے رشتے داروں کے پاس آ گیا لیکن یہاں آ کر خاندان میں بسنا مشکل محسوس ہوا۔ اس پر اس کے رشتہ داروں نے ایک آشرم سے رجوع کیا اور کلونت سنگھ کو وہاں داخل کرا دیا۔

MashalBooks.com

پھر اس کے بعد میں واپس آیا اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ دو تین برس تک رہا۔ لیکن معاملات زیادہ اچھے نہیں تھے اور میرے چچا کے بیٹے ترلوک سنگھ نے یہ کہتے ہوئے مجھے آشرم میں داخل کرانے کی تجویز دی کہ میں بہت دُکھی ہوں۔ پھر میں یہاں آشرم کے ایک ہوسٹل میں داخل کرا دیا گیا۔ اس جگہ پہلے سبزی منڈی ہوتی تھی۔ پھر کستوریا نکیتن بن گیا۔ میں ہوسٹل میں تقریباً 16 سال رہا۔ میں نے میٹرک پاس کیا۔ پھر میں نے 5 ہزار روپے یا کم وبیش رقم کا کلیم داخل کیا۔ اس کے بعد مجھے کوارٹر ملا رہنے کے لیے اور پھر مہاراج کی مہربانی سے مجھے جے پی ہسپتال، مولانا آزاد میڈیکل کالج میں ملازمت مل گئی۔ تب سے میں ملازمت کر رہا ہوں۔ یہ میری زندگی ہے۔

جب ایک دفعہ وہ دہلی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو کلونت حکومت کے آبادکاری پروگرام کے بہت سارے موضوعات میں سے ایک بن گیا۔ اسے ایک یتیم خانے میں رکھا گیا جہاں وہ اتنا بڑا ہونے تک رہا کہ ملازمت تلاش کر سکے۔ اس کام میں بھی ریاست نے اس کی مدد کی۔ بے گھر افراد اور شرنارتھیوں کو ملازمتوں میں ترجیح دی جاتی تھی۔ کلونت بھی انہی خوش نصیبوں میں سے تھا۔ اس کی مستقل سرکاری ملازمت اسے معقول اور آرام دہ زندگی گزارنے کے قابل بناتی ہے۔

اگر کلونت خوش قسمت تھا کہ ریاستی بہبود پالیسیوں سے حصہ لے رہا تھا تو بہت سے دوسرے لوگ اس کی طرح خوش نصیب نہیں تھے۔ ان کے لیے ''اس وقت'' کا تجربہ حواس باختہ کر دینے والا اور ناقابل فہم تھا۔ مجھے مراد کی کہانی یاد ہے۔ جسے یہ پتہ نہیں تھا کہ تقسیم کے وقت اس کی عمر کتنی تھی، تاہم اس وقت وہ بچہ تھا۔ جب ستی کھنہ اور پیٹی چیپل نے مراد سے انٹرویو کیا تو اس وقت وہ چالیس کے پیٹے میں تھا اور لاہور میں تانگہ چلاتا تھا۔

''اس نے میرا خیال رکھا۔ ایک سکول ماسٹر نے مجھے قبول کیا اور میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ میرے رشتہ داروں سے بھی زیادہ میرا ہمدرد تھا اور میری ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ میں اس کے مویشی چراگاہ میں لے

جاتا تھا۔ پھر پاکستان اور بھارت کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوئی بھی مجھے رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ پھر میرا تایا بادلِ نخواستہ مجھے ساتھ لے گیا۔

میں کھیل کود کا بہت زیادہ شوقین تھا۔ ہمارے گاؤں میں کچھ سکھ رہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں ہر وقت کھیلتا رہتا ہوں۔ اور باہر گولیاں چلتی رہتی ہیں۔ میں مارا جا سکتا ہوں۔ لیکن میں ہر وقت کھیلتا رہتا تھا۔ میرے ماموں مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ باہر کھیلتے ہوئے مارا جاؤں گا۔ ایک دن ہم گھر کے اندر تھے۔ میرے ماموں آئے اور بیٹھ گئے۔ سکھ آ گئے۔ ان کی بیٹی کی...

پہلے انھوں نے میرے ماموں کو قتل کیا۔ میں نے سوچا میں بھی مارا جاؤں گا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ پیچھے گنے کا پھوگ پڑا ہوا تھا، میں اس کے اندر گھس گیا۔

مراد کو اس کے ایک اور ماموں نے وہاں سے نکالا۔ پھر اکٹھے وہ نزدیکی کیمپ تک گئے۔ یہ واحد جگہ تھی جہاں وہ نسبتاً محفوظ رہ سکتے تھے۔ ''یہ بڑی دردناک صورت حال تھی۔'' اس نے کہا، ''اگر وہ کسی مسلمان کو دیکھ لیتے تو مار ڈالتے تھے۔ کیمپ کے نزدیک گنے کا کھیت تھا، لیکن کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ ہم بس زمین پر لیٹے لیٹے وقت گزارا کرتے۔''

مراد کی کہانی ان ہزاروں لاکھوں بچوں کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے جن کی زندگیاں تقسیم کے نتیجے میں برباد ہو گئیں۔ کیمپ میں رہتے ہوئے ایک روز وہ پاکستان جانے والی لاری میں بیٹھ گیا۔ اسے یاد ہے کہ سرحد پر ڈرائیور نے اسے اُتار دیا اور کہا کہ اپنا راستہ پکڑو۔ ''کہاں جاؤں،'' میں نے سوچا، ''مجھے راستے کا پتہ نہیں تھا۔'' وہ کسی کے پیچھے پیچھے چل پڑا جو لگتا تھا کہ راستہ جانتا ہے۔ وہ بچہ تھا لیکن پیسوں کی اہمیت سے واقف تھا۔ ''جو چند سکے میرے پاس ہیں، میں انھیں اس خرچ نہیں کروں گا۔ حالات زیادہ خراب ہوئے تو ان کی ضرورت پڑے گی۔ ہر طرف موت اور تباہی میں ٹھوکریں کھاتے آگے بڑھتا رہا۔ سرحد کے قریب اٹاری پر اسے ایک بوڑھی عورت ملی۔ اس نے اسے کہا، ماں میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ تم کہاں سے آئے ہو، اس نے پوچھا۔ مراد

نے کہا کنویں سے پاتال تک۔ اس نے اسے روٹی دی، چھت کی پیش کش بھی کی لیکن مراد آگے بڑھ گیا۔ اس نے کہا، میرا کوئی گھر نہیں ہے، اور چل پڑا۔

کئی برسوں تک مراد مفلسی کی زندگی گزارتا رہا۔ کبھی کبھار اسے کام مل جاتا۔ کبھی سبزی منڈی میں دوسرے کی مدد کرنے کا کام۔ ایک مرحلے پر وہ لاہور آ گیا جہاں اس نے چھکڑا اور تانگہ بانوں کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اسے فی گھوڑا دو آنے ملتے تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ اس نے کہا، ایک دن اس نے تانگہ بانوں کے چودھری سے پوچھا کہ کیا وہ اسے تانگہ چلانے کی اجازت دے دے گا۔ اسے بتایا گیا کہ اسے سڑکوں کا پتہ نہیں، لیکن خوش قسمتی اس کے ساتھ تھی۔ ایک چھکڑا بان کام چھوڑ کر چلا گیا اور کوئی اس کی جگہ لینے والا نہیں تھا۔ اور مراد کو بتایا گیا کہ وہ اس کی جگہ لے سکتا ہے۔ مراد نے ایسا ہی کیا، وہ شہر کے راستوں کے بارے میں مسافروں اور راہ گیروں سے پوچھتا۔ بالآخر اب اس کے پاس ملازمت بھی تھی، کچھ رقم بھی اور ایک قسم کی زندگی بھی۔

"تقسیم کے بارے میں سوچنے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے،" مراد نے کہا۔ اس وقت کی سب سے بڑی یاد اس کا وہ خوف تھا کہ اس کے پاس کوئی سہارا نہیں تھا۔ کوئی رقم نہ خاندان۔ اس نے پوچھا، تم آخر کہاں جاؤ گے جب تمھارے پاس کہیں جانے کو کوئی جگہ ہی نہ ہو۔ اس نے پریشان راتیں گزاریں خاص طور پر میلوں ٹھیلوں کے دِنوں میں۔ اسے تقسیم کے بارے میں اور جگہ چھوڑ کر چلے جانے کے بارے میں ہونے والی بحثیں یاد ہیں۔ لیکن کہاں چلے جائیں؟ آخر ہم کہاں جا سکتے ہیں؟ وہ کہتے تھے کہ اپنے پاکستان چلے جاؤ۔ میں پوچھتا تھا پاکستان کہاں بنے گا۔ وہ جواب دیتے کہ لاہور کے آس پاس۔ لیکن میں نے لاہور نہیں دیکھا تھا۔ لوگ پوچھتے تھے کہ کیا لاہور کسی شہر کا نام ہے۔ میں نہیں جانتا تھا۔ میں وہاں کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ لیکن وہ اصرار کرتے تھے کہ تمھیں لاہور جانا ہوگا۔ لیکن کیوں؟ میں جہاں پیدا ہوا ہوں وہی میرا لاہور ہے، لیکن پھر ہمیں لاہور جانے پر مجبور کر دیا گیا۔

☆☆☆

تقسیم کے بچے۔ ان کی کہانیاں سنتے یا محض ان کے بارے میں پڑھتے

ہوئے مجھے خود کو مسلسل یہ یاد دِلاتے رہنا پڑتا تھا کہ ہم بچوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ بالغوں کی سنائی گئی یہ کہانیاں اس ماجرے پر مبنی تھیں جو ان پر بچوں کے طور پر بیتا تھا۔ چھ، آٹھ، نو، گیارہ، دس۔ ان کی یہی عمریں تھیں۔ ایسے معاملات میں یادداشت جو کردار ادا کرتی ہے میں اس پر اکثر حیران ہوتی تھی۔ لوگ آخر کتنی پُرانی بات یاد رکھ سکتے ہیں اور ان کی یادداشت آخر کس حد تک صحیح ہو سکتی ہے۔ کیا ان میں سے کوئی اس وقت کو یاد کرنے کی خواہش بھی کر سکتا ہے؟ سچ پوچھیے تو یہ کہ کیا اس معاملے میں اس کے پاس کوئی حق انتخاب ہے؟ اگر وہ بچے تھے تو ان کا حافظہ کس حد تک قابل اعتبار ہے؟ کیا ان کی کہانیاں بچپن کی من گھڑت باتیں سمجھ کر مسترد کی جا سکتی ہیں؟ ان سوالات کا جواب دینا مشکل ہے۔ جب کلونت سنگھ نے بتایا کہ سب سے پہلے اس کے خاندان کی عورتوں نے بچوں کو قتل کیا اور پھر اپنی جان لی۔ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ یہ محض الفاظ ہیں اور ایک بالغ کی تشریح۔ ایک بچے کے طور پر کیا اس نے وہ سب دیکھا ہوگا جس کی وہ بات کر رہا ہے۔ کیسے حافظے کے بل پر ساری تفصیل از سرِ نو مرتب کی جا سکتی ہے؟ یا پھر یہ اس کا بالغ ذہن ہے جو اس وقت کی سنی گئی باتوں کو کہانی کی شکل دے رہا ہے؟

لیکن اس کی بیوی نے ہمیں بتایا کہ اسے ابھی تک ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ آدھی رات کو اپنے اردگرد بھڑکتے شعلوں کی حدّت سے، جیسے کہ 1947ء میں اپنے باپ کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا، اُٹھ بیٹھتا ہے۔ بھوگل (دہلی) میں رہنے والا ایک اور سکھ جو، جب وہ بچہ تھا، قتل عام کے ایک واقعے کا جزو رہا ہے۔ اکثر اوقات رات کو چیختے ہوئے اُٹھ بیٹھتا ہے۔

اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ ان مسلمانوں کی چیخیں کبھی نہیں بھول سکتا جنھیں قتل کرنے میں وہ مدد دیتا رہا۔ کیا ترلوک سنگھ سچ مچ اپنے چچاؤں اور باپ کے سامنے اپنی منت سماجت اور پھر اپنے فرار کی ساری تفصیلات اسی وضاحت سے یاد کر سکتا ہے جس طرح وہ سب ہوا تھا؟ یا پھر دوسروں کی بیان کردہ تفصیلات سے اخذ شدہ کہانی ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا ان کو سنجیدگی سے لیا جانا چاہیے یا نہیں؟ میرے پاس بس سوالات در سوالات ہیں۔

MashalBooks.com

☆☆☆

نومبر 1948ء میں انیس قدوائی نے دہلی میں ارون ہسپتال کا دورکیا۔ وہ بے یارو مددگار بچوں—— تقسیم کے بچوں—— کی تلاش میں تھی۔ جامعہ کے افراد کا ایک گروپ، جس میں قدوائی کی سہیلی جمیلہ بیگم بھی شامل تھی، ان بچوں کو سایہ فراہم کرنے کے لیے اکٹھا ہوا تھا۔ قدوائی کو ہسپتال میں ہر عمر کے بچے ملے۔ کسی کا سر زخمی تھا، کسی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اور کسی کا بازو۔ ایک چھوٹی سی بچی، جو قدوائی کے مطابق پانچ سال سے زیادہ کی نہیں تھی، خوش باش بیٹھی کھیل رہی تھی۔ قدوائی نے اسے پوچھا، تم بہت خوش ہو۔ اس نے کہا: ہاں، میں یہاں اپنی چچی (دراصل آیا) کے ساتھ آئی تھی لیکن وہ اب مر چکی ہے۔ اس کے بعد اس نے دوسروں کا تعارف کرانا شروع کر دیا۔ یہ راشد ہے، اس کے گھر کا ہر شخص مر چکا ہے۔ یہ زینب ہے، اس کا خاندان بھی مارا گیا۔ اور وہ نبّو ہے، اس کی ماں کا انھوں نے گلا کاٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ ان بچوں کے لیے گھر تلاش کرنے کے لیے قدوائی کی کوشش ایک نجی منصوبے کا حصہ تھی۔ ایک سماجی کام جو متعلقہ شہری کر رہے تھے۔ اس قسم کے بہت سے اقدامات ہوئے لیکن چونکہ ان کا ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا اس لیے یہ جاننا مشکل ہے کہ ان میں حکومت کا بھی کوئی کردار تھا یا نہیں۔ (اگرچہ حکومت نے بھی کئی گھر اور یتیم خانے بنائے) کسی نے مکان کا عطیہ دیا، کچھ نے وقت دیا اور قدوائی ہسپتالوں میں بچے تلاش کرتی رہی۔ ایک چھوٹے سے بچے نے بتایا کہ اس کا گھر لکھنؤ میں ہے۔ اسے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ فیروز گاندھی نے اسے لکھنؤ لے جانے اور اس کا گھر تلاش کرنے کی پیش کش کی۔ راستے میں بچہ پانی پینے کے لیے ایک سٹیشن پر اُتر گیا اور پھر بھاگتا ہوا واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ سٹیشن پر بہت سے سکھ ہیں اور اسے سکھوں سے ڈر لگتا ہے کہ وہ اسے مار ڈالیں گے۔ ایک اور کم عمر بچی کی کہانی مختلف تھی۔ اس سے اس کا نام پوچھا گیا تو اس نے کہا: سیتا حسینہ۔ باپ کا نام پوچھنے پر بھی اس نے آدھا ہندو اور آدھا مسلمان نام بتایا۔ یہ بچی کس گھر کی تھی؟ ہندو یا مسلمان؟ یا کسی ''مخلوط'' گھر کی؟ اب جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں لکیر کھنچ چکی ہے تو یہ بچی کہاں جائے گی؟ اگر وہ مسلمان ہے تو اس کا گھر پاکستان میں ہے۔ اور اگر ہندو ہے تو بھارت میں۔ سیتا

حسینہ نے اپنے لیے سرحد کھینچنے کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔ بالآخر گاندھی کے مشورے پر اسے دہلی کے کستوربا ٹرسٹ میں بھیج دیا گیا۔ لیکن ایسے تمام کیس اتنی آسانی سے حل نہیں ہوئے۔ اکثر اوقات بچوں کی تلاش مشکل ہوتی تھی۔ جب قدوائی انھیں دہلی کے ہسپتالوں میں تلاش کرنے نکلی تو یہ دیکھ کر اسے صدمہ ہوا کہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ ہر طرف یہ بات عام تھی کہ ہسپتال بچوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہر ہسپتال میں ان بچھڑے ہوئے بچوں کے لیے وارڈ تھے لیکن جب قدوائی وہاں پہنچی تو اسے پتہ چلا کہ وہاں کوئی بچہ نہیں تھا۔ یہ بچے کہاں گئے؟ میں ابھی تک یہ طے نہیں کر سکی۔ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ شاید وہ ٹھیک ہو کر کہیں چلے گئے؟ یا انھیں مشنری ادارے اپنے ساتھ لے گئے؟[1]

یہ موخر الذکر بات بے جا خدشہ نہیں تھی۔ اس وقت کی عمومی فضا میں جہاں تبدیلی مذہب ایک بدترین امکان تھا، مشنری ادارے خاص طور پر مشتبہ تھے۔ آر ایس ایس کی طرح یہ ادارے کیمپوں میں کام کرتے، امداد، طبی سہولیات اور دوسری مدد فراہم کرتے۔ لیکن جہاں آر ایس ایس واحد تنظیم تھی جو لوگوں کو ہندو بناتی تھی، جو کہ زیادہ قابل قبول امر تھا، مشنری اداروں کو غیر ملکی سمجھا جاتا تھا، جن کا ایجنڈا لوگوں کو ایک اجنبی مذہب، عیسائیت کے دائرے میں داخل کرنا تھا اور بچے خاص طور پر مغلوب ہو جاتے تھے۔ اکثر اوقات مجرموں کے گروہ بچوں کو اُٹھا لے جاتے اور انھیں عصمت فروشوں اور گداگری کرانے والوں کے ساتھ فروخت کر دیتے۔ بہت سے لوگوں کو یاد ہے کہ ان دِنوں شمال کے بڑے شہروں کی سڑکوں پر ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بچے نظر آتے تھے۔ لیکن اس معاملے پر روشنی ڈالنے کے لیے بہت کم ریکارڈ دست یاب ہے۔

بچوں کے اغوا کے لیے ہر قسم کی وجوہات بیان کی جاتی تھیں۔ اگرچہ اس کے حق میں کوئی یقینی شہادت نہیں ہے لیکن بھارت بھر کے سماجی کارکنوں کی یہ رائے تھی کہ مسلمانوں نے ہندو اور سکھ بچے زیادہ اغوا کیے جب کہ اس کے برعکس کم ہوا۔ اگر یہ سچ ہے تو ایسا کیوں ہوا؟ دیپتی سہگل اس کی توضیح یوں پیش کرتی ہے:

مجھے بتایا گیا کہ گجرات میں ایک نواب ہے جو اپنے تخت پر بیٹھ جاتا ہے

---

1. :انیس قدوائی: ''آزادی کی چھاؤں میں'' دونوں واقعات اس کتاب سے لیے گئے ہیں۔

اور اغوا کی جانے والی لڑکیاں اس کے سامنے سے پریڈ کرتی گزرتی ہیں اور جو زیادہ خوب صورت ہوتی ہیں، وہ انھیں چن لیتا ہے۔ جو نوجوان ہوتی ہیں انھیں وہ رکھ لیتا ہے، باقی کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ لڑکیاں کچھ نہیں کر سکتیں۔ کوئی احتجاج، کچھ نہیں۔ وہ کہتا ہے فلاں اور فلاں کو درجہ اوّل میں اور فلاں کو درجہ دوم میں رکھو اور جو سب سے عمدہ ہیں اُنھیں زنان خانے میں بھجوا دو۔ پھر میں نے سنا کہ وہاں اور لڑکے بھی رکھے گئے ہیں جن کے والدین قتل ہو چکے تھے۔ میں نے اس بارے میں سنا تو میں وہاں گئی اور کہا کہ یہ لڑکے واپس کرو۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ آخر تمھارا خاندان ہے۔ اس نے (نواب کی ایک بیوی نے) کہا، ہاں، میرے تین بیٹے ہیں۔ میں نے پوچھا پھر تم نے انھیں کیوں رکھا ہوا ہے۔ بولی اس کے پیچھے ایک طریقہ ہے۔ ہم خواہ مخواہ کسی کو نہیں اُٹھاتے۔ ہم کسی بے کار شے کو نہیں اُٹھاتے۔ انتخاب کرتے ہیں۔ اب یہ لڑکے میرے بیٹوں کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ ان کی ٹیوشنیں ہیں۔ (لڑکے میرے سامنے لائے گئے اور مجھے پیش کیے گئے۔ میں انھیں انگلینڈ بھیجوں گی کیوں کہ میرے پاس رقم ہے۔ یہ بچے اتنے ذہین ہیں کہ وہ میرے بچوں پر اثر ڈالیں گے اور جب یہ شادی کریں گے یہ دونوں لڑکے، تو ان کے بچے بہت ذہین ہوں گے...

دمینتی سہگل اور دوسرے سماجی کارکنوں کے مطابق ہندوؤں اور سکھوں کی زیادہ ذہانت کی داستان عام تھی۔ ان کے مطابق اس کی بُنیاد ہندوؤں اور سکھوں کی اقتصادی اور ذہنی کامیابیوں پر تھی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ روایت مسلمانوں کے ہوس ناک اور غاصب ہونے کی روایت کی معاصر تھی۔ اس گھسے پٹے تصور کے مطابق ہندو جسمانی طور پر کمزور تھے لیکن ان کی دماغی صلاحیت مضبوط تھی جب کہ مسلمان اس کے برعکس تھے۔ اگر یہ سچ تھا کہ بچے اسی وجہ کی بنا پر اغوا کیے جاتے تھے تو یہ بات بیک وقت دردناک بھی تھی اور ستم ظریفی بھی کہ جس طرح عورتوں کے جسم نسل کی توقیر اور بے توقیری کا ذریعہ بن گئے تھے اسی طرح بچوں کے جسم بھی۔ اور اس معاملے میں نر بچے ذہانت جیسی

غیر واضح شے کی منتقلی کا ذریعہ بن گئے اور یہ اس بات کی شہادت تھی کہ کس غیر محسوس طریقے سے گھسے پٹے نظریات لوگوں کے ذہنوں میں راسخ ہو جاتے ہیں۔

اگر بعض بالغ افراد بچوں کے طور پر خود پر بیتے تجربات بتانے میں مشکل محسوس کرتے تھے تو کچھ ایسے بھی تھے جو جان بوجھ کر خاموش رہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ تجربات بہت تلخ تھے اور انھیں یاد کرنا بہت مشکل تھا۔ جالندھر کے گاندھی وِنیتا آشرم میں مجھے ایک کامیاب خاتون ڈاکٹر کے بارے میں بتایا گیا جو آشرم کے کارکنوں کے مطابق آشرم ہی کی بچی تھی۔ اس کی ماں تقسیم میں بیوہ ہوگئی اور اپنے دو بچوں، ایک لڑکا ایک لڑکی، کے ساتھ آشرم میں آ گئی۔ بچے زیادہ وقت آشرم ہی میں گزارتے لیکن آشرم میں موجود دوسرے بیشتر بچوں کے برعکس انھیں مختلف درجے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے متعدد مراعات حاصل تھیں۔ مجھے پتہ چلا کہ ان کی تعلیم کا خرچہ آشرم نے ہی اُٹھایا جس سے بالخصوص لڑکی کو فائدہ پہنچا اور اسے میڈیکل کی تعلیم کے لیے سکالرشپ ملا۔ آشرم نے دیگر طریقوں سے بھی اس کی مدد کی۔ اب ایک شادی شدہ اور کامیاب میڈیکل پریکٹس کی حامل ہونے کی حیثیت میں وہ ماضی کی کوئی بات یاد نہیں کرنا چاہتی۔ وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے راضی ہوگئی لیکن یہ کہا کہ اس کا نام نہ آنے پائے کیوں کہ اس کے بچے اس کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور وہ بھی نہیں چاہتی کہ انھیں اس کا علم ہو۔ اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی شرم کی بات تھی بلکہ اس کے بہ قول اس لیے کہ وہ سیلف میڈ عورت ہے اور اگرچہ وہ اور اس کی ماں آشرم میں رہیں لیکن انھوں نے حکام سے کبھی خیرات نہیں لی۔ یہ کہانی اس سے بالکل مختلف تھی جو آشرم والوں نے مجھے بتائی۔

مجھے محسوس ہوا کہ خود کو آشرم کی بچی ظاہر کرنے میں اس کے خوف کی ایک وجہ عورت کے طور پر اس کا تشخص بھی ہے۔ اس کی ماں تقسیم کے بعد آشرم میں آئی تھی۔ ڈاکٹر کو یہ بتاتے ہوئے بڑی دقت ہو رہی تھی کہ اس کی ماں یہاں آنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے شوہر (جو بہ ظاہر فوج میں تھا) کی موت کے بعد اس نے پاکستان ہی میں رہنے کے لیے اصرار کیا لیکن اس کے مرد رشتے داروں نے اسے پاکستان چھوڑنے کا مشورہ دیا یا مجبور کیا۔ اس نے کبھی آشرم سے ملنے والی سہولیات قبول نہیں کیں۔ اسے شوہر کی پنشن

ملتی رہی۔ آشرم کی سہولیات یقیناً رقم تک ہی محدود نہیں تھیں۔ اس میں رہائش، تحفظ، بچوں کی تعلیم بھی شامل تھی لیکن ڈاکٹر ان میں سے کسی کا بھی اعتراف کرنا نہیں چاہتی تھی۔ خود کو آشرم کے بچوں سے دور رکھنے کی خواہش کا بھی اس سے تعلق تھا۔ آشرم کے بیش تر بچے اغوا شدہ عورتوں کے تھے، (میری ماں کا ان عورتوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا) داغ دار عورتوں کے۔ وہ ان سے بالکل مختلف تھی۔

بھارتی حکومت نے تقسیم کے بعد ایک زبردست امدادی کارروائی کا آغاز کیا۔ بیوہ یا تنہا ہو جانے والی عورتوں کو ریاست نے اپنی مستقل ذمہ داری بنا لیا۔ تقسیم کے بچوں کو بھی سہولیات ـــــ تعلیم، گھر، یتیم خانے، بعض اوقات اپنا لیا جانا ـــــ فراہم کی گئیں۔ لیکن آج کی اس کی کامیاب زندگی کے نقطہ نظر سے ڈاکٹر ان میں سے کسی شے کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کا انکار مجھے اس طبقے سے بھی جڑا ہوا محسوس ہوا جس سے وہ تعلق رکھتی تھی۔ تقسیم کے بعد وہ تقریباً مکمل طور پر بے مایہ ہو چکی تھی، اس لیے وہ خود کو سیلف میڈ عورت کے سوا کچھ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک ایسا تشخص جو سینکڑوں پنجابیوں کے لیے اہم ہے۔ چنانچہ اس بنا پر اس کے بچپن کی کہانی آج وجود نہیں رکھتی۔ اس کے بجائے وہ آہستہ سے خود کو ایک اور مختلف بچپن میں ڈھال رہی تھی۔ آشرم میں اس کی موجودگی ناقابل تردید تھی لیکن اس کی نوعیت تبدیل کی جا سکتی تھی۔ ڈاکٹر، کلونت سنگھ، مراد، ترلوک سنگھ ـــــ تقسیم کے بچوں کی بہت قسمیں ہیں۔

☆☆☆

اغوا شدہ عورتوں کے بچوں نے ایک اور طرح کے مسائل پیدا کیے۔ 1954ء میں بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان اس بات پر اتفاق ہوا کہ کسی بھی ملک میں بازیاب ہونے والے اغوا شدہ افراد کو زبردستی دوسرے ملک جانے کا نہیں کہا جائے گا۔ یہ ان کے ماضی کے فیصلے کے برعکس تھا جس میں طے کیا گیا تھا کہ بازیاب ہونے والی مغوی عورتیں چاہے جو بھی کہیں، انھیں ان کے متعلقہ ممالک جانا پڑے گا جس کا تعین مذہب کی بُنیاد پر کیا گیا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ بیش تر عورتوں کے بچے ہو گئے تھے جن سے وہ جدا ہونا نہیں چاہتی تھیں اور بہت سے خاندان ایسے تھے جو عورتوں کو تو واپس لینا چاہتے تھے لیکن بچوں کو نہیں۔

مغوی افراد کی تعریف وسیع تھی۔ بھارتی قانون سازی میں (مغوی افراد کی بازیابی اور بحالی ایکٹ 1949ء) سے طے کیا گیا تھا کہ ایک مغوی شخص کا مطلب 16 سال سے کم عمر ایسا لڑکا یا کسی بھی عمر کی ایسی عورت ہے جو گم ہے یا یکم مارچ سے ذرا پہلے تھا/تھی اور یا اس تاریخ کے بعد لیکن یکم جنوری 1949ء سے قبل سے اپنے خاندان سے بچھڑ گیا تھا یا بچھڑ گئی تھی۔ اور اب اس کی رہائش کسی دوسرے فرد یا خاندان کے پاس ہے اور وہ بچہ بھی اس زمرے میں شامل ہے جو مذکورہ تاریخ کے بعد کسی خاندان کے پاس رہنے والی عورت کے ہاں پیدا ہوا ہو۔ دوسرے الفاظ میں تقسیم کے وقت یا اس کے بعد کے برسوں میں کسی بھی فریق کے ہاتھوں اغوا ہونے والے بچے اور اسی طرح اغوا ہونے والی عورتوں کے ہاں تقسیم کے بعد پیدا ہونے والے بچے اور حتیٰ کہ ایک مذہب سے تعلق رکھنے والی عورتیں اور/ یا بچے جو دوسرے مذہب والوں کے ہاں پائے جائیں، مغوی شمار کیے جائیں گے۔

ان بچوں کا کیا ہوگا جو ابھی پیدا نہیں ہوئے؟ بازیاب ہونے والی بہت سی مغوی عورتیں حاملہ پائی گئیں۔ ایسا راستہ تلاش کیا جاتا تھا کہ ان عورتوں کو لوگوں کی نظروں سے بچے پیدا ہونے تک پوشیدہ رکھا جائے۔ پھر بچے ان سے جدا کر دیے جائیں یا اگر حمل ابتدائی زمانے میں ہے تو انھیں یہ ''فیصلہ'' کرنے میں مدد دی جائے کہ بچے کا کیا کرنا ہے۔ دمینتی بتاتی ہے کہ کیا کیا گیا:

> بازیاب ہونے والوں کے لیے ہم نے ہوشیار پور اور جالندھر میں کیمپ کھولے۔ یہ نوعمر لڑکیاں تھیں اور انھیں بازیاب کراتے ہوئے ہمیں ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ان میں سے بہت سی اُمید سے تھیں۔ یہ ایک بڑا مسئلہ تھا۔ ہم کیا کر سکتے تھے؟ ہم نے ان سے اس کے بارے میں کہا لیکن وہ زیادہ تر متامل ہوتیں۔ لیکن بہرحال یہ تو کرنا ہی تھا۔ (دمینتی کی مراد اسقاطِ حمل سے ہے لیکن وہ یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتی) لیکن وہ مائیں تھیں اور اکثر کہتیں، ہم یہ نہیں کرنا چاہتیں۔ وہ یہ بات مجھ سے بعد میں کرتیں۔ وہ کہتیں، مجھے بچہ پیدا کرنے دو، چنانچہ حکومت کو ان بچوں کے لیے (الہ آباد میں) شاردا بھون بنانا پڑا۔

یہ بچے مسلمان باپوں کے تھے، غیر مطلوب بچے۔ اکثر اوقات عورتیں مجھ سے کہتیں، میں یہ بچہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں، لیکن میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ میں کیسے جیوں گی۔ ہر شخص مجھ پر تھوتھو کرے گا۔ اور جو عورتیں سچ مچ حاملہ تھیں، ہم ان سے پوچھتے، تم چاہتی ہو کہ یہ بچہ ہٹا دیا جائے؟ آپ کو اس ہسپتال، کپور ہسپتال کا پتہ ہے ہم ان لڑکیوں کو ادھر صفائی کے لیے بھیج دیتے۔ میرا مطلب ہے جو اس کے لیے راضی ہوتیں۔

دمینتی کی بہن نے اس بات کی تصدیق کی۔ ''یہ حکومت کا قانون تھا۔'' اس نے کہا:

ان کا یہ پروگرام تھا لیکن اسقاطِ حمل غیر قانونی تھا۔ چنانچہ ماسی (مراد پریم وتی تھاپڑ سے ہے جو بازیابی کے آپریشن میں سینئر افسر انچارج تھی) نے ان سے کہا کہ یہ بڑا ظلم ہے، یہ لڑکیاں بہت ناخوش ہیں۔ اگر یہ بچے پیدا ہو گئے تو وہ کیا کریں گے۔ اس نے کہا میں کیا کر سکتی ہوں۔ یہ قاعدہ ہے۔ لیکن قرول باغ میں یہ ڈاکٹر کپور، اسے بتایا کہ اگر تم یہ کرو، یعنی اسقاط، تو تمھیں رقم ملے گی۔ اس رقم سے تمھارا ہسپتال بنے گا اور یہ بے چاری لڑکیاں بچ جائیں گی۔ چنانچہ ان لڑکیوں کو کپور ہسپتال بھیج دیا گیا جہاں غیر قانونی اسقاط ہوئے۔ وہ اس جرم میں جیل جا سکتا تھا، ایسی عورتیں بھی تھیں جنھوں نے اسقاط سے انکار کر دیا۔ وہ کہتی تھیں کہ اس طرف ہمارا کوئی نہیں ہے اور اِس طرف بھی ہمیں کوئی قبول نہیں کرے گا۔ ہمارے پاس اس بچے کے سوا کچھ نہیں۔

اگر کچھ عورتیں اسقاط پر راضی ہو گئی تھیں (اور حقیقت یہ ہے کہ جس سماجی کارکن سے بھی میں ملی اس نے وسیع پیمانے پر اسقاط حمل کے واقعات کی تصدیق کی، لیکن ہر کسی نے کہا کہ ان کا اس معاملہ میں حوالہ نہ دیا جائے۔ انھوں نے کہا، آپ کو پتہ ہی ہے اسقاط ان دِنوں غیر قانونی تھا) یا زیادہ صحیح الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسقاط پر راضی ہونے کے لیے مجبور ہو گئی تھیں۔ تو کچھ ایسی بھی تھیں جو بچوں کی ماں بن گئیں، یا جب انھیں

بازیاب کرایا گیا تھا تو وہ اس وقت تک ماں بن چکی تھیں۔ ان کے لیے یہ تھا کہ وہ اپنے بچے الہ آباد میں بچوں کے گھر میں دے دیں۔ بچوں کے ساتھ بہت مشکل تھا اور جب عورتیں اپنے بچوں کو ملنا چاہتیں تو ان کے رشتے دار چاہتے تھے کہ بچوں کو عزت سے جینے دیا جائے، اگر وہ ان بچوں کو ذرا بھی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ورنہ انھیں ان بچوں کو چھوڑنا پڑتا۔ یہ بڑا مسئلہ تھا۔ ہر کیس الگ تھا۔ مائیں وقت نکال کر بچوں سے ملنے جاتی تھیں۔ وہ وہاں کیا کرتی تھیں؟ ہمیں نہیں پتہ۔ وہ کیا محسوس کرتی تھیں؟ ہم انھیں ٹکٹ دے دیتے اور کہتے کہ جاؤ، اپنے بچوں سے جا کر ملو۔ ان بچوں کا مستقبل کیا تھا، کون جانتا ہے؟[1]

اور درحقیقت کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ہزارہا ایسے بچوں کا غائب ہو جانا تقسیم کی تاریخ کے بہت سے المیوں میں سے ایک ہے۔ کملا بہن پٹیل کے مطابق اگرچہ بہت سی عورتیں طبی معائنے کے لیے تیار ہو جاتی تھیں۔ بڑی عمر کی عورتیں جن کی عمر 35 سے زیادہ ہوتی تھی، اکثر اوقات اس میں شرم محسوس کرتیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ انھیں ان کے خاندان میں ایک خاص قسم کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور اب انھیں شرم آتی ہے کہ وہ اسقاط کے بعد واپس اپنے خاندان میں جائیں۔ اسی طرح اگر نئے تعلقات کے باعث ان کے بچے ہو جاتے تھے تو ان کو انھیں اپنے ساتھ رکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، کیوں کہ وہ ان کی موجودگی کی وجہ پہلے سے موجود بچوں کو کیا بتائیں گی؟ کم عمر کی عورتوں کے لیے خاص طور پر جو پہلی بار ماں بنی تھیں یہ اتنا بڑا مخمصہ نہیں تھا۔ ان کی اکثریت بچوں کو رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن یہاں ایک مختلف قسم کا مسئلہ تھا۔ کیا انھیں اس کی اجازت ملے گی؟ کملا بہن نے کہا:

جب ان عورتوں کے رشتے دار انھیں ملنے آتے تو یہ (عورتیں) ان سے ملاقات سے ہچکچاتیں۔ انھیں خود سے شرم آتی۔ بعض تو رو پڑتیں۔ انھیں پتہ تھا کہ اگر وہ اپنے ماں باپ کے گھر گئیں تو انھیں وہاں قبول نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ انھیں مشکل فیصلہ کرنا پڑتا کہ اپنے بچے چھوڑ دیں اور گھر

1 : دمینتی سہگل۔ ذاتی انٹرویو۔

چلی جائیں یا یہیں کیمپ میں رہیں۔ بہت سی عورتیں اپنے بچوں کو چھوڑ کر روتی ہوئی چلی گئیں۔

پھر اس کے بعد ان بچوں کے ساتھ کیا ہوا؟ کملا بہن نے بتایا کہ کس طرح بچوں کو ٹوکریوں میں ڈال کر اور ان پر چٹیں لگا کر جن پر ان کی تفصیلات درج تھیں، ہوائی جہاز سے روانہ کیا گیا۔

امرت سر اور دہلی کے درمیان ایک فضائی سروس تھی۔ ہم نے انھیں کہا کہ کیا وہ ان بچوں کو دہلی پہنچا دیں گے۔ وہ راضی ہو گئے۔ پھر ہم نے ہر بچے کو ایک ٹوکری میں رکھا، جس پر ان سے متعلقہ تاریخ والا لفافہ تھا۔ ٹوکری میں کچھ کپڑے اور دوسری اشیا بھی تھیں۔ یہ ٹوکریاں ایئر ہوسٹسوں کو دے دی گئیں، جنھوں نے یہ دہلی جا کر ہمارے کسی سماجی کارکن کے حوالے کرنی تھیں۔ وہاں سے انھیں پھر طیارے کے ذریعے الہ آباد بھیجا گیا۔ وہاں سے سماجی کارکنوں نے یہ ٹوکریاں ہسپتال پہنچا دیں۔ ہم نے اس طرح کوئی دو سو بچے وہاں بھیجے۔

اس بارے میں ہر قسم کی بحث ہوتی رہی کہ بچے کیوں اغوا کیے گئے۔ یا یہ کہ انھیں کیوں بازیاب نہیں کرایا جا سکا۔ مئی 1948ء میں اغوا کی جانے والی ایک تیرہ سالہ بچی کے باپ میر عنایت اللہ خاں نے بھارت میں پاکستانی ہائی کمشنر سے اس کی بازیابی میں مدد دینے کی اپیل کی۔ بہت سارے واقعات کی طرح اُسے بھی پتہ تھا کہ بچی کہاں ہے۔ اکثر اوقات اغوا کار مغوی بچوں کے اہل خانہ کے جاننے والے ہوتے تھے۔ عنایت اللہ کی اپیل کے جواب میں بھارت میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر نے مشرقی پنجاب کے چیف سیکریٹری کو لکھا:

1- میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میر عنایت اللہ خان نے یہ بتانے کے لیے لکھا ہے کہ اس کی بیٹی رضیہ بیگم عمر 13 سال پھاوا سنگھ ولد جیون سنگھ ضلع امرت سر، گاؤں بھوما، پی ایس مجیٹھہ، ضلع امرت سر، نے اپنے قبضہ میں رکھی ہوئی ہے۔ لڑکی کی بازیابی کے لیے اس کی درخواست کے جواب میں بھارتی فوجی حکام نے میر عنایت اللہ کو بتایا کہ اس کی بیٹی اپنے شوہر کو چھوڑنا نہیں

چاہتی۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے، 6 دسمبر 1947ء کو دونوں ریاستوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کا ایک فیصلہ یہ ہے کہ یکم مارچ 1947ء کے بعد اغوا ہونے والوں کی تبدیلی مذہب اور شادی تسلیم نہیں کی جائے گی اور ایسے تمام افراد ان کی متعلقہ ریاستوں کو واپس کیے جائیں گے۔ متعلقہ شخص کی خواہشات غیر متعلقہ ہیں۔

2- میں ممنون ہوں گا اگر لڑکی کی بازیابی کے لیے از راہِ کرم انتظامات کیے جائیں تا کہ وہ لاہور میں اس کے والد کے گھر پہنچائی جا سکے۔ لڑکی سے متعلق تفصیلات ہمراہ ہیں۔ درخواست ہے کہ اس کا جواب جلد دیا جائے۔[1]

تقسیم کے تبدیل شدہ حالات میں ایک تیرہ سالہ لڑکی جو بھارتی ریاست کے آئین کے تحت بچہ تھی اور ریاستی فہرست میں اس کا اندراج اغوا شدگان میں ہوتا تھا، اچانک اس بات کی اہل ہو گئی کہ وہ اپنے شوہر کے انتخاب کے بالغانہ حق کا آزادانہ فیصلہ کر سکے۔ ایسا انتخاب جس کا مطلب اپنے والدین کو رَد کرنے کا بھی ہوتا ہے۔

☆☆☆

تقسیم کے بچے نئی درجہ بندی میں شامل ہو گئے تھے، یعنی ''بعد از اغوا بچے۔'' یکم جنوری 1954ء سے 30 ستمبر 1957ء کے درمیان ایسی مسلمان خواتین جنھیں بازیاب کر کے پاکستان پہنچایا گیا، اپنے پیچھے 860 بچے چھوڑ گئیں۔ جب کہ 410 بچے ان کے ساتھ گئے۔ دوسری طرف پاکستان میں ہندو اور سکھ عورتوں کے ہاں پیدا ہونے اور واپس لائے جانے والے بچوں کی تعداد 1952ء کی ایک فہرست کے مطابق 102 تھی۔ واضح طور پر یہ تعداد آئس برگ کا محض ایک سِرا ہے۔ ''بعد از اغوا'' بچوں کی دو قسمیں تھیں۔ وہ جو بھارت میں اغوا ہونے اور پھر بازیاب ہونے والی عورتوں کے ہاں پیدا ہوئے اور وہ جو پاکستان میں اغوا اور پھر بازیاب ہونے والی ہندو اور سکھ عورتوں کے ہاں پیدا ہوئے۔ دونوں صورت میں یہ بچے مخلوط خون والے تھے۔ پھر ان کا تعلق کس سے تھا؟ یہ مسئلہ یہیں تک محدود نہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان ایک سمجھوتا ہوا (پھر اس کے بعد قانون سازی بھی) جس کے تحت خاصے بحث مباحث کے بعد ایک حتمی تاریخ

1 : ڈان: 12 مئی 1948ء۔

طے کر دی گئی، یکم مارچ 1947ء۔ مارچ کا تعین اس لیے کیا گیا کہ اس مہینے پنجاب میں پہلی گڑ بڑ ہوئی تھی۔ اس تاریخ کے بعد ہونے والا ہر رابطہ، شادی اور تبدیلی مذہب کو غیر رضا کارانہ قرار دے دیا گیا۔ قدرتی طور پر اس طرح کے رابطے سے پیدا ہونے والے بچے بھی ایک مسئلے کا شکار ہو گئے لیکن بچوں کا جواز متعین کرنے والی تاریخ کس طرح طے کی جا سکتی تھی؟ فرض کریں، مثال کے طور پر، جون یا جولائی 1947ء میں مخلوط والدین کے ہاں پیدا ہونے والے بچے کا حمل مقررہ تاریخ سے پہلے ہی قرار پا جانا چاہیے تھا کہ اسے جواز مل سکے۔ یا ممکن ہے کہ اغوا ہونے والی عورت اغوا کے وقت حاملہ ہو اور اس طرح اس کا بچہ جائز ہو لیکن مقررہ تاریخ کے بعد اس کی پیدائش اسے جواز سے محروم کر دے۔

پھر اس طرح اس بچے کا تعلق کس سے ہوگا۔ ماں سے یا باپ سے؟ اور پھر اس کے مطابق اسے کہاں بھیجنا چاہیے۔ ماں کے وطن یا باپ کے؟ ایک بچہ مسلمان ماں اور ہندو باپ کے گھر پیدا ہوا۔ اسمبلی میں اس مسئلے پر ہونے والی بحث کے دوران میں ایک رُکن نے پوچھا کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر اس بچے کو پاکستان بھیج دیا گیا تو وہاں یہ بچہ ایک کافر کی زندگی گزارنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اس نے کہا کہ اس سوال کو اغوا شدہ عورت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ ایسے بچے اس کے لیے اس ذلت و رُسوائی کی نشانی ہیں جس میں اسے ایک یا دو سال مبتلا رکھا گیا۔ اس کے نقطہ نظر سے یہ بچے غیر مطلوبہ ہیں اور اگر اسے ان بچوں کے ہمراہ پاکستان روانہ کیا گیا تو ان کے ساتھ ان کی ماں کے خاندان کے ارکان کے طور پر سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ امکان یہی ہے کہ انھیں یتیم خانے بھیج دیا جائے گا۔ رُکن نے سوال کیا کہ پھر کیوں نہ انھیں بھارت ہی میں رکھا جائے کیوں کہ ان کا باپ (خواہ اس کا بُنیادی کردار کچھ بھی رہا ہو) انھیں اپنے بچے تسلیم کرنے اور ہر ممکن بہتر طریقے سے ان کی پرورش کے لیے تیار ہے ...[1]

چنانچہ اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ باپ اغوا کار ہے۔ اس کا دعویٰ ماں کی نسبت زیادہ مضبوط ہے۔ اس قسم کے خیالات بعد از اغوا بچوں کے مستقبل پر غور کے لیے لاہور

---

1. : کانسٹی ٹیوا ینٹ اسمبلی ڈیبیٹس، 1949ء۔ بحث سے متعلقہ تمام حوالے یہیں سے لیے گئے ہیں۔ اِلّا یہ کہ ان کا دوسرا حوالہ دیا جائے۔

میں ہونے والی کانفرنس میں بھی ظاہر کیے گئے۔ اجلاس میں شریک سماجی کارکنوں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ یہ بات زیادہ معقول ہو گی کہ مغوی عورتوں کے جو بچے پاکستان میں پیدا ہوئے، انھیں ان کے باپوں کے پاس رہنے دیا جائے، کیوں کہ بھارت میں ایسے بچوں کا مستقبل یتیم خانوں میں ہو گا جس کی وجہ غالباً خالص خون سے متعلقہ ہندو اور سکھ عقائد تھے۔ اس نقطہ نظر کی دوسروں نے مخالفت کی، جن کا اصرار تھا کہ عورتوں کو اپنے بچے ساتھ لے جانے کی اجازت دی جائے۔ بازیابی کے کام میں شامل دو اہم عورتیں رامیشوری نہرو اور مردولا سارا بھائی بھی اس مسئلے پر سخت اختلاف رکھتی تھیں۔ رامیشوری نہرو عورتوں کے بارے میں زیادہ ہمدردانہ رویے کی مالک تھیں۔ بہت ساری بحث کے بعد ایک سمجھوتا سا ہو گیا جس کے تحت اس بات سے اتفاق کیا گیا کہ عورتیں 15 دن کے لیے اپنے بچے بھارت لے جا سکیں گی اور اس عرصے میں وہ یہ فیصلہ کریں گی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہیں یا نہیں۔ جو سوالات بے یقینی کا شکار رہے وہ یہ تھے: اگر عورت نے فیصلہ کیا کہ وہ بچے کو ساتھ نہیں رکھے گی تو اس بچے کا کیا بنے گا؟ کیا بچہ واپس پاکستان بھجوا دیا جائے گا۔ کیا وہاں پولیس اور سماجی کارکن اس کے باپ کو دوبارہ تلاش کرنے کی کوشش کریں گے؟ اگر وہ دوبارہ باپ کو تلاش کر لیتے ہیں ـــــ جو کہ یقینی نہیں تھا ـــــ تو کیا وہ بچے کو لینے کے لیے تیار ہو گا؟ اگر وہ تیار نہ ہوا تو اس بچے کی ذمہ داری کون لے گا؟ حقیقت یہ تھی کہ بہت سی عورتوں کو اپنے بچے چھوڑ کر آنا پڑا۔ وہ اپنے خاندان کے لیے بچوں کے بغیر زیادہ قابل قبول تھیں اور تمام تر امکان یہ ہے کہ ان بچوں کا انجام یتیم خانہ ہی تھا۔ کملا بہن کے الفاظ میں:

> حکومت نے ایک آرڈی ننس پاس کیا کہ ان عورتوں کو جن کے بچے پاکستان میں پیدا ہوئے تھے، ان بچوں کو اُدھر ہی چھوڑنا ہو گا اور جن کے بچے بھارت میں پیدا ہوئے انھیں بھارت ہی میں رہنا ہو گا۔ اس معاملے پر غور کے لیے لاہور میں ایک کانفرنس بلائی گئی۔ لیکن میں نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ میں نے مردولا سارا بھائی کو بتایا کہ میں شرکت نہیں کروں گی، اس لیے کہ اگر میں وہاں گئی تو مجھے وہ کہنے میں رُکاوٹ ہو گی جو میں محسوس کرتی ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ کسی ماں سے جو پہلے

ہی اتنی تکلیفیں بھگت چکی ہو، کس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ سرحد پار جا سکتی ہے مگر اپنی بچے کو نہیں لے جا سکتی۔

اس نے کہا، جو کچھ میں کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ کسی ماں کو اس کے بچے سے الگ نہیں کیا جانا چاہیے۔ اگر چہ عورتوں کو اس بات کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے بچے ساتھ رکھ لیں یا انھیں چھوڑ جائیں لیکن یہ کوئی حقیقی اختیار نہیں ہے اور بیش تر عورتیں اپنے بچے کیمپوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ کملا نے کہا کہ جب بھی کوئی عورت اپنا بچہ چھوڑ کر جاتی تھی تو رونے لگتی تھی اور کیمپ کے حکام سے اپیلیں کرتی تھی کہ بچے کا خیال رکھیں اور اسے اطلاع دیتے رہیں۔ حکام اچھی نیت سے وعدے کرتے تھے لیکن اکثر یہ وعدے ٹوٹ جاتے تھے۔ جب کوئی عورت چلی جاتی تھی تو ان کے لیے قصہ ختم ہو جاتا تھا۔ بچے کی زندگی ایک الگ اور مختلف کہانی تھی۔

قانون ساز اسمبلی میں اغوا شدہ افراد کی بازیابی اور بحالی کے ایکٹ پر بحث کا ایک بڑا حصہ بعد از اغوا بچوں کے مشکل سوال کے لیے وقف تھا۔ اس لیے کہ اس بل/ ایکٹ کا تعلق بھارت میں مسلمان عورتوں کی بازیابی سے تھا۔ یہاں سوال یہ تھا کہ ان کے بچوں کو پاکستان بھیجا جائے یا نہیں، یعنی اُسی سوال کا دوسرا رُخ جو لاہور کی کانفرنس میں زیر بحث تھا۔ سردار حکم سنگھ نے اس مفروضے پر اعتراض کیا کہ بچے کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ماں کا ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ماں اپنے بچے کو پاکستان نہ لے جانا چاہے اور باپ اس کی دیکھ بھال کرنا چاہے۔ اسمبلی میں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اس کی بڑی تشویش اس کے اپنے الفاظ میں انسانی حوالے سے تھی۔ اگر یہ بچے اس طرف ناجائز ہیں تو دوسری طرف بھی ناجائز ہی سمجھے جائیں گے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ عورت کے لیے یہ بات باعث شرم ہو گی کہ وہ اپنے بچے کو دوسری طرف لے جائے۔ (اگر ایسے بچے عورتیں اپنے ہمراہ لے جائیں گی تو انھیں قتل کر دیا جائے گا یا ان سے نجات حاصل کر لی جائے گی۔ میرے الفاظ: مصنفہ) چنانچہ اس نے کہا کہ وہ انسانی نقطہ نظر سے اپنی بات کہہ رہا ہے۔ اس نقطہ نظر کا مطلب یہ تھا کہ ایسے بچوں کو بھارت ہی میں رکھا جائے۔ مفروضہ یہ تھا کہ ان بچوں کے قدرتی باپ ان کی دیکھ بھال کریں گے۔ اسمبلی کے دیگر ارکان نے بھی اس نقطہ نظر کی حمایت کی۔ یہ ارکان

پوچھتے تھے کہ کیا حکومت نے گارڈین شپ ایکٹ کی دفعات کو دیکھا ہے جو بھارت میں نافذ العمل ہے۔ان کے تحت باپ کو اپنے بچے کی نگرانی کا مکمل حق ہے۔

تاہم حکومت کے لیے مسئلہ کی شکل کچھ اور تھی۔ خواتین کو بازیاب کراتے ہوئے سماجی کارکن ایک بڑے مسئلے سے دوچار تھے۔ یہ عورتیں اپنے بچے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھیں۔ چنانچہ وزیر چاہتا تھا کہ اغوا شدہ شخص کی تعریف میں توسیع کر کے اس میں 16 سال کی عمر تک کے لڑکے کو بھی شامل کر لیا جائے۔اس صورت میں بین الریاستی معاہدے کی دفعات کے تحت عورتوں کے ساتھ ان کے بچوں کو بھی بازیاب کرایا جا سکتا تھا۔لیکن وزیر سے پوچھا گیا کہ کیا یہ ملکی قانون یعنی گارڈین شپ کے قانون، جس کے تحت باپ کو بچے کو اپنی تحویل میں رکھنے کا حق حاصل ہے، کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ ایک رُکن نے تجویز دی کہ کیوں نہ عورتوں کو ناجائز بچے تو لے جانے کی اجازت دے دی جائے لیکن جو بچے جائز ہوں ان پر باپ کا کنٹرول ہو۔

ایک تیسرے نے کہا کہ کیوں نہ ان بچوں کو ''جنگی بچے'' سمجھا جائے اور ان کی ذمہ داری ان کے باپوں پر ڈال دی جائے۔سوال یہ تھا کہ یہ باپ تھے کہاں؟

بچے پر باپ کے مطلق حق کے نقطہ نظر کی حمایت ہر شخص نے نہیں کی۔ ٹرانسپورٹ اور ریلوے کے وزیر گوپال سوامی آئینگر نے کہا کہ میں گارڈین شپ کے قانون کے بارے میں نہیں جانتا۔ سارا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ بچے سے کیا سلوک کرتے ہیں، خواہ وہ جائز ہے یا ناجائز ہے اور جب تک وہ بچہ کم سِن ہے، میں سمجھتا ہوں کہ تحویل میں رکھنے کا پہلا حق ماں کا ہے اور جب وہ اپنی تحویل میں نہ رکھ سکتی ہو تو اس کی خواہشات کو سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

اگرچہ وزیر اغوا شدہ افراد کی تعریف میں توسیع کرانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اسمبلی میں سارے لوگ اس سے متفق نہیں تھے۔ اس سے قبل یو پی کے ہردے ناتھ کنزرو نے تجویز دی تھی کہ بچوں کو اغوا شدہ افراد کی تعریف سے باہر ہی رکھا جائے۔ اس نے پوچھا کہ کیا کوئی شخص ہے جس نے کسی عورت کو اغوا کیا ہو، اس ملاپ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کا باپ ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔اس نے کہا، جناب یہ سچ ہے کہ ایسے آدمی کا طرزِ عمل قابل تعریف نہیں ہو سکتا۔اس نے بہت زیادہ قابل سزا جرم

کا ارتکاب کیا ہے۔ ایسا جرم جو اس کے وطن کے لیے باعث شرم ہے لیکن ہمیں اس معاملے کو اغوا شدہ عورت کے نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس کے بچے اس شرم ناک سلوک کی نشانی ہیں جو اس کے ساتھ ایک یا دو سال تک روا رکھا گیا۔ اس کے نقطہ نظر سے یہ بچے غیر مطلوب ہیں اور اگر وہ ان بچوں کے ساتھ پاکستان جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ وہاں ان کے ساتھ ان کی ماؤں کے خاندان کے رُکن جیسا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ بالآخر انھیں یتیم خانے ہی جانا پڑے گا۔

دوسروں نے اس موقف کی تائید کی۔ مثال کے طور پر پنڈت ٹھاکر داس بھارگوا نے اس بات پر زور دیا کہ ان بچوں کو بھارت ہی میں رکھا جائے کیوں کہ بھارت میں پیدا ہونے والے تمام بچے بھارت کے شہری ہیں۔ اس نے کہا، فرض کریں کہ ایک ہندو مرد اور ایک مسلمان عورت شادی کر لیتے ہیں تو ان کے بچوں کا سرپرست کون ہوگا؟ اگر ہندو باپ کا بچہ مسلمان عورت پاکستان لے جائے تو وہاں اس بچے کو ناجائز تصور کیا جائے گا اور اس کے ساتھ برا سلوک ہوگا۔ یا اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ محض اس لیے کہ آرڈی ننس میں کہا گیا ہے کہ ایسے بچے کو پاکستان بھیج دیا جائے، ایسا کرنا ٹھیک نہیں۔ اس کے بجائے اگر باپ اصرار کرتا ہے کہ وہ بچے کے مفادات کا خیال رکھے گا اور اس کی مناسب پرورش کرے گا تو میں نہیں سمجھتا کہ کیوں انتظامی اقدام کے تحت اس بچے کو پاکستان بھیج دینا چاہیے۔

لیکن تمام ارکان کی آواز ایک نہیں تھی۔ شری برجیشور پرساد (بہار) کا خیال تھا کہ بچوں کو بھارت ہی میں رکھنے میں کوئی زیادہ وزن نہیں کیوں کہ ہندو معاشرہ مسلمان معاشرے سے مختلف ہے اور اس میں ان بچوں کے لیے جو قانون کی نظر میں ناجائز ہیں، کوئی جگہ نہیں۔ اگر یہ بچے بھارت میں رہے تو ان سے کتوں جیسا سلوک ہو گا۔

کیا یہ بچے جو ہندو باپوں اور مسلمان عورتوں سے پیدا ہوئے، واقعی بھارتی شہری تھے؟ کیا ان کے بارے میں فکرمندی، جس کی وجہ سے اسمبلی کے ارکان نے ان بچوں کو بھارت ہی میں ان کے قدرتی مگر اغوا کار باپوں کے ساتھ رکھنے کے حق میں تقریریں کی تھیں، عوامی فکر مندی تھی؟ کیا ہندو ماؤں اور مسلمان باپوں کے بچوں کے

معاملے میں بھی یہی اُصول لاگو کیا جاتا؟ کیا شہریت ماؤں کی وساطت سے ملتی ہے یا باپوں سے قومیت ملتی ہے، یا پھر مذہب سے ملتی ہے؟

نوآزاد اور خودمختار ریاست میں شہریت بذاتِ خود ایک متنازعہ سوال تھا جو ابھی تشکیل کے مرحلے میں اور خاصے تضاد سے گھرا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ریاست ملک میں آنے والے دسیوں لاکھ شرنارتھیوں کے لیے سرپرست والدین اور بہبودی پیشوا کا کردار ادا کر رہی تھی۔ تمام بہبودی منصوبوں، تمام معاوضے اور بحالی پالیسیوں کے تحت شرنارتھی ایسے لوگ تھے جن کو مدد، ترقی اور بہبودی کی ضرورت تھی۔ پنجاب کے شرنارتھیوں نے اس کی مزاحمت کی۔ وہ اپنی خود کفالت، آزادی پر اصرار کر رہے تھے اور انھوں نے ریاستی امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن یہ پالیسی مردوں پر ہی لاگو کی جاتی تھی۔ شہری کے طور پر عورتوں کی کہانی بالکل مختلف تھی۔ اگر ہم ہردے ناتھ کنزرو کی منطق کو لیں کہ ہندو باپوں اور مسلمان ماؤں کے بچے، بلا لحاظ اس بات کے کہ باپ اغوا کار تھا—— دوسرے لفظوں میں اس نے ریاستی قانون کو توڑا—— بھارت کے شہری ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو اور سکھ مرد اپنی اور اپنے بچوں کی شہریت از خود سنبھال سکتے ہیں، لیکن دوسری طرف ہندو اور سکھ عورتوں کے لیے ایسا کوئی تصور نہیں تھا۔ ماں کے طور پر اور سیکولر بھارت، جو اُن کا مادرِ وطن تھا، کی شہری ہونے کے لیے انھیں یہ مشکل فیصلہ کرنا تھا کہ کیا وہ اپنے بچے ساتھ لے آئیں یا انھیں چھوڑ آئیں۔ نہ صرف یہ کہ بچے اس حوالہ سے متضاد مقام پر تھے کہ ان کا تعلق کس برادری سے ہے اور اس وجہ سے ان کی شہریت کا سوال پیچیدہ بن گیا تھا بلکہ یہ بھی نظر آتا تھا کہ ان کی ماؤں کو شہری کے طور پر حاصل مقام اور بھی کم تھا اور اس کا بار بھی بچوں پر منتقل ہو گیا تھا۔ جیسا کہ اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی کے کام سے ظاہر ہوا، عورتوں کا تشخص ان کے کسی ملک کا شہری ہونے کے بجائے ان کی مذہبی برادریوں کے حوالے سے متعین ہوتا رہا۔ انھیں اس حق سے—— جو کہ اصولی طور پر ہر شہری کا حق ہے، محروم رکھا گیا کہ وہ کہاں رہنا چاہتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے پاس اس ٹربیونل کے سوا کسی قانون سے رجوع کرنے کا موقع نہیں تھا جو متنازعہ کیس کی سماعت کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ انھیں تو اپنے بچوں کے بارے میں بھی فیصلہ کرنے کا حق نہیں تھا۔ واضح طور پر شہریت مکمل طور پر جنسی

اعتبار سے غیر جانب دار تصور نہیں تھا۔ یہی وہ تناظر ہے جس میں بچوں کو اغوا شدہ افراد کی بازیابی اور بحالی کے قانون میں اغوا شدہ افراد کی تعریف میں شامل کرنے کا معاملہ اہم ہو جاتا ہے۔ ایکٹ میں اغوا شدہ فرد کی تعریف اس طرح ہے: مرد بچہ جس کی عمر 16 سال سے کم ہو اور عورتیں بلالحاظ عمر ــــ اس طرح ہر عمر کی عورتیں اغوا شدہ افراد کی ذیل میں آتی تھیں لیکن مردوں کے معاملے میں بات 16 برس کی عمر تک آ کر ختم ہو جاتی تھی۔ یہ وہ عمر ہے جس میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ چھوٹوں سے بڑے بن جاتے ہیں۔ شاید قانون بنانے والوں نے یہ سمجھ لیا ہوتا ہے کہ 16 سال کی عمر کے بعد نوجوان مرد یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے کہ اس کی شناخت کیا ہو، وہ کہاں رہے، کس جگہ سے تعلق جوڑے اور عورتیں، خواہ وہ کسی عمر کی بھی ہوں، اس کی اہلیت نہیں رکھتیں۔

اغوا شدہ بچوں کے مقدر نے تقسیم کے وقت ایک اور بہت زیادہ زیر بحث رہنے والے موضوع کو متنازعہ بنا دیا۔ یہ موضوع تھا مادریت۔ میں نے پچھلے باب میں بتایا ہے کہ کس طرح ماں کے طور پر بھارت کی نمائندگی اور پاکستان کی تشکیل کے ذریعے اس کے جسم کی بے حرمتی کی عکاسی بھارتی عورتوں، ہندو اور سکھ عورتوں کے جسموں کی انفرادی اور اجتماعی بے حرمتی سے ہوتی ہے جن کو دوسرے مذہب کے لوگوں نے اغوا کر کے اجتماعی عصمت دری کا نشانہ بنایا۔ ناجائز بچوں کی ماؤں کو اپنی مادریت کے جائز ہونے کے دعوے سے دست بردار ہونا پڑا۔ ان بچوں کی موجودگی یا ان کو اپنے پاس رکھنے کی خواہش نے ماں کی ''پوترتا''، اس کے تقدس اور اس کی جنسیت کو دبائے جانے کو متنازعہ کر دیا۔ جس طرح اغوا شدہ عورتوں کو ان کے مذہب، قوم، برادری اور خاندان میں واپس لانا پڑا، اسی طرح ان کے بچوں کو بھی ان سے جدا ہونا پڑا۔ انھیں گم نامی میں دھکیل دیا گیا تاکہ ان عورتوں کو ماں کے طور پر بحال کیا جا سکے اور ان کے رابطوں کا مادی ثبوت انھیں ان سے دور کر کے کم خطرناک بنایا جا سکے۔ شاید سب سے بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ اب ریاست ہی مادریت جیسی نجی شے کی تعریف متعین کر رہی تھی۔ یہ کام بلاشبہ برادری اور خاندان کی حمایت سے ہو رہا تھا۔

آخر میں یقیناً ہر کیس مختلف تھا۔ بعض عورتوں نے بچے اپنے پاس رکھے، دوسریوں نے چھوڑ دیے۔ جب کہ کچھ ایسی بھی تھیں جن کے پاس کوئی راہِ انتخاب نہیں

تھی۔ اگر بعد از اغوا بچے جواز اور عدم جواز کا بڑا مسئلہ تھے تو تقسیم کے نتیجے میں بیوہ ہونے والی عورتوں کے بچے ریاست کی بہبودی پالیسیوں سے بہ آسانی فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ یہ بچے اور ان کی مائیں ریاست کی مستقل ذمہ داری بن گئیں۔ حکومت اور رضا کار ادارے یتیم خانے اور گھر چلاتے تھے۔ طلبہ کو مالی امداد دی جاتی تھی اور امداد اور بحالی کی وزارت میں ایک مستقل شعبہ خانماں برباد عورتوں اور ان کے بچوں کے لیے وقف تھا۔ اصولی طور پر حکومت بھارت نے ان عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔[1] ریاستوں کی حکومتوں کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ ایسی معذور عورتوں کو جو ان کے لیے بنائے گئے گھروں میں داخل نہیں کرائی جا سکتی تھیں، فی کس 15 روپے اور ان کے زیر کفالت ہر بچے کو 7 یا 8 روپے ماہانہ الاؤنس دیں۔ مصیبت زدہ بچوں کی آبادکاری کی تمام کوششوں کے باوجود ان کی تعداد اور ان سے متعلقہ مسائل تشویش ناک تھے۔ 1954ء میں بھارتی فوج کے ایک سابق جنرل جے کے بھونسلے نے، جو اس وقت آبادکاری کے نائب وزیر بھی تھے، ایک سکیم شروع کی۔ ان کا منصوبہ ایک ایسا پروگرام شروع کرنا تھا جو بے گھر طلبہ کا مورال بحال کرے اور ان میں بے لچک ڈسپلن کا احساس پیدا کرے اور اس کے ساتھ ان کی جسمانی فٹ نس اور اخلاقی اور روحانی اقدار سے وابستگی بھی پیدا کرے۔ انوکھی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بے گھر بچے اور ان کو درپیش مسائل نظم وضبط کے حوالے سے دیکھے جانے لگے جن کا حل... اگر کوئی نکل سکتا تھا... یہ تھا کہ اخلاقی اور روحانی اقدار کو بحال کیا جائے۔ یہ صحیح طور پر واضح نہیں ہو سکا کہ منصوبے کا ہدف کون سے بچے تھے لیکن اس کا مقصد بچوں کا گرتا ہوا مورال بلند کرنا تھا (کیوں کہ بدنظمی کو زیادہ تر مورال ہی کا مسئلہ سمجھا گیا تھا) اور ایسے مضبوط، خود کفیل شہری پیدا کرنا تھا جو قوم کے مقدر میں پائدار حصہ لے سکیں۔ اس نقطہ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے منصوبے میں بھارت کے ثقافتی ورثے اور روایات، ہیروؤں اور ہیروینوں اور شہریت اور حب الوطنی پر زور دیا گیا۔[2]

''نیشنل ڈسپلن سکیم'' کا ابتدائی تجربہ لاجپت نگر کے کستوربا نکیتن سکول میں یتیم

---

1 : یو، بھاسکر راؤ: دی سٹوری آف ری ہیبلی ٹیشن، ص 77۔

2 : ایضاً

بچوں کے ایک چھوٹے گروپ پر کیا گیا۔ اس کے بعد اسے مہاجروں کے دوسرے سکولوں تک پھیلا دیا گیا۔ اور بالآخر یہ دائرہ ایک لاکھ بچوں تک پھیل گیا جن میں بے گھر بچے بھی شامل تھے اور دوسرے بھی۔ بھارت کی ناتجربہ کار، محصور اور نبرد آزما ریاست کے لیے یتیم، بچھڑے ہوئے اور بے گھر بچوں، یا اغوا شدہ عورتوں کے بچوں کا مسئلہ حل کرنا اتنا آسان نہیں ہوسکتا تھا۔ متعدد امدادی اقدامات مثلاً ان کے لیے گھر اور تعلیمی وظائف کی فراہمی وغیرہ، کیے گئے۔ لیکن ان کا فائدہ وہی بچے اُٹھا سکتے تھے جو پہلے ہی ان گھروں میں مقیم تھے اور جن کی ذمہ داری حکومت نے لے رکھی تھی۔ جو بچے گھروں سے باہر گلیوں اور سڑکوں پر رہ رہے تھے، ان کے لیے ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ امدادی اقدامات کا ہدف بہت معمولی تعداد تھی۔ ڈسپلن اور اخلاقی تعمیر کے لیے خواہ جتنے بھی منصوبے بنائے جاتے، وہ اس اذیت کو دور نہیں سکتے تھے جس سے بچے گزر رہے تھے، اور جس کو وہ اس وقت بیان بھی نہیں کر سکتے تھے۔

بہت سے رفاہی اداروں نے امدادی کام میں حصہ لیا۔ ان میں بچوں کو بچاؤ کمیٹی، کستوربا گاندھی نیشنل میموریل ٹرسٹ، ٹرسٹ برائے سندھی خواتین و بچے، آریا پردیشک پرتی نِدھی سبھا اور جینندرا گروکل پنچ کلا شامل ہیں۔ انھوں نے سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کے اشتراک سے کام کیا۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ''اصلاحی کام ان کا امتیاز ہے۔'' لیکن اس بات کو جاننے کا کوئی طریقہ نہیں ہے کہ بچوں کو جس نوعیت کے مسائل درپیش تھے، وہ انھیں حل کرنے کے قابل بھی تھے یا نہیں۔

☆☆☆

ابھی تک بہت کچھ پردۂ اسرار میں ہے۔ میں اکثر سوچتی ہوں، مثال کے طور پر، کہ وہاں چھوڑے گئے یا قتل کیے جانے والے بچوں میں سے کتنی لڑکیاں ہوں گی؟ سماجی کارکنوں کا کہنا ہے کہ کیمپوں میں چھوڑے جانے والے بچوں میں اکثریت، بچیوں کی تھی۔ اور کام کی زیادتی سے انھیں اپنانے والوں کی جانچ پڑتال کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ بہت سی نوجوان لڑکیوں کو یا تو گھریلو نوکرانیاں بننا پڑا یا طوائف۔ اس طرح اس ساری نسل کی تعداد بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے جو مصنفہ کرشنا سوبتی کے بہ قول تقسیم پر قربان کر دی گئی۔ گھر اور تعلیمی ادارے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے بنائے گئے لیکن جب

وہاں سے رُخصت ہونے اور اپنی آزاد زندگی بنانے کا وقت آیا تو یہ لڑکے تھے جو لڑکیوں کی نسبت آسانی سے ایسا کر سکنے میں کامیاب رہے۔ لڑکیوں میں سے بعض کی شادی آشرم کے حکام نے کروا دی اور وہ اپنی زندگی آپ گزارنے کے قابل ہو گئیں، لیکن بہت سوں کی زندگی کی تو شکل ہی تقسیم نے بدل ڈالی۔

بچوں کے جائز یا ناجائز ہونے کا مسئلہ تقسیم کے مجموعی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یعنی جب سے مختلف برادریوں میں اختلافات نے سر اُبھارنا شروع کیا۔ اس وقت ہندو اور سکھ مذاہب کی پوِتر تا کا سوال، خاص طور پر پنجاب میں اہم ہو گیا تھا۔ یہاں آریا سماج کی بڑھتی ہوئی طاقت اور پنجابی ہندو ضمیر میں بتدریج پیدا ہونے والا استحکام مسلمانوں اور عیسائیوں، دونوں کی طرف سے تبدیلی مذہب کی کوششوں کا براہِ راست نتیجہ تھا۔ تبدیلی مذہب کی وجہ سے جائز تشخص کا نقصان سب سے بڑا خطرہ لگتا تھا۔ تقسیم کے ساتھ ملک کے وجود کا ایک ٹکڑا ہمیشہ کے لیے الگ ہو گیا، یعنی اس نے ''مذہب تبدیل'' کر لیا۔ لیکن عورتوں اور بچوں کے جسم میں سرحدیں غیر محکم تھیں۔ ہندو اور سکھ عورتوں کے عشق و ہوس پر مبنی تعلقات بہ ظاہر جبراً لیکن اکثر رضا کارانہ مسلمان مردوں سے رہے۔ لیکن ریاست کی کچھ مدد سے اس ہندو حلقے میں دوبارہ لایا جا سکتا تھا۔ تاہم بچوں کے جسم کے اندر دوڑنے والا خون بہت مخلوط تھا۔ یہاں کوئی تقسیم نہیں کی جا سکتی تھی اور کوئی لکیر نہیں کھینچی جا سکتی تھی کہ بچوں کو کہاں جانا چاہیے۔ ان کے وجود پر کوئی سرحد کھڑی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے بہتر تھا کہ انھیں فراموش کر دیا جائے۔ اس حد تک کہ شاید وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

یہ ہم نے آسانی سے کر لیا۔ اپنے بچوں کو کھو دینے والے بہت سے والدین نے اس وقت انھیں تلاش کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے درخواستیں دیں۔ رپورٹیں درج کرائیں۔ پیغامات بھیجے۔ ان میں سے کچھ کو روکشیتر کے گاؤں ڈیرہ دھوپ سڑی کی دھرم کور کی طرح خوش نصیب تھے۔ تقسیم کے فسادات میں اس کے کئی رشتہ دار مارے گئے۔ فسادات کی جگہ پر واپس آ کر دھرم کور نے اپنے رشتہ داروں کی لاشیں دیکھیں مگر ان میں اس کی بیٹی مہندر کور کی لاش نہیں تھی۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ مہندر کور کو ایک نیک دل عورت گریس نامی نرس اُٹھا کر لے گئی ہے اور ایک یتیم خانے میں داخل کرا دیا ہے۔

وہاں وہ انور صدیقہ کے نام سے رہ رہی تھی۔ کئی برس بعد جب اس کی شادی ہوئی تو گریس نے اسے 'صدیقہ' کی کہانی سنا دی۔

ایک دن اپنی لڑکی عظمت کے ساتھ بس میں سفر کرتے ہوئے صدیقہ نے خود کو ایک سکھ کے پاس بیٹھے ہوئے پایا۔ جس طرح کہ بچوں کی عادت ہے، بچی نے سکھ کو چھوا اور کسی نامعلوم وجہ کے باعث اسے ماموں کہہ کر پکارا۔ اس موقع پر صدیقہ سے رہا نہ جا سکا اور اس نے اس بوڑھے کو اپنی کہانی سنا دی۔ نرنجن سنگھ جسے ابھی ابھی ایسے لگا تھا کہ اس کی طویل عرصے سے لاپتہ بہن اسے مل گئی ہے، نے اس سے مدد کا وعدہ کیا۔ بھارت واپسی پر اسے پتہ چلا کہ لوبان والا کے مہاجر کورو کشیتر میں آ کر آباد ہوئے ہیں جو اس کے گھر کے قریب تھا۔ یہ کہانی اس طرح سنائی گئی:

> نرنجن ہر روز بس پر سوار ہوتا اور اعلان کرتا: ''میں پاکستان سے آیا ہوں، جہاں ایک عورت اپنی ماں کو بہت یاد کرتی ہے۔ اگر آپ میں سے کوئی لوبان والا کا سکھ ہے تو مہربانی کر کے کھڑا ہو جائے۔ یہ ترکیب کامیاب رہی۔ ڈھنڈورچیوں کے جال کے ذریعے، جس کی وجہ سے تقسیم کے بعد بہت سے بچھڑے ہوؤں کا ملاپ ہوا، نرنجن کو معلوم ہوا کہ صدیقہ کے والدین تقسیم کے فسادات میں بچ گئے تھے اور ڈیرہ دھوپ سڑی میں جا بسے تھے جو کورو کشیتر کے مضافات میں ایک چھوٹی سی بستی ہے۔[1]

نرنجن سنگھ وہاں ایک رات کوئی اعلان کیے بغیر صدیقہ کا ایک خط لے کر دھرم کور کے گھر جا پہنچا۔ خط میں لکھا ہوا تھا: ''میں مہندر کور دختر جاوند سنگھ زندہ ہوں...، پھر کچھ برس بعد صدیقہ دھوپ سڑی پہنچنے میں کامیاب ہو گئی اور اپنی ماں سے ملی۔ اس کی ماں نے پاکستان جا کر اپنی نواسی کی شادی میں شرکت کی۔

لیکن ہر شخص ایسا خوش نصیب نہیں تھا۔ جالندھر کے گاندھی وِنیتا آشرم کے کارکنوں کو یاد ہے کہ 1947ء میں ایک دو سالہ بچی کو وہاں لایا گیا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ آج اس کی عمر 52 سال ہے اور اب بھی وہیں رہ رہی ہے۔ تاریخ کا بچہ، جس کی کوئی تاریخ نہیں۔

---

1. : انڈیا ٹو ڈے: 50ویں یوم آزادی پر خصوصی اشاعت، اگست 1947ء

دھرم کور اور صدیقہ کی طرح ہر کوئی خوش نصیب نہیں تھا۔ اگست 1956ء میں کراچی کے ایک اخبار ڈان نے اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی کے سوال پر دونوں ممالک کے طرزِ فکر میں اختلاف کے بارے میں اداریہ لکھا۔ اداریہ میں ایک نوجوان لڑکی کے کیس کا حوالہ دیا گیا تھا جس کے مایوس والد کی دردناک کہانی اخبار کے کالموں میں کئی بار چھپ چکی تھی۔ اداریہ میں لکھا گیا تھا کہ اغوا شدہ عورتوں کے رشتے داروں کو ان کی تلاش میں سہولت فراہم کرنے کے مشترکہ وعدوں کی کیا قیمت ہے اگر ایک باپ جو اَب پاکستان کا شہری ہے اور اپنی بیٹی کی بازیابی کے لیے اپنے آبائی شہر جاتا ہے لیکن اسے وہاں انتظامی حکام کی طرف سے نہ قانونی تحفظ ملتا ہے، نہ مدد، بلکہ ایک بودے الزام کے تحت اسے جیل بھیج دیا جاتا ہے اور اسے اپنا کیس لڑنے کے حق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔

لڑکی کا والد، قمرالدین احمد اپنی بیٹی کی تلاش میں بھارت کے کئی سفر کر چکا تھا۔ اس کی کم سِن بیٹی کو اس کے گاؤں سے اغوا کر لیا گیا تھا۔ 1951ء میں اسے جاسوس ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے تین سال جیل میں کاٹے۔ اس نے کہا کہ میری بچی کو بازیاب کرانے سے بھارت کا انکار کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ہماری اپنی حکومت نے میری بار بار کی التجاؤں کے باوجود میری کوئی قانونی مدد نہیں کی۔ نہ میری بچی کی بازیابی میں تعاون کیا۔ بھارت جیل میں اپنی سزائے قید کاٹنے کے بعد جو قمرالدین پاکستان واپس پہنچا تو اس نے پھر ایک بار حکام سے اپنی بچی کی بازیابی میں مدد دینے کی اپیل کی۔ اسے بتایا گیا کہ بھارتی حکومت نے بچی کی بازیابی سے انکار کر دیا ہے اس لیے ہماری حکومت نے بھی یہ معاملہ ختم کر دیا ہے۔[1]

1957ء میں اغوا شدہ عورتوں کی بازیابی کا پروگرام سرکاری طور پر ختم کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس باپ — اور بہت سے دوسرے والدین — کی طرف سے اپنے بچوں کی تلاش بھی ختم ہو کر گئی۔

گزشتہ باب میں مَیں نے ایک کتاب کا ذکر کیا تھا جو مجھے اور میری ایک دوست کو ملی تھی اور جس میں پاکستان میں اغوا ہونے والی ہندو اور سکھ عورتوں کی ضلع وار فہرست موجود تھی۔ اس حوالے سے کہ کیا اغوا شدہ فرد بچہ ہے (بالعموم 16 سال سے کم،

1 : ''ڈان'' کراچی: اگست 1956ء۔

اگر چہ بعض اوقات 16 سال کے بچوں کو بھی بالغ شمار کیا گیا ہے) یا کوئی عورت، یا بیوہ ہے یا ــــ اور یہ بہت کم ہے ــــ کوئی بالغ مرد، یہ فہرست ترتیب وار تھی۔ بچوں کے اغوا کے مسئلے کی جہتیں جاننے کے لیے میں نے اس فہرست پر تفصیلی نگاہ ڈالی اور درج ذیل اعداد و شمار پائے: کیمبل پور میں کل 92 افراد اغوا کیے گئے جن میں سے 30 بچے تھے۔ ڈیرہ غازی خاں میں یہ اعداد و شمار 107 اور 23 تھے ــــ راولپنڈی میں 598 اغوا شدگان میں سے 69 بچے تھے۔ شیخوپورہ میں 916 افراد اغوا ہوئے جن میں سے 318 بچے تھے۔ اوسطاً اغوا ہونے والوں میں لڑکوں کی تعداد ایک تہائی سے نصف تھی۔

میں بچوں کی اس کہانی کو نمونے کی ایک فہرست دے کر ختم کرنے لگی ہوں جو تقسیم کے وقت اغوا ہونے والے بچوں کی ایک بہت مختصر تعداد پر مبنی ہے۔ اس فہرست کے اندراجات کا تعلق ضلع شیخوپورہ سے ہے۔ اگر اس فہرست پر یقین کر لیا جائے تو بہت سارے واقعات میں بچوں کو اغوا کرنے والے اور ان سے زبردستی جنسی بدسلوکی کرنے والے افراد کا تعلق اکثر و بیشتر انہی کے گاؤں سے ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو اغوا ہونے والے بچوں کے اہل خانہ کے شناسا تھے۔

رجسٹریشن نمبر	اغوا ہونے والوں کے کوائف	اغوا کی جگہ اور تاریخ	اغوا کاروں کے کوائف
کیو ایس پی / ایس13/ یو-3 سی	انگریز سنگھ، 4 سال ولد پرکاش موضع اکنڈ پورہ، پی ایس، پی او، مید والا تحصیل ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ	شیخوپورہ، دوران فسادات	غالباً شیخوپورہ یا اس کے گرد ونواح میں ہے۔
او ایس بی/ بی/ این/-4 سی	ارول کور، 9 سال دختر مگھر سنگھ پی ایس مرید کے تحصیل شاہدرہ ضلع شیخوپورہ	چک نمبر9، شیخوپورہ ستمبر 1947ء	بخشی۔ تھڈولا پنڈ، تحصیل ضلع شیخوپورہ۔
او ایس پی/ ایس-2/ این-1 سی	امر کمار، 4.5 سال، گاؤں شیخوچ، پی او کٹھیالہ کلاں، پی ایس تحصیل وضلع شیخوپورہ	گاؤں شیخوچ ضلع شیخوپورہ اگست 1947ء	کٹھیالہ کلاں تحصیل وضلع شیخوپورہ

MashalBooks.com

او ایس پی/ ایس -13/ این-3 سی	اشوک کمار۔ 35 ولد ہربنس، گاؤں لال، پی او اور پی ایس نارنگ منڈی، تحصیل و ضلع شیخوپورہ	نارنگ منڈی اگست 1947ء	کریم بی بی زوجہ جواہر مسیح نارنگ منڈی ضلع شیخوپورہ
او ایس پی/ ایس-1/ این 3 سی	دیال، 3 سال، دختر دھرم سنگھ، گاؤں کلاری چک 282 تحصیل و ضلع شیخوپورہ	کلاری نمبر 282 شیخوپورہ	پھلّو عیسائی، گاؤں کلاری چک نمبر 282 ضلع شیخوپورہ

میں نے اوپر جو کوشش کی ہے اس کی نوعیت نسبتاً غیر دریافت شدہ سرزمین کے جائزے کی سی ہے۔ اس سارے عرصے میں مجھے اس سوال کا سامنا رہا کہ ہم بچوں کی تواریخ کا جائزہ کس طرح لیں؟ اگر عورتیں مشکل معمول ہوں اور خاموشی نے ان کی زندگی میں بُری طرح ڈیرے ڈال رکھے ہوں تو بچوں کی زندگی میں جھانکنا کتنا مشکل ہوتا، بالخصوص جب یہ فرض کر لیا جائے اکثر اوقات معقول طور پر ہی کہ وہ اپنے ایما پر نہیں بول سکتے۔ اگر تقسیم کی تاریخ میں بچوں کے بارے میں بتانے کے لیے بہت کم ہے، باوجود ان کی مرکزیت کے، تو یہ کمی انوکھی نہیں، کیوں کہ بالعموم تاریخ اور بالخصوص بھارتی تاریخ نے اس اہم موضوع کو نہیں چھوا۔ مغرب میں ہولوکاسٹ (جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام) سے بچ نکلنے والوں کے بچوں نے حال ہی میں اس عمل کو ازسرِ نو شروع کیا ہے جس کا آغاز کئی برس قبل اینی فرانک نے کیا تھا تاکہ وہ ایسے وقت میں جب ان کے اردگرد دُنیا تباہ ہوتی نظر آ رہی تھی، اپنی زندگی پر نظر ڈالیں۔ تقسیم بھی ایسا ہی لمحہ تھا۔ ایک بچہ اس وقت خاندان اور برادری کی پُرتشدد شکست و ریخت، گھر اور والدین سے اچانک محرومی کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہوگا۔ لیکن وہ اس سے لاتعلق رہ سکتا ہو گا۔ ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ان بچوں کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟ جب ان کی زندگیوں اور قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہوگا تو ان میں سے بہت سے آشرموں اور بچوں کے گھروں میں رہ رہے ہوں گے یا ٹوکریوں میں بھر کر ملک میں ایک ادارے سے دوسرے ادارے روانہ کیے جا رہے ہوں گے۔ ان میں سے بیش تر تاریخ میں گم ہو گئے۔ ہم ان بچوں کی تواریخ کی بازیابی کب اور کیسے شروع کریں گے؟ ہم انھیں تاریخ کا حصہ کیسے

بنائیں گے؟

مراد

میں ہمیشہ بہت زیادہ کھیلتا رہا...،

مراد، لاہور کا ایک تانگہ بان، تقسیم کے وقت بچہ تھا اور بھارت میں رہتا تھا۔ بہت سے دوسرے بچوں کی طرح اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور اسے لاہور جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ میں مراد سے کبھی نہیں ملی۔ میں یہاں انٹرویو نگار پیٹر چیپل اور ستی کھنہ کی اجازت سے اس کا انٹرویو پیش کر رہی ہوں۔ یہ انٹرویو انھوں نے اپنی فلم کے لیے لیا تھا۔ میں نے یہاں مراد کا انٹرویو دینے کا فیصلہ کافی غور اور بہت خاص وجوہات کی بنا پر کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنے بچپن میں بے گھر اور بے زمین ہونے کا تجربہ یاد کرنا ان بہت سی باتوں کی مثال پیش کرنا ہے جن کا میں اوپر ذکر کر رہی ہوں۔ اس کی کہانی کی قدرے بلیغ اور کسی حد تک مختصر کہانی، واضح طور ایک بالغ کی قصہ آرائی ہے۔ اور مراد کی عمر اس وقت 50 کے پیٹے میں تھی جب پیٹر اور ستی اس سے ملے۔ پھر بھی ان کا کہنا ہے کہ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ مراد نے اپنی کہانی کسی کو خود شعوری انداز میں سنائی ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے حیرت ہے کہ یادداشت کا یہ خود شعور عمل اتنا مربوط اور ہموار اندازِ بیان فراہم کرتا ہے جس طرح کہ مراد کا تھا۔ ایک اور سوال یہ ہے کہ مراد نے اپنی کہانی میں واقعات کو جس طرح کم اہم بنا کے پیش کیا ہے—— ''ہم وہاں لیٹے رہے اور وقت گزارتے رہے۔'' یہ اس کا ان واقعات کو بیان کرنے کا انداز ہے جو لازماً خوف سے لبریز ہوں گے—— بالکل ایسے جس طرح کہ وہ سب کوئی کھیل ہو رہا تھا۔ کیا وہ ایسے تجربے کو سمجھنے کا کوئی طریقہ ہے جو بہ صورتِ دیگر ایک بچے کے لیے ناقابل فہم ہوتا۔ شاید اسی وجہ سے میں بار بار اس انٹرویو کی طرف متوجہ ہوئی، کیوں کہ اس کی وجہ سے یہ سوال بار بار میرے ذہن میں آتا ہے کہ کوئی بچہ اس طرح کے اذیت ناک تجربہ کا ادراک کر سکتا ہے اور کسی طرح وہ بالغ کے طور پر اس تجربے کو واقعتاً یاد کر سکتا ہے۔ جب پیٹر چیپل اور ستی کھنہ اس سے ملے تو اس بارے میں کوئی ابہام نہیں کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرق کو کس طرح سمجھتا تھا۔ پھر بھی اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرتے

ہوئے اس کے ذہن میں دونوں برادریوں کے درمیان خوش گوار ربط کے بارے میں یادِ ماضی ـــــ اور آخری کہانی میں ـــــ حقیقت کا عنصر موجود ہے۔ کیا لاہور، جو ان دِنوں خانماں بربادی کی علامت بن گیا تھا اور تقسیم اس کا سبب تھے۔ یا کیا کوئی مسلمان یا ہندو بچہ، یا دوسرے الفاظ میں مراد، زیادہ مسلمان ہو گیا ہو گا جسے اپنے ہندو ہمسائیوں سے اپنی مختلف شناخت کا احساس تھا؟ یا یہ تقسیم کا نتیجہ تھا؟ اور کیا اگر یہ احساس معمول کے انداز میں ہوتا تو کیا مراد کی زندگی میں اتنی ہی گہری لکیریں پڑتیں جس طرح کہ اس کے لاہور آنے کی صورت میں پڑیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جو ہر اس موقع پر اٹھائے جانے چاہئیں جہاں کوئی شخص تقسیم کے بعد مذہب کے گرد تشخص کی واضح تشکیل کو دیکھ سکے۔ یہ ایسا سوال نہیں جس کا آسانی سے جواب دیا جا سکے۔

مراد کا انٹرویو اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ ان چند انٹرویوز میں سے ایک ہے جو ''دوسری طرف'' کا تناظر پیش کرتے ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تجربات کتنے ایک جیسے ہیں۔ جغرافیائی مقام اور نام کی تبدیلی کو الگ کر دیا جائے تو مراد کی کہانی سرحد کے کسی بھی طرف موجود بچے کی کہانی ہو سکتی ہے۔ مقام اور مذہب کے سوال سے بھی زیادہ اہم مراد کی داستان گوئی کا اندرونی محور ہے۔ اس کی صرف ایک مثال: ''جاگیردار جاگیرداروں کے پاس جاتے ہیں اور غریب غریبوں کے،'' اس نے یہ بات یہ بیان کرتے ہوئے بتائی کہ وہ مدد لینے کس طرح اور کہاں گیا۔ طبقاتی فرق کو بہرحال آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

مراد

میں چھوٹا بچہ تھا۔ میرے چچا بھارت میں رہتے تھے۔ کوئی مجھے اُٹھا کر اردگرد کے لوگوں کے پاس لے گیا لیکن انھوں نے میری ذمہ داری اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ میں بدقسمتی کا باعث بنوں گا۔ ایک سکول ماسٹر نے مجھے قبول کر لیا اور میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ میرا خیال رکھتا تھا۔ وہ میرے قریبی رشتے داروں سے بڑھ کر میرا ہمدرد تھا اور میری ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔ میں اس کے مویشی چرانے لے جاتا۔ پھر پاکستان اور بھارت کا جھگڑا کھڑا ہوا۔ میں بہت زیادہ کھیل کود کرتا رہتا تھا۔ میرے ماموں مجھے اپنے گھر لے گئے۔ خیال تھا کہ گلیوں میں کھیل کود کے دوران

میں قتل کر دیا جاؤں گا۔ ایک دن ہم گھر کے اندر تھے۔ میرا ماموں آیا اور نیچے بیٹھ گیا۔ سکھ آ گئے۔ بیٹی...،

پہلے انھوں نے میرے ماموں کو قتل کیا۔ میں نے سوچا وہ مجھے بھی قتل کر دیں گے اور بھاگنے کی کوشش کی۔ پیچھے گنے کے پھوگ کا ڈھیر تھا۔ میں نے اس میں کود کر خود کو اس میں چھپا لیا۔ میرا ایک اور ماموں بھی تھا۔ وہ کچھ دیر بعد آیا۔ اس نے مجھے ہلایا اور کہا اب کیا کریں۔ میں نے کہا کہ بھاگ جانا چاہیے۔ وہ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔ میرا جو ماموں قتل ہو گیا تھا اس نے مجھے چند سکے دیے تھے۔ پھر ہم ایک قریبی کیمپ میں چلے گئے۔ وہاں صورت حال بہت دردناک تھی۔ ایک آدمی گنے لاتا تھا، دوسرا اس کی گنڈیریاں بناتا تھا۔ وہ کسی مسلمان کو دیکھ لیتے تو اسے مار ڈالتے تھے۔ ہم کسی نہ کسی طرح چھپتے چھپاتے کیمپ پہنچ گئے۔ کیمپ کے نزدیک گنے کا ایک کھیت تھا۔ وہاں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ہم زمین پر لیٹ گئے اور وقت گزارتے رہے۔

میرے ماں اور باپ دونوں میرے بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ مجھے جہاں بھی لے جایا جاتا، لوگ مجھے یہ کہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیتے کہ میں بدقسمتی لاؤں گا۔ کوئی بھی مجھے رکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بڑے ماموں نے مجھے رکھ لیا۔ ہمارے گاؤں میں بڑی سڑک کے اردگرد کچھ سکھ رہتے تھے۔ لوگ کہتے تھے یہ ہر وقت باہر کھیلتا رہتا ہے۔ گولیاں چلتی رہتی ہیں، یہ قتل ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ مجھے واپس گاؤں لے گئے۔ وہاں کچھ میراثیوں نے میرا خیال رکھا۔ میں ان کے گھوڑے چراتا تھا اور ان کے ساتھ ہی کھاتا تھا۔ میں چھت پر کھڑا تھا کہ سکھوں کو آتے دیکھا۔ وہ آئے اور تین چار کو مار ڈالا۔ میں نے سوچا اگر وہ ان لوگوں کو مار سکتے ہیں تو مجھے کیوں چھوڑیں گے؟ وہ مجھے بھی مار ڈالیں گے۔ چنانچہ میں گنے کے پھوگ کے ڈھیر پر کود گیا اور نیچے لیٹ گیا۔ میں نے سوچا وہ سمجھیں گے گنے کا ڈھیر ہے اور دفع ہو جائیں گے۔ پھر ہم بھاگنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ لیں گے۔ میرا ماموں آیا اور کہا: انھوں نے تمھارے دادا کو بھی مار ڈالا ہے۔ چلو یہاں سے بھاگ چلیں۔ ہم کیمپ کی طرف بڑھے۔ سکھ بڑی تعداد میں ہر طرف موجود تھے۔ ایک فوجی ریل گاڑی آئی۔ انھوں نے کہا کہ وہ سب لوگ جن کی حفاظت کے لیے ان کے خاندان والے نہیں ہیں وہ گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ ہم پاکستان

جانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ دریائے بیاس کے پاس ایک قلعہ تھا۔ ٹرین وہاں رکی اور ہم نیچے اتر آئے۔ ہم تین چارلڑکے تھے۔ انھوں نے کہا چلولسی پئیں۔ میں نے کہا، نہیں۔ میں لسی نہیں پیوں گا، انھوں نے اس میں زہر ملا دیا ہوگا۔ تینوں نے لسی پی لی، میں نے نہیں پی۔ میں نے کہا دریا کا پانی پی لینا بہتر ہے۔ فوجیوں نے اسے چیک کیا ہے، اس میں زہر نہیں ہے۔ ہم واپس آ گئے۔ وہ تینوں زمین پر گرے اور مر گئے۔

پھر وہاں پاکستان جانے کے لیے لاریاں تیار کھڑی تھیں۔ ایک آدمی نے کہا، سکھ ہمیں راستے میں مار ڈالیں گے۔ میں نے کہا، میں نہیں جاؤں گا۔ میں اسی وقت جاؤں گا جب ہمارے فوجی آ جائیں گے۔ میں پہلے ہی گم ہو چکا ہوں۔ موت کو اس طرح دعوت کیوں دی جائے؟ مسلمانوں کی لاریاں آ گئیں اور ہم ان میں بیٹھ گئے۔ واہگہ بارڈر پر جا کر اُترے۔ انھوں نے کہا کہ اب اپنا راستہ تلاش کرو۔ میں نے سوچا کہاں جاؤں۔ میں راستہ نہیں جانتا تھا۔ میں نے جالندھر کے ایک شخص کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ میرے پاس جو چند سکے تھے، میں انھیں خرچ نہیں کرتا تھا کہ حالات زیادہ خراب ہوئے تو مجھے ان کی ضرورت پڑے گی۔ جب میں شاہدرہ پہنچا تو رات ہو چلی تھی۔ ہر طرف کھجور کے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ لوگوں کی حالت بہت دردناک تھی اور وہ ہیضے کے مریض تھے۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ اور اٹاری نامی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے ایک بڑھیا دیکھی اور کہا: ماں، میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا تم یہاں رہ سکتے ہو، کہاں سے آئے ہو۔ کنویں سے کھائی کی طرف! میں نے جواب دیا۔ میرا کوئی رشتے دار نہیں۔ وہ مہربان تھی۔ اس نے مجھے کھانے کے لیے روٹی دی۔ اگر تم یہاں رہنا چاہتے ہو تو ہم تمھیں ایک مکان دے سکتے ہیں، اس نے کہا۔ کس لیے، پیاری ماں؟ میں نے کہا۔ میں مکان کا کیا کروں گا۔ میرا کوئی خاندان نہیں ہے۔ میں سڑک پر آ گیا۔ وہاں ایک ٹرک آیا اور رک گیا۔ ان دِنوں بسیں بہت کم تھیں۔ ایک آدمی چلّایا: ''جڑانوالہ چلو۔'' ''کیا تم وہاں جڑیں کھودتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''میری جڑیں تو پہلی ہی کھودی جا چکی ہیں۔ میری پروا کیوں کرتے ہو؟'' ''دوست، لگتا ہے تم بہت دُکھ دیکھ چکے ہو،'' ڈرائیور نے کہا، آؤ، اندر آ جاؤ۔'' میں جڑانوالہ اُتر گیا۔ وہاں

کچھ گھوما پھرا اور کہا، یہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ جڑیں کھودتے ہیں۔

میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ ایک تانگے والا آیا اور چلّایا، ''سراں دی کھوہ۔'' یہ کیا ہے، میں نے پوچھا۔ یہ ایک سٹاپ ہے، اس نے جواب دیا۔ کیا تم مجھے وہاں لے جا سکتے ہو؟ میں نے پوچھا۔ کیوں نہیں، اس نے کہا۔ میں ایک لڑکا تھا چنانچہ اس نے مجھے کہا، تمھارا کوئی بوجھ نہیں ہوتا، تم صرف ایک بچے ہو۔ لیکن میں نے کہا کہ بہرحال میری کچھ نہ کچھ رقم تو خرچ ہوگی۔ اس نے کہا پروا مت کرو، میں تمھیں مفت لے جاؤں گا۔ تم بڑے رحم دل ہو، میں نے کہا۔ وہ مجھے سٹاپ تک لے گیا۔ وہاں نزدیک ہی ایک گاؤں تھا۔ میں گاؤں چلا گیا۔ جاگیردار جاگیرداروں کے پاس اور غریب غریبوں کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں کچھ قلی تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور انھیں اپنی کہانی سنائی۔ ''ہم سب کی بُری حالت ہے،'' انھوں نے کہا، ''لگتا ہے کہ تم پر ہم سے بھی زیادہ مصیبت گزری ہے لیکن ہم تو اپنا گزارا بھی نہیں کر سکتے۔'' اگر یہ صورت حال ہے، میں نے سوچا، کیوں نہ منڈی جاؤں اور وہاں قسمت آزمائی کروں۔ کیا وہاں کسی کو کام مل سکتا ہے؟ ہاں تمھیں کام مل سکتا ہے، انھوں نے کہا اور مجھے ایک ہٹ دکھایا۔

پھر میں لاہور آ گیا۔ وہاں ''شاہواں دا ڈیرہ'' تھا۔ میں اس جگہ باقاعدگی سے آیا کرتا تھا۔ وہاں کوچوان تھے جو تانگے چلاتے تھے۔ میں نے ان کے گھوڑوں کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ مجھے گھوڑوں کی مالش کرنے پر فی گھوڑا دو آنے ملتے تھے۔ وقت گزر گیا۔ میں نے چودھری سے کہا، کیا میں تانگہ چلا سکتا ہوں؟ اس نے جواب دیا تم لاہور کی سڑکوں سے واقف نہیں ہو۔ میں نے کہا میں واقف ہو جاؤں گا۔ میں ان سے پوچھ لوں گا جو واقف ہیں۔ ایک کوچوان کام چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کا گھوڑا موجود تھا۔ کوئی تجربہ کار تانگہ بان موجود نہیں تھا۔ چنانچہ چودھری نے مجھے تانگہ چلانے کو کہا۔ میں مسافروں سے پوچھ لیا کرتا تھا کہ کہاں سے مڑنا ہے۔ کہاں جانا ہے۔ کون سی سڑک تمھاری منزل کی طرف جاتی ہے۔ میں نے اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ لیکن وائے بدقسمتی۔ میرے ہاتھ پاؤں سوجنا شروع ہو گئے۔ وہ اتنے موٹے ہو گئے کہ میں پھر سڑک پر آ گیا۔ میں ایک بوڑھی عورت کے پاس گیا۔ اس نے مجھے کچھ رقم دی لیکن میں نے انکار کر دیا اور اس سے کہا کہ میرے لیے دعا کرو۔ خدا کے

فضل سے میں ٹھیک ہو گیا۔ ''نوگزا'' کی ایک خانقاہ ہے۔ میں نے وہاں جانا شروع کر دیا۔ وہاں ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا، تمھارا کوئی خاندان ہے؟

ایک مسافر آیا اور پوچھا کہ کیا میں اسے میراں دی کھوئی لے جا سکتا ہوں۔ اس کے کتنے پیسے لو گے؟ میں نے پوچھا وہاں معمول کا کرایہ کتنا ہے۔ اس نے رقم بتائی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں راستہ نہیں جانتا، مجھے شارٹ کٹ بتا۔ اس نے کہا سیدھا دہلی دروازے۔ جب ہم دہلی دروازے پہنچے تو میں نے پوچھا، اب کس راستے جناب۔ اس نے مجھے گالی دے کر کہا، سیدھے چلو۔ اپنی دانست میں مَیں نے چالاک بننے کی کوشش کی تھی کہ اسے پتہ نہ چل سکے کہ میں لاہوری نہیں ہوں۔ ہم ''کھولی'' پہنچے۔ میں رک گیا اور اس بہانے نیچے اُترا کہ سگریٹ کی ڈبی لینے جا رہا ہوں۔ میں ایک دُکان پر پہنچا اور اس سے پوچھا کہ وہ جگہ کہاں ہے۔ اس نے کہا، یہی وہ جگہ ہے۔ پورے تانگے کا کرایہ ایک روپیہ تھا۔ میں نے سوچا وہ مجھے بارہ آنے دے گا، لیکن اس نے مجھے ڈیڑھ روپیہ دیا۔

تقسیم کے بارے میں سوچنے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ہمارے قبیلے میں شادیاں طے شدہ انتظام کے تحت ہوتی ہیں۔ مثلاً وٹہ، جو وزن تولنے کے باٹ کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر تم کوئی عورت لیتے ہو تو اس کے بدلے میں ہمیں بھی ایک عورت دو۔ اگر تمھارے پاس عورت نہیں تو تمھیں بھی نہیں ملے گی۔ میں بہت پریشان تھا۔ یا خدا، میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جانے کو کوئی جگہ بھی نہ ہو تو آپ کہاں جائیں گے۔ جب عید آئی تو میں بہت اُداس ہو گیا۔ راتیں پریشان تھیں۔ آپ کو پتہ ہے بھارت میں کیا ہوا؟ فسادات۔ پہلے وہاں الیکشن ہوئے۔ مسلم لیگ اور کانگریس منظرِ عام پر آئیں۔ لاریاں آئیں اور انھوں نے لوگوں سے ووٹ دینے کو کہا۔ ہم نے سنا کہ قائداعظم ہمارے لیڈر ہیں۔ افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں۔ کوئی کہتا تھا کہ تم لوگ یہاں سے جانے والے ہو۔ کہاں؟ میں اس سے پوچھتا۔ آخر ہم کہاں جا سکتے ہیں؟ میں یہاں صدیوں سے رہ رہا ہوں۔ وہ کہتے، اپنے پاکستان کی طرف۔ پاکستان کہاں ہو گا؟ میں پوچھتا۔ لاہور کے آس پاس، —— لیکن میں نے تو لاہور نہیں دیکھا تھا۔

لوگ پوچھتے: کیا لاہور کوئی شہر ہے؟ میں نہیں جانتا تھا۔ میں وہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ نہیں۔ وہ اصرار کرتے، تم بھی لاہور جاؤ گے۔ لیکن کیسے؟ میں جہاں پیدا ہوا ہوں، وہی میرا لاہور ہے۔ بہرحال ہمیں لاہور دھکیل دیا گیا۔

مسئلے کی بُنیادی جڑ یہی ہے۔ انگریزوں نے لوگوں کو، بالخصوص مسلمانوں کو آگے نہیں آنے دیا۔ انھوں نے کسی کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔ یہ میرا مشاہدہ ہے۔ میں نے یہ خود دیکھا ہے، میں اس وقت جوان تھا جب ایک ہندو کھتری نے ایک انگریز سے یہ سوال کیا، ''جناب، مسلمان دن میں دو وقت کا کھانا بھی نہیں کھا سکتے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جانا چاہیے۔ اس نے کہا، کہ انھیں جیسے وہ ہیں، ویسے ہی رہنے دو، جس روز ان کے پیٹ بھر گئے، اسی روز وہ لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیں گے ـــــ اب ـــــ آج چاروں طرف آپ کو قتل عام نظر آئے گا۔ ہر جگہ آپ کا پولیس سے سامنا ہوگا۔

ہمارے گاؤں میں دو تیلی تھے۔ بہت طاقت وَر جوان۔ یہاں ایک بڑا میلہ ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر یہ سکھوں کا میلہ تھا۔ لوگ اس میں شرکت کے لیے دور دراز سے آتے تھے۔ گوردواروں کے معاملات نمٹانے کے لیے مہنت ہوتے تھے۔ سکھ انھیں چارپائی پر اٹھا کر لاتے تھے۔ وہ ہر طرف آٹا چھڑکتے اور ہرے رام ہرے رام کا الاپ کرتے۔

ماضی میں ہندو اور مسلمان بھائیوں کی طرح رہتے اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے۔ حتیٰ کہ ایک بڑا جاگیردار بھی، جب کوئی غریب مزدور شادی کرتا تو اس کی ہر قسم کی مدد کرتا۔ وہ بڑی سے بڑی بارات کی تواضع کرتا۔ جب بارات آتی تو اس کی دو قسم کی مدد کرتا۔ وہ لوگ برتن اور چارپائیاں اکٹھی کر کے لے آتے۔ ساتھی پن کا احساس تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد ہر چیز اُلٹ پلٹ ہوگئی۔ انھوں نے شیرخوار بچوں کو بھی نیزوں سے چھید ڈالا۔ وہ لاشوں کو نیزوں پر اُٹھا لیتے اور ان میں سے ایک شخص افسوس سے پکارتا: اوہ، مجھے تو صرف ایک ہی ملا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے نفرت کرنا شروع کر دی۔ اس سے پہلے اتنی ہم آہنگی تھی کہ غریب آدمی کسی دولت مند کے گھر داخل ہو کر لسی مانگ لیا کرتا تھا۔

MashalBooks.com

اب ایک لکیر کھنچ گئی ہے۔ سرحدیں طے ہوگئی ہیں۔ ہم یہاں ہیں اور وہ ادھر ہیں۔ اگر پاکستان سے کوئی شے بھارت بھیجی جائے تو بھارت اس پر بہت ٹیکس لگا دیتا ہے اور اس طرح پاکستان بھی یہی کرتا ہے۔



MashalBooks.com

7
کم اہم لوگ

MashalBooks.com

MashalBooks.com

تقسیم کی تواریخ کو حال ہی میں کھولے جانے کے باوجود اس واقعے کی سرکاری اور تاریخی رودادوں میں بہت سے پہلو اب بھی نادیدہ ہیں۔ تاہم جب بھی کوئی سطح کو کھرچنے کی کوشش کرتا ہے، چاہے تاریخ کے روایتی ماخذ کی سطح ہی ہو، یعنی دستاویزات، رپورٹیں، سرکاری خطوط، اخباری رودادیں وغیرہ، فوراً ہی اسے پُرشور آوازیں آتی ہیں جو اپنے سنے جانے کا مطالبہ کرتی ہیں۔ آوازیں جو بہت سی ایسی کہانیاں سناتی ہیں جو اب بھی ان صفحات میں دریافت ہوئے بغیر دبی ہوئی ہیں۔ ان میں بہت سارے ان لوگوں کی کہانیاں ہیں، جو اس دُنیا کے باسی ہیں کسی حد تک — غلط طور پر — غیر اہم سمجھی جاتی ہیں۔ یہ تواریخ میرے ذہن میں چھپی رہیں کیوں کہ تقسیم پر لکھی جانے والی اتنی زیادہ تحریروں میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں — یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہندو، سکھ اور مسلمان مردوں — پر مرکوز رہی ہیں کہ جیسے کوئی اور شناخت موجود ہی نہیں تھی۔ نیز ہندو، مسلمان اور سکھ ہونے کا مفہوم صرف مذہبی حوالے سے لیا جاتا رہا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں حیثیت اور طبقے کا فرق، یا حقیقت میں جنس اور ذات کا فرق، جو ایسی مشکل چیزیں ہیں کہ انھوں نے ان سرحدوں کو جنھیں ہم شناخت سمجھتے ہیں، بہت پیچیدہ کر دیا ہے، بالعموم نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ایسی ایک تاریخ شیڈولڈ کاسٹس یا اچھوتوں، ہریجنوں، دلتوں، یا آپ تاریخ کے ان کرداروں کو جو بھی نام دیں، کی ہے، جو اس تاریخ کو لکھنے والوں کے لیے بھی اچھوت بنی رہی ہے۔ ان آوازوں کی بازیابی کی کوشش میں میرا ایسا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے کوئی نئی شے دریافت کی ہے۔ بہت سالوں تک کئی دوسروں کی طرح، میں بھی تقسیم کو صرف مذہبی شناخت اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ دو مخالف برادریوں کی شناخت کے حوالے سے سوچتی رہی۔ یہ نشان دہی کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کب کوئی کسی دوسری تفہیم تک پہنچنا شروع کرتا ہے۔ میرے لیے، میں سمجھتی ہوں کہ یہ عمل عورتوں اور بچوں کی تاریخ کا جائزہ لینے کے وقت سے شروع

ہوا۔ 1986ء میں پیٹر چیپل، ستی کھنہ اور میں نے ایک عورت سے تقسیم کے بارے میں گفتگو کی جو بٹالہ کی ایک خاکروب تھی۔ اس وقت میں نے خود بخود مایا رانی کی شناخت ایک عورت کے طور پر کی۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ اسی شناخت کے حوالے سے ہی بولے گی۔ لیکن جب مایا نے بات شروع کی تو اس نے اپنی شناخت مختلف انداز سے یعنی ایک ہریجن ہونے اور اس کے بعد عورت ہونے کے ناتے کی۔ تو کیا تقسیم میں ہریجنوں کی بھی کوئی تاریخ تھی؟ تب مجھے محسوس ہوا کہ صرف عورتوں اور بچوں کی کہانیاں ہی خاموشی میں مکفون نہیں ہیں، دوسری بھی ہیں جن کی زندگیوں کو تقسیم نے غیر متوقع انداز میں متاثر کیا اور جن کے بارے میں بہت کم معلوم ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ میں نے دوسری کہانیوں، دوسری خاموشیوں کی تلاش شروع کی۔

☆☆☆

جب ہم مایا سے ملے تو وہ پچپن کے پیٹے میں تھی۔ ایک صحت مند خاتون جو بٹالہ کے ایک سکول (جسے وہ کالج کہتی تھی) میں خاکروب کے طور کام کرتی تھی۔ سکول سے فارغ ہو کر وہ لوگوں کے گھروں میں جز وقتی کام کرتی تھی تا کہ اپنی آمدنی کچھ بڑھا سکے۔ مایا نے ہمیں اپنے گھر، دینا نگر کی کہانی سنائی: 1947ء میں بہت سے دوسرے دیہات کی طرح اس گاؤں کا مستقبل بھی معلق رہا۔ (اور درحقیقت ضلع گورداس پور، جس میں بٹالہ واقع ہے، متنازعہ اضلاع میں شامل ہوتا تھا، جہاں نہ تو واضح طور پر مسلمانوں کی اکثریت تھی، نہ ہندوؤں اور سکھوں کی) اب ایک افواہ پھیلی کہ یہ گاؤں پاکستان کے حصے میں آئے گا، اس نے کہا، اور اچانک پھر یہ کہانیاں آنے لگیں کی یہ بھارت میں رہے گا۔ جب بھی ان میں سے کوئی افواہ زیادہ پھیلتی تو دوسری برادری کے لوگ اپنے گھروں اور ہر شے کو چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ مایا اور اس کی سہیلیوں نے اس افراتفری کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی کھیل ہو۔ جب وہ یہ کہانی سنا رہی تھی تو ہنس رہی تھی۔

کیا ہم ڈرے ہوئے تھے؟ نہیں ہم خوف زدہ نہیں تھے۔ ہر شخص نے حتیٰ کہ ہمارے والدین نے بھی ہمیں ڈرانے کی کوشش کی۔ لیکن پورے علاقے کا کوئی بھی بچہ نہیں ڈرتا تھا۔ اکثر اوقات ہم محض دیکھنے کے لیے اپنی چھت سے دوسرے کی چھت پر کود جاتے۔ پھر ہم اکٹھے ہو کر لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے۔ بعض گھروں میں ہمیں چاول ملے، کسی میں بادام، سویاں، ہم نے ان سب چیزوں کو اکٹھا کر کے اپنے گھر میں ڈھیر لگا دیا۔ بڑے بڑے برتن، پتیلے، پراتیں، ہم نے سب اکٹھا کر لیا۔

ہاں ہم بچوں نے یہ کیا۔ پھر شہر کے بڑوں نے، ہندوؤں نے محسوس کیا کہ یہ ٹھیک نہیں۔ اس قسم کی لوٹ مار کو بند ہونا چاہیے۔ اگر ممکن ہو تو کسی کو رنج پہنچائے بغیر۔ چھ سات اہم آدمی اکٹھے ہوئے اور ہمیں بُلایا۔ ہم سب لوگ اکٹھے تھے۔ انھوں نے کہا، یہ مت کرو۔ تم سب کی بعد میں تلاشی ہو گی اور تمھاری اشیا تم سے چھین لی جائیں گی۔ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ہم باز نہیں آئے اور اسی طرح کرتے رہے۔

ہمارے باپ نے بھی ہمیں روکا اور جب بھی وہ ہمیں روکتا، ہم کہتے، ہاں ہم نہیں کریں گے۔ لیکن جب وہ چلے جاتے اور بات کرنے بیٹھ جاتے، ہم پھر سے شروع ہو جاتے۔ چاول، کھانا، ہر قسم کی اچھی چیزیں۔ ایک دُکان سے ہم خالص گھی اور بادام چراتے اور دوسری جگہ سے کپڑے۔ ہم نے اتنے برتن اکٹھے کر لیے کہ ایک اتنا بڑا کمرہ ان سے بھر گیا جتنا بڑا یہ ہے۔ جب یہ کام ختم ہوا تو شہر کے بزرگوں نے اعلان کیا کہ کسی کے گھر سے بھی برآمد ہونے والے تانبے کے برتن ضبط کر لیے جائیں گے۔ وہ ضرور انھیں اپنی ملکیت بنانا چاہتے ہوں گے۔ چنانچہ ہم نے یہ سارے برتن بیچ ڈالے، دو اڑھائی روپے کلو کے حساب سے۔ بعد میں لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ سب ان برتنوں کو سستے داموں ہتھیانے کی چال تھی۔ دُکان داروں نے بہت کمائی کی...

میں نے بہت سے نئے برتن، حمام وغیرہ اپنی شادی کے لیے سنبھال لیے تھے۔ جب میری شادی ہوئی تو میں بہت سے برتن لائی تھی۔ میں نے بہت سی رضائیاں اور کمبل بھی لوٹے تھے۔ ان میں سے کچھ بنے بنائے تھے اور کچھ میں نے لوٹے جانے والے سامان سے بنائے تھے۔ ہم گیارہ لڑکیاں تھیں۔ ہم سب نے اپنا جہیز اسی مال سے بنایا۔ ان میں سے دو لڑکیوں کی شادی بٹالہ میں ہوئی۔

مایا کی کہانی میرے لیے تعجب خیز تھی۔ اس نے اور اس کی سہیلیوں نے یہ سب کیسے کر لیا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا کسی نے تمھیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ تم فسادات سے کیسے بچ نکلیں؟ مایا نے آخر تسلیم کر لیا کہ اپنے پڑوسیوں کے گھروں کو لوٹنے کے دوران میں وہ کسی حد تک خوف زدہ تھیں لیکن اس نے کہا کہ ہم ایک گلی سے دوسری گلی جا کر یہ کام کرتے رہے۔ ہمارے والدین بہت پریشان تھے۔ وہ ہمیں روکنے کی کوششیں کرتے رہے۔ وہ ہمیں کہتے ہم مارے جائیں گے۔ لوگ ہمیں مسلمان سمجھ کر پکڑ لیں گے۔ (لیکن ہم نے سوچا کون ہمیں پکڑے گا، کون ہمیں مارے گا، ہم خود کو ہریجن کہتے ہیں۔ ہندو یا عیسائی، ہمیں کوئی کچھ نہیں کہے گا) اور اس طرح ہم ایک

چھت سے دوسری چھت پر کودتے رہے، اس بات کا خیال کیے بغیر کہ کیا ہوگا۔

جب پہلی بار میں نے یہ کہانی سنی تو مجھے جھٹکا لگا۔ لوٹ مار اور چوری چکاری لڑائی جھگڑوں کی صورت حال کا ایک حصہ ہوتی ہے اور ایسی صورت حال اقتصادی طور محروم لوگوں کو سامان اور روپے پیسے اکٹھے کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ چنانچہ میں اس حوالے سے پریشان نہیں تھی۔ لیکن تمام ہندوؤں کی طرح میں نے یہ فرض کر رکھا تھا کہ ہریجن (دلت)، گاندھی کے مفروضہ ''خدا کے بچے''، معاشرے کے کنارے پر موجود کم اہم لوگ، ہندو برادری کا حصہ ہیں، وہ ایسا کیوں سوچتے ہیں۔ کیا وہ خود کو اسی طرح سمجھتے ہیں؟ مایا نے واضح الفاظ میں کہا کہ وہ خود کو ہندو یا عیسائی نہیں سمجھتے یا درحقیقت کوئی دوسرا بھی نہیں سمجھتے۔ اس کے بجائے وہ خود اپنی امتیازی شناخت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور احساس بھی ہوا۔ ہندو معاشرے کے مرکزی دھارے میں دلتوں کی روایتی ماورائیت کی بُنیاد شیڈولڈ کاسٹس کے طور پر ان کی حیثیت پر ہے۔ اچھوت لوگ، ایسے لوگ جن کی بے ذات حیثیت انھیں ذات پات کے ہندو معاشرے سے باہر رکھتی ہے۔ وہ بہت معمولی لیکن جزوی کام کرتے ہیں، مثلاً کوڑا کرکٹ اُٹھانا، بیت الخلا صاف کرنا۔ ایسے کام جو اَن دیکھے اور ان چھوئے رہنے چاہئیں اور بالکل یہی وجہ ہے کہ وہ نادیدہ اور اچھوت بنے رہتے ہیں۔ مایا کے معاملے میں اس اچھوت پن نے ایک ستم ظریفانہ کردار یہ ادا کیا کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی جنگ میں ان کے لیے تحفظ فراہم کیا۔ مزید براں اس حقیقت نے کہ ہریجن تقسیم کے فسادات میں غیر مرئی رہے، ایک قسم کا غیر مرئی پن پیدا کیا جو کہ بذات خود تاریخ ہے۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ تقسیم کی تاریخ میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے بہت واضح مرئی پن نے ہی اس بات کو یقینی بنایا کہ تقسیم پر نظر ڈالنے والوں کو کوئی اور شناخت نظر ہی نہ آئے۔ اس بات کو سمجھتے ہوئے شروع میں مبہم طور پر میں نے فیصلہ کیا کہ ان کہانیوں پر شعوری نظر ڈالوں جو اس موضوع پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔

اور ایسی بہت سی کہانیاں تھیں۔ جنوری 1948ء میں دو سماجی کارکن، سوشیلا نائر اور انیس قدوائی دہلی کے مضافات میں تہاڑ نامی گاؤں گئیں۔ انھوں نے سنا تھا کہ پاکستان کا ایک مال دار ہندو اپنے پیچھے بہت بڑی جائداد چھوڑ آیا ہے اور بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح تہاڑ میں ایک مال دار مسلمان سے اس کی جائداد کا تبادلہ کیا

ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جائداد لے لی لیکن ایک دوسرے کا کاروبار جاری رکھنے کی ذمہ داری نہیں سنبھالی۔ چنانچہ ہندو نے اپنی نو حاصل شدہ جائداد سے تمام سابقہ ملازمین برطرف کر دیے۔ ان میں سے بیش تر مسلمان لیکن ایک تہائی کے قریب ہریجن تھے۔ مسلمان شہر میں قائم دو کیمپوں میں چلے گئے لیکن ہریجنوں کے پاس اس جنگ میں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مرتکز تھی، کہیں جانے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس مشکل وقت میں ان کے لیے کوئی کیمپ نہیں تھے۔ نہ ہی حکومت کی طرف سے ان کی مدد کا کوئی ذریعہ تھا۔ سب مسلمانوں اور ہندوؤں کے مفادات کی دیکھ بھال میں بہت زیادہ مصروف تھے۔ نہ ہی سیاسی رہنماؤں سے کوئی مدد دست یاب تھی جن کی ترجیحات اس وقت مختلف تھیں۔

نہ صرف یہ کہ ان کی ترجیحات مختلف تھیں بلکہ ایک اور زیادہ سیاسی وجہ بھی موجود تھی جس کی بنا پر لیڈر ہریجنوں کو ہندوؤں سے الگ یا مختلف طور پر دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ 1932 میں نوآبادیاتی ریاست نے دلتوں کو ایک امتیازی گروہ کے طور پر تسلیم کیا تھا اور انھیں جداگانہ نمائندگی دی تھی۔ پھر کچھ ماہ بعد اس صورت حال کو جزوی طور پر ''پونا ایکٹ'' کے ذریعے تبدیل کر دیا گیا۔ اس وقت کانگریس نے جو مسلم لیگ کی مخالفت کی وجہ سے ہندو مفادات کی نمائندہ سمجھی جانے لگی تھی، دلتوں کو اپنے سائے میں لے لیا۔ وہ بھارتی سیاست میں وسیع تر قوم پرست کوشش کا حصہ تھے۔ چنانچہ اگرچہ ''پونا ایکٹ'' کے تحت ریزرویشن کر کے فرق کو تسلیم کیا گیا تھا لیکن ہریجنوں کو مشترکہ حلقہ انتخاب کا حصہ بنا دیا گیا۔ 1946ء میں یہ غیر مرئی پن اس وقت مزید بڑھ گیا جب کیبنٹ مشن نے ایک پلان پیش کیا جس نے، امید کی گئی کہ، بھارتیوں کو اقتدار کی پُرامن اور طے شدہ منتقلی کی راہ ہموار کرنی تھی۔ پلان میں ایک آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کی تجویز دی گئی جو ہندوستانی نمائندوں پر مشتمل ہوتی اور جو ہندوستانیوں کو اپنے لیے ایک آئین وضع کرنے کے قابل بنا سکے۔ لیکن آئین ساز اسمبلی میں کون نمائندگی کرے گا؟ کیبنٹ مشن نے اپنی سمجھ کے مطابق فیصلہ کیا کہ بھارت میں صرف تین بڑی برادریوں کو تسلیم کرنا کافی رہے گا، عام، مسلمان اور سکھ۔ مسلمانوں اور سکھوں کے علاوہ سب کو ''عام'' کی اصطلاح کے تحت رکھا گیا۔ (جس کا مطلب ہندو لیا جاسکتا ہے) نہ سکھ، نہ ہندو، نہ مسلمان بلکہ ''عام''۔ پھر ان کی مختلف ضروریات کا تعین کیسے ہوسکتا تھا۔

جب انیس قدوائی اور سوشیلا نائر تہاڑ گئیں تو انھوں نے دیکھا کہ گاؤں کے باہر بہت سے بوڑھے ہریجن کھڑے اپنے پُرانے گھروں کو دیکھ رہے تھے اور اپنے مقدر پر ماتم کناں تھے۔ان کا گاؤں اب ہندو شرنارتھیوں کی رہائش گاہ بنایا جا رہا تھا جو پاکستان سے آنے والے تھے۔''لیکن ہمارا کیا بنے گا،'' انھوں نے کہا،''ہم کہاں جائیں گے۔ ہمارا خیال کون کرے گا؟''[1] اور سچ یہ ہے کہ ان کا خیال کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ ایسی کسی بھی تعریف پر پورا نہیں اُترتے تھے جو انھیں مدد کے مستحق خانماں برباد لوگ قرار دے سکے۔ دسمبر 1947ء میں امبیدکر نے نہرو کو لکھتے ہوئے شکایت کی کہ مشرقی پنجاب آنے والے شیڈولڈ کاسٹ والے لوگ بھارتی حکومت کے قائم کردہ مہاجر کیمپوں میں پناہ لینے کے قابل نہیں ہیں۔انھوں نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کیمپوں کے آفس انچارج ہندو اور شیڈولڈ کاسٹ مہاجروں میں امتیاز برت رہے ہیں۔ بہ ظاہر امداد اور بحالی کا محکمہ ایک قانون بنا چکا تھا کہ صرف وہی مہاجر راشن اور کپڑے وغیرہ حاصل کر سکتے ہیں جو کیمپوں میں مقیم ہیں۔انھوں نے کہا کہ مذکورہ بالا وجہ کی بنا پر کیمپوں میں قیام پذیر نہ ہونے والے شیڈولڈ کاسٹ کیمپوں میں نہ رہنے کی وجہ سے کوئی امداد حاصل نہیں کر پا رہے۔ چنانچہ صرف وہ لوگ امداد کے حق دار تھے جو کیمپوں میں مقیم تھے۔ شیڈولڈ کاسٹ کیمپوں میں اس لیے نہیں رہ سکتے تھے کہ کیمپ افسران انھیں رہنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وہ بہ ظاہر ہندوستان میں رہنے والے ہندو تھے۔ مجموعی طور پر مہاجر کیمپوں میں دو قسم کے مہاجر تھے: جو پاکستان سے آ رہے تھے (ان میں بیش تر ہندو تھے) اور وہ جو وہاں جانے کے منتظر تھے (ان میں بیش تر مسلمان تھے) تہاڑ کے ہریجن ان دونوں میں سے کسی درجے میں نہیں تھے۔ وہ دہلی کے تھے اور انھیں دہلی میں ہی جگہ چاہیے تھی۔ پھر وہ کہاں جا سکتے تھے۔

اس میں مزید تضادات بھی تھے۔تمام دلت بے گھر یا کیمپوں میں جانے کے نا قابل نہیں تھے۔ پاکستان سے آنے والے لوگوں میں بڑی تعداد میں وہ لوگ تھے جو زمینوں پر کام کرتے تھے۔ لیکن ان کے لیے مسئلہ دوسری قسم کا تھا۔ انتظامیہ کے قواعد کے مطابق زمین زیادہ تر ان لوگوں کو دی جاتی تھی جو زراعت پیشہ افراد کی تعریف پر پورا

1 : انیس قدوائی،''آزادی کی چھاؤں میں'' صفحہ 80-82۔

اُترتے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں وہ لوگ جو زمینوں کے مالک تھے۔ تاہم دلت زمینوں کے مالک نہیں تھے۔ اس کے بجائے وہ مزارع تھے چنانچہ وہ معاوضے کی زمین کا مطالبہ کرنے کے اہل نہیں تھے۔ حکومت سے کئی اپیلیں کی گئیں جن میں اس مسئلہ کے ممکنہ حل تجویز کیے گئے، ان میں یہ خط بھی تھا جو 3 مئی 1948ء کو اس وقت کے ہریجن شعبے کی سربراہ رامیشوری نہرو نے لکھا تھا:

جناب

تقریباً 50 ہزار ہریجن خاندان مغربی پنجاب سے نقل مکانی کر کے آ چکے ہیں اور اس وقت مشرقی پنجاب کے کیمپوں میں گل سڑ رہے ہیں۔ ان میں سے 90 فی صد بہت اچھے زراعت پیشہ ہیں، یعنی کاشت کار، اور ''زیادہ خوراک اُگاؤ'' مہم میں شان دار حصہ لے سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ مہاجر کیمپوں میں مصیبت بھری اور کاہل زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا انحصار اس مفت لیکن ناکافی راشن پر ہے جو حکومت فراہم کرتی ہے۔

2- ان کی بحالی کا مسئلہ فوری توجہ کا متقاضی ہے۔ ایک ناقص اندازے کے مطابق اگر حکومت ہر مہاجر پر ایک روپے یومیہ بھی خرچ کرے تو ان مہاجروں کی امداد کے روزانہ اخراجات 2,80,000 روپے تک پہنچ جاتے ہیں جو کسی بھی حکومت پر بھاری بوجھ ہے۔ اس کے علاوہ جبری کاہلی کی زندگی گزارنے والے ان مہاجروں کا مورال بھی بتدریج گرتا جا رہا ہے، جو قابل توجہ ہے۔

3- یہ ہریجن عمر بھر زراعت پیشہ یعنی کاشت کار رہے ہیں۔ ان کے عمر بھر کے پیشے کو تبدیل کرنا اور انھیں دوسرے کاموں پر لگا دینا مناسب نہیں ہو گا۔ اگر ممکن ہو تو انھیں زراعت کے سائنسی اور ترقی یافتہ طریقے ضرور سکھائے جانے چاہئیں۔

4- اُلجھا دینے والا سوال یہ ہے کہ زمین کہاں سے لائی جائے۔ مشرقی پنجاب کے وزیراعظم ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کے ایک پریس کانفرنس میں دیے گئے بیان کے مطابق جو انھوں نے 26 نومبر 1947ء کو دہلی میں کی،

MashalBooks.com

مشرقی پنجاب کے مسلمان اپنے پیچھے 33 لاکھ ایکڑ زمین چھوڑ کر گئے۔ جب کہ مغربی پنجاب کے غیر مسلم 61 لاکھ ایکڑ زمین چھوڑ کر آئے۔ یہ اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ مشرقی پنجاب کی چار ریاستوں، جنڈ، پٹیالہ، فریدکوٹ اور کپورتھلہ میں مسلمان 12 لاکھ ایکڑ زمین چھوڑ گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ مغربی پنجاب سے آنے والے مہاجروں میں تقسیم کرنے کے لیے 45 لاکھ ایکڑ زمین موجود ہے۔ مشرقی پنجاب حکومت کی اب تک کی اعلان کردہ پالیسی کے مطابق صوبے میں دست یاب زمین ان زمین داروں کو الاٹ کی جائے گی جو محض کاشت کاروں، جیسے کہ ہریجن ہیں، سے ممیّز ہیں۔ عاجزانہ تجویز کی جاتی ہے کہ کل 45 لاکھ ایکڑ زمین سے صرف 5 لاکھ ایکڑ ہریجن مہاجر کاشت کاروں کے لیے مختص کر دی جائے اور باقی 40 لاکھ ایکڑ زمین 60 لاکھ ایکڑ کے مالکان میں تقسیم کر دی جائے تو ہم ان لوگوں کو جو مغربی پنجاب میں زمینوں کے مالک تھے، الاٹمنٹ میں کسی زیادہ کمی کے بغیر، غریب ہریجنوں کی آبادکاری کے لیے ایک دلیرانہ قدم اُٹھا سکیں گے۔ ہر ہریجن فیملی کو اس طرح 10-ایکڑ زمین مالکانہ حقوق کے ساتھ دی جا سکتی ہے اور اس بات کو ممکن بنایا جانا چاہیے کہ ان میں کوآپریٹو کاشت کاری متعارف کرائی جائے تا کہ زیادہ پیداوار یقینی ہو سکے۔

5- یہ بات باعث تشکّر ہے کہ بھارتی حکومت کی مداخلت سے بیکانیر کی ریاست نے وہ ایک لاکھ ایکڑ زمین جو گنگا نگر کالونی (بیکانیر) کے مسلمانوں نے چھوڑی تھی، زمین کے اصل کاشت کاروں کو 16-ایکڑ فی خاندان کے حساب سے الاٹ کر دی ہے۔ تقریباً 12 سو ہریجن خاندانوں، یعنی 6 ہزار ہریجنوں کو ابھی اس علاقے میں زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ بھرت پور اور اَلور کی ریاستوں میں بھی قابل کاشت اراضی کے وسیع قطعات مسلمان چھوڑ گئے ہیں اور حکومت ہند کا محکمہ بحالیات سختی سے اس اُصول پر کاربند ہے کہ زمین صرف حقیقی کاشت کاروں کو الاٹ کی جائے۔

مشرقی پنجاب میں محدود پیمانے پر اس اُصول کے جزوی عمل درآمد

کے نتیجے میں غریب کاشت کار بھی کانگریس راج میں اقتصادی آزادی سے فیض اٹھا سکے گا۔ اب تک وہ محض کھیت مزدور رہا ہے لیکن آزاد بھارت میں وہ اپنی زمین کا مالک، ایک آزاد شخص ہوگا جس کی کوئی حیثیت بھی ہو گی۔ اسے سوراج کے مفہوم اور کانگریس راج کی اہمیت کا پتہ چلے گا۔ اس کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی اور وہ خود کو ایک آزاد اور خودمختار شخص سمجھے گا۔

6- یہ یاد رہنا چاہیے کہ تقسیم سے قبل مشرقی پنجاب میں چند ایک مسلمان ہی جاگیردار تھے۔ زیادہ تر زمین چھوٹے زمین داروں میں تقسیم تھی۔ (یہ سفارش کی جاتی ہے کہ) کوشش کر کے کاشت کاروں کو کوآپریٹو فارمنگ شروع کرنے پر تیار کیا جائے۔

7- توجہ کا مستحق ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایسے مالکان زمین کو زمین کی الاٹمنٹ جو اپنی آمدنی کا بڑا ذریعہ تجارت کو بنا سکتے ہوں اور زمین کو محض غیر حاضر زمین دار کے طور پر برقرار رکھیں، محفوظ زرعی پالیسی نہیں ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ زمین حقیقی کاشت کاروں کو الاٹ کی جائے۔ اگر یہ نظریہ قبول کیا جائے تو ہریجن کاشت کار دوسرے کاشت کاروں کے ساتھ زمین پر آباد ہو جائیں گے۔

8- چنانچہ خلاصہ یہ ہے کہ مغربی پنجاب سے آنے والے ہریجنوں کے 50 ہزار خاندان یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آزاد بھارت میں انھیں مزید کھیت مزدور نہ سمجھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کھیت مزدور کی حیثیت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے ادب کے ساتھ گزارش کی جاتی ہے کہ اس معاملے کو اعلیٰ سطح پر مشرقی پنجاب کی حکومت سے اُٹھایا جائے اور اس پر فیصلہ کیا جائے تا کہ غریب کھیت مزدور زمین سے محروم نہ رہیں جو کہ پیدائشی حق ہے۔[1]

زمین ـــــ کتنی کھوئی گئی اور کتنی تبادلے میں لی گئی ـــــ تقسیم کے وقت ایک بُنیادی مسئلہ تھا۔ ستم ظریفی اور المیہ یہ تھا کہ رامیشوری نہرو نے اپیلیں کی تھیں کہ پنجاب حکومت دوسروں کے طے کردہ طریقے پر چلے اور آزاد بھارت کے تقاضے پورے

1: اے/سی سی پیپرز، ریلیف اینڈ ری ہیب لی ٹیشن ایف نمبر 9-26(11) 1947ء

کرے۔ لیکن جہاں تک مہاجروں کا تعلق تھا، زمین کا تعلق اُنھی سے مانا گیا جو اس کے مالک تھے، ان سے نہیں جو ان پر کام کرتے تھے۔ چنانچہ معاوضے کی تمام پالیسیاں اور منصوبے مالک سے مالک تک تھے۔ اگر آپ نے جائداد کھوئی ہے تو تبادلے میں آپ کو جائداد مل جائے گی۔ لیکن زمین محض ملکیت سے کچھ زیادہ ہے۔ ایک پُرانی کہاوت کا مطلب ہے، محنت کا پھل اس کا ہے جو کرے۔ اگر اس وقت امداد اور بحالی کی پالیسیوں نے ان لوگوں کو معاوضہ دینے کی راہ تلاش کر لی تھی جو زمینوں کے مالک تھے تو محنت یا حقیقت میں محنت کرنے کی جگہ کھو دینے کا معاوضہ دینے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جو لوگ محض مزدور تھے یا جو اس زمین پر رہتے تھے جہاں وہ کام کرتے تھے، ان کے لیے زمین جانے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے گھر اور کام بھی چلے گئے۔ نئے مقام پر مالکان زمین نئے مزدور تلاش کر سکتے تھے یا زمین کا نیا استعمال تلاش کر سکتے تھے۔ دوسری قسم کے نقصانات کا ازالہ کون کر سکتا تھا۔ یہ بات نہاڑ کے ہریجنوں سے عیاں تھی، جیسا کہ رامیشوری نہرو کے مذکورہ بالا خط سے ظاہر ہونے والی تشویش سے واضح تھی۔ کوئی سوال کر سکتا ہے کہ آخر کیوں اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ ریاست محنت کے نقصان کا ازالہ کس طرح کر سکتی ہے؟ ایسا تو نہیں تھا کہ صورت حال کی ہنگامی نوعیت کے باعث حکمرانوں کے لیے تمام ہنگامی ضروریات کا خیال رکھنا مشکل ہو گیا ہو۔ لیکن آزادی کے ایجنڈے، اس میں شامل وعدوں، اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ زمینی اصلاحات 1930ء کی دہائی سے شروع ہیں، اب یہ مثالی وقت تھا کہ ہریجنوں کے معاملے میں زمین کی ملکیت کا انداز تبدیل کر دیا جاتا۔ اس موقع کو کیوں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس طرح کیا یہ حقیقت کہ ہریجنوں کے پاس نہ زمین تھی نہ سامان، ان پر حملے نہ کیے جانے کی ایک وجہ ہو سکتی تھی؟ فسادات میں بہرحال جائداد پر قبضے نے خاصا نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ہریجنوں کے پاس کچھ تھا ہی نہیں جو لوٹا جاتا۔ اور پھر تحفظ کی ایک اور عجیب قسم ان کے کام کی نوعیت نے انھیں فراہم کی۔ خام الفاظ میں اگر آپ کسی زمین دار کو قتل کرتے ہیں تو اس کی جگہ دوسرا آ جائے گا، لیکن اگر آپ کسی ایسے شخص کو مار دیں گے جو آپ کے بیت الخلا صاف کرتا ہو تو غالباً اس کی جگہ لینے والا مشکل سے ملے گا۔

☆☆☆

MashalBooks.com

مجھے اچانک احساس ہوا کہ شناخت بھی عجیب چیز ہے۔ میرا خاندان آدھا سکھ ہے۔ میرے دادا پگڑی پہنتے تھے۔ ان کا سکھوں والا نام تھا اور سکھ مذہب پر عمل پیرا تھے۔ ایک اچھی بیوی کی طرح میری دادی جو ہندو تھی ان کی اطاعت گزار تھی۔ پھر بہت سے مخلوط پنجابی خاندانوں کی طرح سب سے بڑے بیٹے کو سکھ ازم کے حوالے کر دیا گیا جب کہ دوسروں کو فیصلے کا اختیار دے دیا گیا کہ چاہیں تو سکھ بن جائیں چاہے ہندو۔ سب سے بڑا ہونے کے ناتے میرے باپ نے اپنے نام کے آگے سنگھ کا لفظ لگا لیا، جب کہ باقی بھائیوں نے ہندو نام چندر لگا لیا۔ لیکن اگر خاندان میں کچھ مذہب تھا تو وہ سکھ مذہب پر عمل کرتے تھے۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ رسوم و رواج کے موقع پر سکھ مذہب پر عمل کرتے تھے لیکن یہ بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ شادیاں ہندو رسم و رواج کے تحت انجام پاتی تھیں جب کہ موت کی رسومات زیادہ تر سکھ تھیں، یعنی 48 گھنٹے تک اکھنڈ پاٹھ ہوتا تھا جس میں ساری گرنتھ صاحب پڑھی جاتی تھی اور ہم، یعنی میری نسل، دونوں مذاہب کے بارے میں برائے نام ہی معلومات رکھتی تھی اور مذہب پر عمل پیرا ہونے سے بھی دور تھی۔ ہم خود کو سیکولر سمجھتے تھے۔

پھر 1984ء میں بھارت میں اندرا گاندھی کو ان کے سکھ محافظوں نے قتل کر دیا۔ یہ سکھوں پر نئے حملوں کا اشارہ تھا۔ صرف دہلی اور اس کے گرد و نواح میں تین ہزار سکھ قتل کیے گئے اور اچانک ہی ہر وہ شخص خود کو خطرے میں محسوس کرنے لگا جس کا نام سکھوں جیسا تھا یا جو سکھ نظر آتا تھا۔ اس وقت تک میرا باپ پگڑی پہننا چھوڑ چکا تھا، نہ ہی اس کے لمبے بال تھے لیکن ہمارے نام سکھوں جیسے تھے۔ یہ پہلی بار تھی کہ ہم—— میرے بچے، ہمارے چچازاد، ہمارے سکھ دوست—— محسوس کرنے لگے کہ خوف کیا ہوتا ہے۔ یا ہمارے بزرگ اور ان کے بزرگ کس کیفیت سے گزرے۔ بعد میں امدادی کیمپوں میں، جہاں ہم نے کام کیا، میں نے خود کو بار بار اپنی شناخت پر زور دیتے ہوئے پایا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس سے مجھے اپنا جواز ملا اور دن رات سے متاثر ہونے والوں سے قربت محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو یاد دِلایا کہ جب ہم بچے تھے تو ہم گورودواروں میں کافی وقت گزارتے تھے۔ (اور یہ سچ تھا، لیکن اس میں اس وقت کسی نہ کسی طرح بڑی اخلاقی قوت بھی شامل تھی) ہم ہندو مذہب میں شاید ہی کبھی گئے ہوں

گے۔ حتیٰ کہ ہمارے گھر میں پوجا پاٹھ کے کمرے میں بھی (جو اصل میں سٹور روم تھا لیکن جب بھی میری دادی ہمارے گھر آتی تھیں تو اسے فوراً ہی پوجا پاٹھ کے کمرے میں تبدیل کر دیا جاتا) گورونانک کی تصویر لگی تھی، کسی ہندو دیوتا کی نہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگ جو زیادہ تر غیر مذہبی تھے، اچانک ہی خود کو سکھ محسوس کرنے لگے۔

آٹھ برس بعد، جب دائیں بازو کے ہندو غول نے بابری مسجد کو مسمار کیا تو سکھ ہونے کا میرا احساس ایک بار پھر زیرِ زمین ہو گیا۔ معاملات بہ ظاہر معمول پر آ گئے۔ مجھے اپنی سکھ ثقافت پر زور دینے کی ویسی ہی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن جب مسجد گری، تو مجھے یاد ہے، اور اس معاملے میں مَیں اکیلی نہیں تھی، کہ مجھے ہندو ہونے پر شرم کا ہلکا سا احساس ہوا۔ ساتھ ہی غصہ بھی تھا۔ یہ وہ شناخت تھی جو میں نے خود منتخب نہیں کی تھی بلکہ اس کے ساتھ پیدا ہوئی تھی۔ ایک ایسی شناخت جو ''سکھ پن'' کی اس سے علیحدگی ناگزیر ہونے تک دونوں پر محیط تھی۔ اس وقت کے بعد سے دوسرے ہندوؤں کی طرح، میں نے بھی اپنے مسلمان دوستوں سے معافی مانگنے کی ضرورت محسوس کی، خود کو فرقہ پرست ہندوؤں سے الگ کرنے کی ضرورت، جنھوں نے مسجد گرائی تھی اور حتیٰ کہ اکثریتی فرقہ کا حصہ ہونے پر احساس جرم بھی ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس جرم پر اپنے آپ پر غصہ بھی آیا جس کی وجہ سے میں مسلمان فرقہ پرستی پر تنقید نہ کر سکی، حالانکہ میں جانتی تھی کہ یہ بھی اپنی معاصر ہندو فرقہ پرستی کی طرح ہی خطرناک ہے۔

یقیناً ہندو اور سکھ شناختوں کی سرحدیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سرحدوں سے زیادہ مائع ہیں لیکن کم از کم پنجاب میں، جہاں مذہب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کر دیا تھا، پنجابی کلچر کا اشتراک بڑی حد تک موجود تھا۔ حتیٰ کہ آج بھی، جب ہندو اور مسلمان پنجابی ملتے ہیں تو ان میں پنجابی تشخص کا فوری اشتراک ظاہر ہوتا ہے۔ پھر کوئی مذہبی شناخت کی سرحدوں کا تعین کہاں اور کیسے کرے گا اور پھر یہ کہاں واضح ہوتی اور اس طرح ثقافتی تشخص سے مدھم ہوتی ہیں؟

اور اگر تعلیم صرف ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں سے ہی متعلق نہیں تھی تو دوسروں نے اسے کیسے محسوس کیا اور ان کی زندگیاں کس طرح اس سے متاثر ہوئیں؟ مثال کے طور پر عیسائیوں کی پوزیشن نسبتاً غیر واضح ہے۔ تعداد میں بہت کم ہونے کے

باعث اپنے کام کے حوالے سے ہر یجنوں کی طرح ان کا کوئی خاص تشخص نہیں ہے۔ پھر سامراجیوں سے ان کی مفروضہ قربت کی وجہ سے انھیں قوم پرست گفتگو میں قابل قبول نہیں سمجھا گیا، کیوں کہ یہ گفتگو بذاتِ خود مخصوص شناختوں کے حوالے سے دیکھی جا رہی تھی۔ پھر بھی یہ لوگ کیا محسوس کرتے ہوں گے؟ کیا ان کے لیے تقسیم محض ہندوؤں اور مسلمانوں کی جنگ تھی یا اس سے کچھ زیادہ؟ کیا وہ خود کو اس میں ملوث سمجھتے تھے؟ دہلی میں مَیں ایک فوجی افسر، جو 1947ء کے فسادات کے بعد دہلی میں قیام امن کی کارروائی میں شامل رہا تھا، کی بیوہ لکشمی سینن سے ملی۔ اس کے لیے اور اس کے خاوند کے لیے بھارتی ہونے کے سوا اور کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس میں تنہا نہیں تھے، لیکن یہ وہ بات نہیں تھی جس کی لوگ ان سے توقع کر رہے تھے۔

اس نے فضائیہ کے دو (عیسائی) افسروں کی کہانی سنائی جن کے طیارے کو راجستھان میں سرحد کے قریب کریش لینڈنگ کرنا پڑی تھی۔ جونہی وہ اپنے طیارے سے باہر آئے، انھیں مقامی لوگوں نے گھیر لیا۔ وہ پوچھ رہے تھے، تم کون ہو؟ ہندو یا مسلمان۔ جب انھوں نے یہ وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ وہ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہیں بلکہ مذہب کے لحاظ سے عیسائی ہیں اور دوسرے لحاظ سے فضائیہ کے افسر ہیں تو کسی کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ قریب تھا کہ ان دونوں کو قتل کر دیا جاتا۔ اس قسم کا سوال جواب صرف دوسرے فرقے کی طرف سے ہی نہیں ہوتا۔ جین سائمن، جس کی عمر اس وقت 80 سال سے زیادہ ہے، کو یاد ہے کہ نوجوان عورت کے طور پر وہ قوم پرست تحریک میں بہت زیادہ ملوّث تھی۔ لیکن اس پر مجھے اپنی برادری سے نکال باہر کیا گیا۔ وہ لوگ کہتے، تمھیں اس سے کیا لینا دینا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اختلافات خود دُور کرنے دو۔ جب تقسیم ہوئی تو جین اپنے شوہر کے ساتھ بیل گاؤں میں تھی، جہاں وہ کرسچین کالج میں اپنے چچا کے ساتھ رہتا تھا۔ ''ہمارے ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف ہندو محلّہ تھا۔ یہ خوف ناک معاملہ تھا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ ذرا مختلف لوگ ہیں، دونوں فرقوں کے لوگ ان کی مدد اور حفاظت کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ واضح طور پر استثنا یہ تھا کہ وہ فسادات سے محفوظ رہے، حالانکہ فسادات ایسے قواعد کے پابند نہیں ہوتے۔

مایا رانی کے انٹرویو نے مجھے احساس دلایا کہ میں کس حد تک یہ یقین کیے بیٹھی

تھی کہ مسلمان، ہندو اور سکھ ہی تقسیم کی بُنیادی بلکہ واحد شناختیں ہیں۔ پھر بھی جیسا کہ اس انٹرویو نے بھی ظاہر کیا کہ تقسیم اور بھی کئی معاملات سے ـــــ اس کیس میں کاسٹ اور ساتھ ہی طبقے ـــــ سے متعلق تھی۔ میں نے اس مسئلے کا مزید گہرائی میں جا کر جائزہ لینے اور مایا کے انٹرویو سے دوبارہ رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیا اس نے دلت ہونے کی اپنی شناخت سے کچھ زیادہ کہا تھا جسے میں سن نہ پائی ہوں؟ متن کو دوبارہ دیکھتے ہوئے ـــــ میں ششدر رہ گئی اور شرم سار بھی ہوئی کہ کیا بات مجھ سے اوجھل رہ گئی تھی۔ اس سوال پر کہ کیا اس کی یا اس کی سہیلیوں کی کچھ مسلمان سہیلیاں بھی تھیں، مایا نے یہ جواب دیا تھا:

نہیں۔ میری اپنی کوئی مسلمان سہیلی نہیں تھی۔ لیکن میری ماں کی ایک سہیلی تھی جس کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں غم زدہ ہوگئی۔ میری ماں کی کوئی بہن نہیں تھی چنانچہ یہ سہیلی اس کے لیے بہن کی طرح تھی اور وہ اس کے لیے روئی، ہم بھی روئے۔ میری ماں نے کہا، تمھاری ماسی کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کی بیٹیاں تھیں اور اس نے میری ماں سے انھیں رکھنے کی التجا کی۔ لیکن میری ماں نے کہا، ہم یہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ پولیس اس کی اجازت نہیں دے گی۔ ہندو بھی اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں تمھاری بیٹیوں کو کہاں چھپاؤں گی۔ میرے ہاتھ بندھے ہیں۔ (تمھیں پتہ ہے ہندوؤں کی ہر شخص پر نظر ہے۔ اگر کوئی کسی کو چھپائے تو وہ فوراً ہی آ جاتے ہیں اور انھیں باہر نکالنے پر مجبور کر دیتے ہیں: میرے الفاظ)

ہندو اتنے طاقت وَر تھے کہ دلتوں کو مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرنے سے روک سکیں۔ اکثریتی فرقے کے جبر کے مشترکہ خوف کی وجہ سے ہی شاید پنجاب میں مسلمانوں اور دلتوں میں وسیع تر قربت پیدا ہوئی۔ مایا نے بتایا کہ تقسیم کے کچھ برسوں بعد اس کی ماں اپنی مسلمان سہیلی کی تلاش میں پاکستان گئی۔ اس وقت سڑکیں کچھ عرصے کے لیے کھول دی گئی تھیں۔ وہاں جا کر وہ اپنی تمام مسلمان سہیلیوں سے ملی جو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ اس نے بتایا کہ وہ کیوں نہ خوش ہوتیں، لڑائی ہندوؤں اور مسلمانوں میں تھی۔ ہم مسلمانوں سے نہیں لڑے۔ اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

مایا نے کئی بار بتایا کہ اسے اور اس کی سہیلیوں کو کوئی ڈر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کیا یہ سچ تھا؟ میں نے یہ سوال بار بار خود سے پوچھا۔ پھر بھی مایا اس وقت 16 سال کی تھی،

MashalBooks.com

کوئی بچی نہیں تھی۔ کشیدگی میں شامل نہ ہونے کا اس کا احساس میرے لیے سچ مچ تعجب کا باعث تھا۔ اسے یاد ہے کہ کس طرح لوگ ڈرے ہوئے تھے۔ اس وقت کے بارے میں اس کی یادداشت تصوراتی اور تفصیلی تھی۔ پھر بھی اُسے کوئی خوف نہیں تھا۔ اس کے بجائے اس کے اندر کہیں ایک قسم کا احساس تفاخر تھا کہ اس نے لڑائی جھگڑے کی صورت حال کے نتیجے میں اتنی دولت اکٹھی کر لی۔ اس نے کہا:

> ...ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا کیوں کہ ہم ہریجن ہیں۔ پاکستان ہو یا ہندوستان، ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں وہیں رہنا تھا جہاں ہم پیدا ہوئے۔ ہمارے بڑے سمجھتے تھے کہ جو بھی ہو، ہم اس جگہ سے نہیں جائیں گے۔ اگر کوئی ہمیں وہاں سے جانے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا تو ہم اپنی طاقت دکھا دیتے۔ بہرحال ہریجن کوئی اَیرے غیرے تو نہیں۔ ہم بھی ایک طاقت وَر گروپ ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم بھی اپنے لیے الگ ملک کا مطالبہ کر دیتے جو دینا پڑتا۔ اس احساس سے ہم نے خود کو مضبوط تصور کیا۔

اپنی طاقت کا احساس ہونے پر خود کو مضبوط تصور کرنا خود کو ایک طاقت وَر گروپ سمجھنا ... دلتوں میں کچھ عرصے سے یہ احساس پنپ رہا تھا۔ مشرقی پنجاب کی 12.6 ملین آبادی میں سے کوئی 6.9 فی صد (تقریباً 869,400) ہریجن تھے۔ تعداد کی بہت زیادہ اہمیت تھی—— کیوں کہ یہ لوگ اس بات پر اثرانداز ہو سکتے تھے کہ کون سا فرقہ اکثریت میں اور کون سا اقلیت میں ہوتا۔ یہ طاقت کا ایک واضح ہتھیار ہو سکتا تھا۔ شاید اسی احساس کی وجہ سے مایا اور دوسروں نے خود کو ایک طاقت وَر گروپ بتایا۔

جب میں نے جائزہ لینا شروع کیا تو ان کہانیوں میں مجھے کئی پُرتشدد عجیب تضادات ملے۔ اپنے گاؤں میں ہونے والے فسادات کے دوران میں 'نادیدہ' یا 'اچھوت' ہونے کے حوالے سے مایا اور اس کی سہیلیاں تنہا نہیں تھیں۔ مارچ 1947ء میں راولپنڈی کے فسادات کے کچھ ہی دیر بعد اس وقت کی آل انڈیا شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری بی این راج بھوج نے علاقے کا دورہ کیا اور کہا: اپنے دورے کے دوران میں مجھے ہر جگہ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ شیڈولڈ کاسٹ لوگ ان حالات میں بہت کم متاثر ہوئے ہیں۔ اگر کسی جگہ کسی کو کچھ نقصان پہنچا تو صرف اس وجہ

سے کہ اسے غلطی سے ہندو سمجھ لیا گیا[1] ورنہ جب بھی کوئی شخص فسادیوں کو بتاتا تھا کہ وہ ہندو ہے نہ مسلمان تو اسے کچھ بھی نہیں کہا جاتا تھا۔ تاہم کئی سوالات جواب طلب ہیں۔ کیا اسی نادیدہ اور اچھوت پن ـــــ مایا کے تجربے کے باوجود ـــــ نے ہریجن عورتوں اور ان کے بچوں کو جبری عصمت دری یا اغوا کا شکار بننے سے بچایا؟ اور کس طرح ہر شخص فسادیوں کو یہ بتا سکتا تھا کہ وہ ہندو ہے نہ مسلمان؟ اور اگر یہ فی الواقع سچ ہے یا کہ بہت سے دلت اسی وجہ سے فسادات سے بچ نکلے تو اس کا مطلب ہے کہ حملہ آوروں کو علم ہوتا تھا کہ وہ کسے قتل کر رہے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو اس دانش مندی کو کھڑکی سے اٹھا کر باہر پھینک دیتی ہے جو فرقہ وارانہ تنازع کے بہت سے علما عزیز رکھتے ہیں کہ حملہ آور ہمیشہ بیرونی ہوتے ہیں، جو باہر سے آ کر متاثرین کی دنیا درہم برہم کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ سچ ہے کہ جارحین کو اکثر یہ علم ہوتا ہے کہ وہ کن لوگوں پر حملے کر کے انھیں کو قتل کر رہے ہیں تو کیا ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ دلتوں کے محفوظ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دونوں فرقے انھیں بہت کم تر اور قابل نفرت سمجھتے ہیں جو اس قابل نہیں کہ اس محاذ آرائی میں ہلاک کئے جائیں جو دونوں فرقوں کے چنگل میں دو مساوی سماجی فرقوں کے درمیان جاری تھی۔ تاہم مسلمان اور ہندو کئی حوالوں سے سماجی طور پر ایک دوسرے کے مساوی نہیں تھے۔ اگرچہ وہ دلتوں کے مقابلے میں ایک دوسرے کے زیادہ مساوی ضرور تھے۔ مزید برآں اگر دلت عورتوں کی جبری عصمت دری کے سوال پر آئیں تو اس قریب ترین رابطے کے معاملے پر اچھوت ہونے اور کم تر ہونے کا سوال آخر کیوں نہیں اُٹھتا؟ کیا اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جبری عصمت دری کی نسبت لوٹ مار اور قتل طاقت کا مختلف قسم کا مظاہرہ ہے؟

اس نادیدہ پن کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ ایسے اکثر مقامات پر، جہاں مختلف فرقے رہتے ہیں، عملی انتظامات بعض قسم کے مروجہ طریقوں میں بدل جاتے ہیں۔ مختلف لوگ مختلف قسم کے کام کرتے ہیں جو مل جل کر افراد، خاندانوں اور برادریوں کے طور پر زندگی گزارنے کے نظام میں ڈھل جاتے ہیں۔ مغربی پنجاب میں، بھارت کے کئی دوسرے مقامات کی طرح، نچلی ذاتیں اور دلت بہت سے وہ ناگزیر کام کرتے ہیں جو

1: اے آئی سی سی پیپرز، ایف نمبر جی 19 (کے ڈبلیو-1) ہریجن سیوک سنگھ 46-1948)

روزمرہ زندگی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ زندگی کے اس ڈھب کی پُرتشدد تباہی، سماجی تانے بانے کے اس طرح ادھیڑے جانے سے جس طرح کہ تقسیم میں ہوا، زندگی کے یہ بہت سارے نظام بے ترتیب ہی رہ گئے۔ لوگ فرار ہو گئے۔ وہ افراتفری میں بھاگے تھے۔ انھوں نے ایک برادری کے طور پر اکٹھے رہنے کی کوشش کی لیکن ان کے نئے گھروں میں زندگی کا کوئی بھی نظام بحال نہ ہو سکا۔ بہت سے مقامات پر یہ کام کرنے والے دلت جو اپنی موجودگی کے باوجود نظر نہیں آتے تھے، اب موجود نہ ہونے کی وجہ سے ''نظر'' آنا شروع ہو گئے۔ وہ کہاں تھے؟ وہ سارے گھٹیا کام کون کرے گا جو وہ کرتے تھے۔ صفائی، ستھرائی، یعنی سینی ٹیشن کا کام۔ لوگ کس طرح رہیں گے؟ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو اب ''دلت'' نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ دلتوں کو شناخت مل گئی تھی۔

ایک شناخت جو میں نے دریافت کی وہ دلت لوگوں کے لیے کافی دیر سے تشکیل پا رہی تھی۔ گاندھی اور امبیدکر، دونوں نے اپنے اپنے انداز میں دلت اور شیڈولڈ کاسٹ لوگوں پر توجہ مرکوز کی۔ لیکن دلتوں نے گاندھی کی بہت سی چیزیں یہ کہہ کر مسترد کر دیں کہ یہ محض نمائش ہیں—— مندروں میں جانا، انہی کے کنوؤں سے پانی لینا۔ ان کے بجائے وہ سیاسی اثر، سیاسی طاقت اور نمائندگی اور سب سے بڑھ کر مساوی شہریت چاہتے تھے۔ 10 جون 1947ء کو، تقسیم کے منصوبہ کا اعلان ہونے کے فوراً بعد، ایچ جے کھانڈیکر، صدر آل انڈیا ڈیپریسڈ کلاس لیگ نے ماؤنٹ بیٹن کے پاس یادداشت بھیجی اور مطالبہ کیا کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے لیے قائم کیے جانے والے حد بندی کمیشن میں دبائے گئے طبقات کو بھی نمائندگی دی جائے تا کہ شیڈولڈ کاسٹس کے حقوق اور مراعات کو غصب نہ کیا جا سکے۔ پنجاب کی آبادی میں شیڈولڈ کاسٹس کی قابل ذکر تعداد تھی—— اگر حد بندی کرتے وقت دوسرے طبقات سے مشورہ کیا جا رہا ہے تو شیڈولڈ کاسٹس سے بھی ان کی رائے پوچھی جانی چاہیے۔ انھوں نے اس خط کے ہمراہ ایک قرارداد کا متن بھی منسلک کیا جو اس ماہ کے شروع میں آل انڈیا ڈیپریسڈ کلاسز لیگ نے اپنے اجلاس میں منظور کی تھی۔ یہ اس طرح ہے:

1- آل انڈیا ڈیپریسڈ کلاسز لیگ کا یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ بنگال اور پنجاب کے دبے ہوئے طبقات دونوں صوبوں کی تقسیم سے بُری طرح متاثر

ہوں گے اور اس بات کا خدشہ ہے کہ مسلم اکثریتی آبادی کے صوبوں میں ان طبقات کو جبری تبدیلی مذہب کا نشانہ بنایا جائے گا اور اسے روکنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ایچ ایم جی کے منصوبے کے تحت بنائے جانے والے حد بندی کمیشن میں دبے ہوئے طبقات کو بھی نمائندگی دی جائے۔

2- یہ کمیٹی افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ گزشتہ وزارت پنجاب میں دبے ہوئے طبقات کے لیے کوئی تعمیری کام نہیں کر سکی۔ کمیٹی کانگریس، ہندو اور سکھ لیڈروں سے اپیل کرتی ہے کہ علاقائی وزارتوں میں جو مستقبل قریب میں تشکیل پانے والی ہیں، ان طبقات کو درست نمائندگی دیں۔

3- کمیٹی مسلمان، عیسائی اور سکھ تبلیغی اداروں کی تبدیلی مذہب کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے جو وہ محض سیاسی مقاصد کے لیے اپنی تعداد میں اضافے کے لیے دبے ہوئے طبقات کو اپنے مذہب میں داخل کرنے کے لیے کر رہی ہیں۔[1]

اِس یا اُس فرقے کی تعداد میں اضافے کے لیے استعمال ہونے کے خدشے یا زبردستی تبدیلی مذہب کا نشانہ بنائے جانے کی تشویش کے عنوان سے شیڈولڈ کاسٹس اپنے الگ ہونے پر زور دے رہے تھے اور اپنی قوت پر زور دینا چاہتے تھے۔ سیاسی طاقت میں اپنی آواز کے لیے مطالبہ کرنے میں شیڈولڈ کاسٹس تنہا نہیں تھے۔ نومبر 1948ء میں آل کرسچین ویلفیئر سوسائٹی شملہ شاخ نے بھی اس طریقہ کار پر تشویش ظاہر کی جس کے تحت اس وقت کے وزیر اعلیٰ اور مشرقی پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے سپیکر کی طلب کردہ نام نہاد سب کمیٹی برائے اقلیتی حقوق میں عیسائیوں کے مفادات کو بُری طرح نظر انداز کیا جا رہا تھا۔[2]

شناخت کا احساس قائم کرنے کے لیے جداگانہ ہونے کا احساس ضروری ہو چلا تھا۔ چنانچہ دوسروں ـــــ مسلمانوں، سکھوں، اور عیسائیوں ـــــ کے ہاتھوں تبدیلی مذہب کا خوف تھا (شیڈولڈ کاسٹس میں مختلف گروپ تھے۔ شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن بعض

---

1 : آل انڈیا ڈیپریسڈ کلاسز لیگ، قرول باغ، اے آئی سی سی پیپرز، ایف نمبر جی 19 (کے ڈبلیو آئی) ہریجن سیوک سنگھ 48-1946۔

2 : اے آئی سی سی پیپرز، پنجاب، ایف نمبر جی 26۔1948ء

حوالوں سے مسلمانوں کے قریب تر تھی جب کہ ڈیپریسڈ کلاس لیگ ہندوؤں کے نزدیک تھی) تبدیلی مذہب اس لیے باعث پریشانی تھی کیوں کہ یہ کام، بالکل واضح طور پر محض سیاسی مقاصد کے لیے اپنی تعداد میں اضافے کی خاطر کیا جا رہا تھا۔ جداگانہ نمائندگی، متناسب سیاسی نمائندگی، اہم فیصلے کرنے والے اداروں میں نمائندگی کے مطالبات وہ وسیع تر حقائق تھے جو مختلف ہونے، الگ ہونے کے اس احساس کو واضح کرتے تھے جس کا اظہار مایا رانی نے کیا اور جس کا ذکر اس سے ملاقات کے بعد میں نے کئی بار وضاحت سے سنا۔

دبے ہوئے طبقات کے تمام لوگ الگ ہونے کے اس احساس میں مبتلا نہیں تھے۔ ایسے گروپ بھی تھے جو طبقات کے بجائے اقتصادی مفادات کی بُنیاد پر منظم ہونے کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ہمارے اسی مذکورہ دورہ میں، بی این راج بھوج نے مبینہ طور پر یہ کہا کہ: شیڈولڈ کاسٹس کا ہندو ذاتوں سے کچھ تعلق نہیں۔ جب کہ اس کے برعکس سکھ عملی طور پر ہندو خون اور گوشت پوست کا ہی حصہ ہیں۔ شیڈولڈ کاسٹس کی تعداد، ''مذہبی سکھوں'' سمیت، سکھوں کے برابر ہے۔ اب اگر پنجاب کو تقسیم کیا جانا ہے تو یہ تقسیم تین حصوں میں ہونی چاہیے۔ مسلم پنجاب، سکھ جمع ہندو، پنجاب اور شیڈولڈ کاسٹ پنجاب۔[1]

☆☆☆

اس طرح یہاں تقسیم کا ایک متوازی مسودہ موجود تھا۔ جب ہندو اور مسلمان رہنما وزن، نمائندگی، سیاسی طاقت اور بعد ازاں، تقسیم کے بعد جائداد، رقم، لوگوں (زیادہ تر عورتوں اور بچوں) کے لیے لڑ رہے تھے تو شیڈولڈ کاسٹس اس جنگ میں اپنی آواز شامل کرنے کے لیے نبرد آزما تھے۔ وہ یہ کہتے محسوس ہو رہے تھے کہ ہمیں بھی تسلیم کرو۔ ہم بھی اقلیت ہیں، ہمیں بھی اپنے بارے میں خوف ہے، ہمارے بھی مطالبات ہیں، ہمارے بھی حقوق اور ضروریات ہیں۔ ہمیں بھی اپنے لیے الگ سرزمین اپنانے کی ضرورت ہے اور اس خدشے کے پیش نظر کہ یہ کوئی عجیب الخلقت چیز نہ سمجھی جائے، انھوں نے اپنے تصوراتی مادرِ وطن کے لیے منطق پیش کی اور ایک نام بھی وضع کر لیا: اچھوتستان۔ اچھوتوں کی سرزمین۔ چنانچہ یہی وہ چیز تھی جس کے بارے میں مایا رانی اس

1: اے آئی سی سی پیپرز، پنجاب، ایف نمبر جی 26۔ 1948ء۔

وقت بات کر رہی تھی جب اس نے کہا، ''ہم الگ ملک کا مطالبہ کر دیتے اور انھیں یہ ہمیں دینا ہی پڑتا۔''

نومبر 1946ء کے مہینے میں آل انڈیا اچھوتستان تحریک کی بُنیاد رکھی گی۔ اس کے بانی مسٹر بیہہ لال نے اسی ماہ یہ بیان جاری کیا:

> یہ کہنا بالکل جائز ہے کہ بھارت اچھوت عوام کی سرزمین ہے اور اسے لازماً ان کے حوالے کیا جانا چاہیے۔ اچھوتستان لفظ اچھوت سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کے لغوی معنی پاک کے ہیں لیکن اسے ہندوستان، پاکستان اور انگلش ستان کے ملغوبے نے ناپاک بنا دیا۔ یہ مسٹر جناح کی جماعت ہے کہ وہ صرف پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں اور اچھوتستان کو یاد نہیں رکھتے اچھوتستان کا مسئلہ ہندوستان، پاکستان اور انگلش ستان کے مسئلے سے پہلے سے ہے۔ موخرالذکر تینوں ستانوں نے اپنی طاقت کو مضبوط بنا کر، بندوقیں اور لڑائی کے آلات استعمال کر کے اوّل الذکر 'ستان' کے لوگوں کو کچلنے کی بار بار کوشش کی... مہتروں، جمعداروں اور چماروں کی حالت کیا ہے؟ انھیں میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ادارے کچل رہے ہیں... شہروں میں... اور چماروں کو دیہات میں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ ان کے گھروں سے لیٹرین اور جانوروں کی لاشیں اُٹھا کر لے جائیں۔ جاگیردار ان سے بیگار لے رہے ہیں جو کہ عام طور پر ہندوستان، پاکستان اور انگلستان کے لوگ ہیں۔ اچھوتستان کے عوام کی مختلف تنظیموں کی طرف سے شیڈولڈ کاسٹ، ڈیپریسڈ کلاس اور ہریجنوں کی شکل میں طاقت موجود ہے لیکن مذکورہ بالا تینوں طاقتوں نے ان کی طاقت کو ہمیشہ غصب کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے عوام انھیں ہریجن کہہ کر، پاکستانی عوام شیڈولڈ کاسٹ کہہ کر اور انھیں اسلام قبول کرا کے اور انگلش ستان کے لوگ انھیں ڈیپریسڈ کلاس بنا کر غصب کرنا چاہتے ہیں۔[1]

اوپر ظاہر کی گئی تشویش غیر عام نہیں تھی۔ جس طرح کہ درج ذیل (بے

1. : اے آئی سی سی پیپرز، ایف نمبر جی 19 (کے ڈبلیو-1) ہریجن سیوک سنگھ، 48-1946

تاریخ) خط ظاہر کرتا ہے جو گورنر پنجاب، لاہور کو لکھا گیا۔ اس میں محض ایک آزاد ملک کے مطالبے سے بڑھ کر اسے جغرافیہ بھی دیا گیا:

جناب والا

پنجاب پراونشل شیڈولڈ کاسٹس فیڈریشن پنجاب کی مجوزہ تقسیم کے سلسلے میں صوبے کی شیڈولڈ کاسٹس کی طرف سے درج ذیل یادداشت پیش کرنے کی اجازت چاہتی ہے:

1- یہ کہ پنجاب کی مجوزہ تقسیم شیڈولڈ کاسٹس کے مفادات کے قطعی خلاف ہے جو ہندوؤں سے الگ برادری ہیں اور صوبے کی ایک اہم اقلیت ہیں۔

2- یہ کہ شیڈولڈ کاسٹس صوبے کے تقریباً ہر حصے میں آباد ہیں اور کسی ایک یا دو مخصوص اضلاع میں نہیں، اگر تقسیم قبول کی گئی تو وہ مکمل طور پر دوسری برادریوں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

3- یہ کہ شیڈولڈ کاسٹس ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف انتقال آبادی کی صورت میں متاثر ہوں گے اور کوئی بھی ناگزیر تبدیلی شیڈولڈ کاسٹس کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی زندگی پر اثر انداز ہوگی۔

4- یہ کہ شیڈولڈ کاسٹس ہندو نہیں ہیں جیسا کہ حالیہ فرقہ وارانہ گڑبڑ سے ظاہر ہو گیا ہے۔ شیڈولڈ کاسٹس ہندوؤں سے کسی بہتر سلوک کی توقع نہیں کر سکتے جو مشرقی پنجاب میں اکثریت میں ہونے کے ناتے ان کی آواز کو دبائیں گے اور ان کے باوقار کاز کو نقصان پہنچائیں گے جس کے لیے وہ دو عشروں سے جدوجہد کرتے آئے ہیں۔ ہندو انھیں پہلے بھی ان کے جائز حقوق سے محروم کر چکے ہیں۔ مجوزہ تقسیم شیڈولڈ کاسٹس کی ترقی کے دروازے ان پر مزید بند کر دے گی۔

5- یہ کہ شیڈولڈ کاسٹس پہلے ہی کچلے ہوئے اور مضطرب ہیں۔ پنجاب کی تقسیم انھیں دو گروپوں میں تقسیم کر دے گی اور اس طرح ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دے گی۔ یہ خدشہ ہے کہ شیڈولڈ کاسٹس اپنا وقار، تہذیب اور ثقافت متعلقہ علاقوں میں دوسرے مذاہب کی بھاری اکثریت کی بنا پر

MashalBooks.com

برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔

6- یہ کہ پنجاب کے شیڈولڈ کاسٹس منقسم پنجاب میں کسی ایک مذہب کی بھاری اکثریت کی محکومی میں آنے کی بجائے موت کو ترجیح دیں گے۔ شیڈولڈ کاسٹس تقسیم سے متعلق اپنی خواہشات کے برعکس خود پر جبری مسلط کیے جانے والے کسی بھی معاہدے کو تسلیم نہیں کریں گے۔

7- یہ کہ برطانوی حکومت کو چاہیے کہ وہ بھارتیوں کو انتقال اقتدار اور بالخصوص مجوزہ تقسیم پنجاب قبول کرنے سے پہلے ملک کے شیڈولڈ کاسٹس کے ساتھ کیے گئے وعدے پورے کرے۔

8- یہ کہ اگر پنجاب کی تقسیم ہی فی الوقت واحد حل ہے تو شیڈولڈ کاسٹ کے درج ذیل جائز مطالبات نظرانداز نہ کیے جائیں:

الف: تقسیم کا مسئلہ پنجاب کی قانون ساز اسمبلی میں تمام برادریوں کے حقیقی نمائندے ہی حل کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے موجودہ اسمبلی توڑ کر حقیقی نمائندوں کے انتخاب کے لیے نئے الیکشن کرائے جا سکتے ہیں۔ شیڈولڈ کاسٹس گزشتہ الیکشن میں ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ انتخابی حلقوں کی وجہ سے اپنے حقیقی نمائندے منتخب نہیں کر سکے تھے۔ کانگریس کے موجودہ ہریجن ایم ایل اے حقیقت میں ہندوؤں کے نمائندے ہیں۔ شیڈولڈ کاسٹس کو کانگریس پر کوئی اعتماد نہیں اور اسی طرح کانگریس کے موجودہ ہریجن ایم ایل اے شیڈولڈ کاسٹس کی طرف سے بات نہیں کر سکتے۔

ب: شیڈولڈ کاسٹس کو جالندھر اور انبالہ ڈویژنوں پر مشتمل ایک الگ اور خودمختار ریاست دی جا سکتی ہے۔ ان ڈویژنوں میں زیادہ تر شیڈولڈ کاسٹس لوگ آباد ہیں۔ حکومت کو صوبے کے مختلف حصوں سے شیڈولڈ کاسٹس لوگوں کی اپنی آزاد ریاست میں منتقلی کے اخراجات برداشت کرنے چاہئیں اور انھیں تحفظ اور نقل وحمل کی سہولتیں فراہم کرنی چاہئیں حتیٰ کہ وہ اطمینان بخش حد تک مستحکم ہو جائیں۔ حکومت اس منتقلی کے

دوران شیڈولڈ کاسٹس کو پہنچنے والے نقصانات کا بھی ازالہ کرے۔[1]

جیسے جیسے تقسیم کا وقت قریب آتا گیا، کھیل کے دونوں بُنیادی کھلاڑیوں کانگریس اور مسلم لیگ کو ہریجن ووٹ اپنے حق میں کرنے کی اہمیت کا احساس ہوتا گیا۔ کیوں کہ ان کی تعداد شامل کرنے سے ان کی اپنی گنتی بڑھ سکتی تھی۔ چنانچہ انھیں ورغلانے کا عمل شروع ہو گیا۔ سیاسی اتحادوں سے بالعموم فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اور یہ بھی مستثنیٰ نہیں تھے۔ 6 مارچ 1947ء کو عبوری حکومت کے لاء ممبر جے این منڈل نے یو پی شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن کانفرنس میں کہا تھا کہ انھیں گاندھی پر اعتماد نہیں ہے کیوں کہ گاندھی بس یہی چاہتے ہیں کہ تمام مندر شیڈولڈ کاسٹ کے لیے کھول دیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی ہے کیوں کہ مسلمان اور شیڈولڈ کاسٹ دونوں ہی غریب اور پس ماندہ ہیں۔ دونوں زیادہ تر محنت کش اور کاشت کار ہیں، کم از کم بنگال میں۔ اور انھیں بہت زیادہ مدد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی بہتری کے لیے ایسا کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا جو شیڈولڈ کاسٹ کے لیے بھی فائدہ مند نہ ہو۔[2]

ایک بار پھر اختلاف کی لکیریں کھینچی جا رہی تھیں اور ایک بار پھر وہ مبہم ثابت ہوئیں۔ ہریجن پن کہاں سے شروع ہوتا ہے اور ہندو پن کہاں ختم ہوتا ہے۔ ان دونوں کی تعریف کیسے متعین ہو گی۔ تعداد کے حوالے سے؟ (اس صورت میں مسلمان پنجاب میں اکثریت میں تھے) یا اقتصادی اور سماجی محرومیوں کے حوالے سے۔ اس صورت میں ہریجن اور عیسائی پہلی ترجیح بنتے تھے۔ کسی اور شے سے زیادہ اس نے مجھ پر انکشاف کیا کہ سرحدوں کی حد بندی اور از سرِ نو حد بندی کا عمل ہمارے اندر کی کتنی زیادہ عکاسی کرتا ہے ـــــ مثال کے طور پر شیڈولڈ کاسٹ لوگ اختلافات پر زور دے رہے تھے۔ پھر بھی تمام غیر مراعات یافتہ گروہوں کی طرح اختلافات پر زور دینے کے عمل کا ایک جزو اکثریتی گروپ کے ساتھ مساوات، برابری اور یکسانیت کی خواہش تھا۔ اس بات پر انحصار کرتے ہوئے کہ تاریخ اسے کہاں رکھتی ہے، یہ گروپ ہندوؤں یا مسلمانوں سے اتحاد کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ چنانچہ دونوں ہی سے لین دین ہونا تھا۔ دونوں پر ہی کبھی حملہ،

---

1 : اے آئی سی سی پیپرز، پنجاب، ایف نمبر جی-26، 1948ء

2 : اے آئی سی سی پیپرز، ایف، نمبر جی 19 (کے ڈبلیو-1) ہریجن سیوک سنگھ 48-1946ء

کبھی تنقید، کبھی اتحاد، کبھی مخالفت، یہاں تک کہ کوئی فیصلہ ہو جائے اور اپنے مطالبات کے حق میں موقع کو استعمال کر لیا جائے۔ چنانچہ ہریجن رہنماؤں نے اپنے مختلف ہونے اور آزادی پر زور دیا اور اس کے ساتھ ہی کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے معاملہ کیا تاکہ اس بات کی منطق تلاش کر سکیں کہ وہ کسی ایک یا دوسرے مذہب یا کلچر کے کتنے قریب ہیں۔ اس سیاسی لمحے کی اہمیت کو جانتے ہوئے ہریجن گروپوں نے کبھی اس اور کبھی اس گروپ کے ساتھ سودے بازی کی۔

غالب گروپ بھی اس سے بے خبر نہیں تھے۔ انھیں بھی ہریجنوں کی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت تھی، صرف سیاسی حوالے سے ہی نہیں بلکہ ان بُنیادی خدمات کے لیے جو وہ فراہم کرتے تھے۔ یہ بات تقسیم کے بعد مزید واضح ہو گئی۔ ہریجنوں کو اپنی طرف لانے کی بے تابی میں بھارتی حکومت نے ان کی بحالی کے لیے متعدد ادارے قائم کر دیے۔ ہریجن ہاؤسنگ بورڈ نے مکانات کی تعمیر کے لیے ہریجنوں کو قرضے فراہم کرنا تھے۔ ہریجن سیوک سنگھ امداد اور بحالی کے کاموں کو مربوط بنانے، بے گھر ہونے والے ہریجنوں کے مفادات کی دیکھ بھال کا ذمہ دار تھا۔ اس خاص توجہ کو واضح کرنے والی الم ناک ستم ظریفی یہ تھی کہ اس نے اسی امتیازی پالیسی کی بُنیاد کو مستحکم کیا جس کے خلاف ہریجن لڑ رہے تھے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ جب وہ اس امتیازی پالیسی کے خلاف سیاسی طور پر لڑ رہے تھے تو اس کے ساتھ ہی انھیں روزمرہ حقائق اور روزمرہ ضروریات کی سطح پر امداد، گھروں کی تعمیر، آبادکاری کی بہت سخت ضرورت تھی۔ چنانچہ گھروں کی تعمیر کا کام خواہ وہ امتیازی شناخت کے حوالے سے ہی ہو رہا ہو، مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس کہانی کا ایک اور عجیب و غریب موڑ بھی ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے پاکستان کے قیام نے ملازمتوں کے حوالے سے متعدد مواقع پیدا کر دیے۔ ایسے گروپ اور افراد جن کے لیے قوم سازی کے اس عمل میں کوئی لازمی مذہبی مفادات نہیں تھے، بہتر زندگی کے لیے دونوں ممالک چلے گئے۔ دلت بھی ان سے الگ نہیں تھے۔ ابتدائی مرحلے میں ان کی خاصی تعداد بہتر زندگی کی اُمید میں بھارت سے پاکستان چلی گئی۔ لیکن ان میں سے اکثر کی اُمید پوری نہیں ہوئی۔ چونکہ واپسی اب بھی ممکن تھی، ان میں سے سینکڑوں نے اس کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ ان علاقوں پر جو اب پاکستان کا حصہ

بن گئے تھے، ایسے ہریجن بھی آباد تھے جو اب بھارت آنا چاہتے تھے۔ بھارت نے انھیں اپنے ہاں آنے کے لیے آمادہ کرنے کی خاطر امداد، گھر سازی، قرضوں اور ملازمتوں کی پیش کش کی جب کہ پاکستان نے انھیں روکنے کے لیے انھیں ایسی باتیں سنا کر ڈرانے کی کوشش کی کہ بھارت میں زندگی کتنی مشکل ہے۔ لوگ بھوک سے مر رہے ہیں، خوراک کی قلت ہے، غربت بہت زیادہ ہے۔ قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ بہت سے ہریجن سندھ میں آباد تھے جہاں سے بھارت جانے کا موزوں ترین راستہ سمندر تھا۔ جہازوں اور کشتیوں کی تعداد کم تھی۔ اس کے علاوہ سندھ حکومت نے یہ پابندی اگرچہ عارضی طور پر لگا دی تھی کہ جانے کے لیے پرمٹ درکار ہیں اور ہر روز نہ صرف محدود تعداد میں ہی یہ پرمٹ جاری کیے جاتے تھے۔ چنانچہ ہریجنوں کی ایک بڑی تعداد ٹرانزٹ کیمپوں میں روانگی کا انتظار کرنے لگی۔ ان کی غیر حاضری کی وجہ سے کراچی میں صفائی اور نکاسی آب کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ اس دباؤ کے تحت حکومت سندھ نے لازمی خدمات کو برقرار رکھنے کا ایکٹ (ای ایس ایم اے) منظور کیا جس کے تحت ہریجنوں کو ملک چھوڑنے سے روک دیا گیا۔ بھارت کے سیاسی رہنما اس پر برہم ہو گئے۔ اسمبلی میں شور مچ گیا۔ ان لیڈروں نے سوال کیا کہ حکومت اس پر کیا کر رہی ہے۔ تاہم حکومت نے کوئی خاص قدم نہیں اُٹھایا۔

وہ صرف مذاکرات ہی کر سکتی تھی۔ شاید اس سلسلے میں سب سے جان دار بیان اُمبیدکر کی طرف سے آیا۔ انھوں نے 1952ء میں پنجاب کے دورے کے دوران میں کہا:

> تقسیم کے فوراً بعد ہی پاکستان کی حکومت نے شیڈولڈ کاسٹ لوگوں کو ملک چھوڑ کر بھارت جانے سے روکنے کے لیے احکامات جاری کر دیے۔ پاکستان نے ہندوؤں کے وہاں سے چلے جانے کی پروا ہی نہیں کی۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ اگر جمعدار، بھنگی اور اچھوت وغیرہ پاکستان سے چلے گئے تو صفائی وغیرہ کے گندے کام کون کرے گا۔ میں نے پنڈت نہرو سے درخواست کی کہ وہ فوری اقدام کریں اور ان کی وہاں سے نقل مکانی پر پابندی ختم کرانے کی کوشش کریں۔ انھوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ وہ اس مسئلے پر سوئے رہے اور پاکستانیوں سے ہونے والی مختلف گفتگوؤں میں

اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ کانگریس کے ہریجنوں نے بھی اپنے بھائیوں سے ہونے والی اس زیادتی پر انگلی تک نہیں اُٹھائی۔[1]

بے گھر ہریجنوں کے بارے میں قانون ساز اسمبلی میں کئی سوالات اُٹھائے گئے۔ وزیر مملکت برائے بحالی شری موہن لال سکسینہ سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ پاکستان حکومت ہریجنوں کو روانگی کی اجازت نہیں دے رہی۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں۔ اب بھی 35 ہزار ہریجن پاکستان میں ہیں جن کو لازمی خدمات کے قانون کے تحت ملک چھوڑنے سے روکا جا رہا ہے۔ اُمبیدکر خود 1947ء سے مسلسل اس بات کے لیے جدوجہد کر رہے تھے کہ ہریجنوں سے اچھا سلوک ہو۔ انھوں نے دسمبر 1947ء میں پنڈت نہرو کی توجہ اس طرف دلائی تھی کہ پاکستان حکومت اپنی سرزمین سے شیڈولڈ کاسٹس کا انخلا روکنے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کر رہی ہے۔ انھوں نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ پاکستان کو گھٹیا کاموں کے لیے اور ملک کی بازمین آبادی کی خدمت کے لیے بطور بے زمین محنت کش ان کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جمع داروں، جنھیں لازمی خدمات[2] سے متعلق افراد قرار دے دیا گیا تھا، کو روکنے کی ایک اور مخصوص وجہ بھی بتائی۔ یہ امتیاز صرف پاکستانی ہی نہیں برت رہے تھے۔ بھارت کے مہاجر کیمپوں میں بھی شیڈولڈ کاسٹس کو پناہ لینے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ وہ زراعت پیشہ برادریوں کی تعریف پر پورا نہیں اُترتے تھے، کیوں کہ یہ برادریاں صرف وہی تھیں جن کے ایسا ہونے کا اعلان حکومت کرتی تھی۔ بعض مقامات پر شیڈولڈ کاسٹ برادریوں کو جو مشرقی پنجاب میں رہتی آ رہی تھیں، سکھ اور جاٹ اپنی زمینیں چھوڑنے پر مجبور کر رہے تھے جو ان پر قبضہ کے خواہش مند تھے۔ اُمبیدکر نے نہرو سے شکایت کی کہ اب تک حکومت ہند کی ساری توجہ مسلمانوں کے مسائل پر مرکوز رہی ہے۔ شیڈولڈ کاسٹس کے مسائل کے بارے میں یا تو یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ وہ موجود ہی نہیں ہیں یا انھیں اتنا معمولی سمجھا جا رہا ہے جو کسی خاص توجہ کے مستحق ہی نہیں ہیں۔ اُمبیدکر کا موقف اس

---

1 : بھگوان داس، ''دس سیوک'' اُمبیدکر، سلیکٹڈ سپیچز، جلد II، 1969، بھیم پتریکا پبلیکیشنز جالندھر، صفحہ 31 تا 42۔

2 : اُمبیدکر بنام نہرو، 14 دسمبر 1947ء۔

بارے میں صحیح تھا۔ شیڈولڈ کاسٹس کے مسائل ہندو، سکھ اور مسلمان شناختوں کو رعایات دینے کے عمل میں نظر سے اوجھل ہو گئے تھے۔ سوائے اس بات کے کہ بلاشبہ شیڈولڈ کاسٹس کو نظروں سے بالکل ہی غائب نہیں کیا جا سکتا تھا کیوں کہ وہ اہم، اگرچہ گھٹیا، فرائض انجام دیتے تھے۔ اس تضاد کا خلاصہ لاہور کے ایک مہاجر نے ہندو مہاسبھا کو اکھنڈ ہندوستان کے اس کے موقف کی تائید کرتے ہوئے لکھا: ''اگر ہم کسی بھارتی مسلمان (یا عیسائی) کو کھرچیں،'' اس نے کہا، ''تو پتہ چلے گا کہ اس کے اندر قدیم ہندو کاسٹ یا سب کاسٹ بدستور محفوظ ہے۔ صرف بیرونی کلچر کے خول نے اسے ہندو سے الگ کر رکھا ہے اور مہاسبھا کو چاہیے کہ وہ یہ خول اُتار دے، لیکن،'' اس نے خبردار کیا کہ ''ہمیں بھارت میں رہنے والے غیر ہندوؤں کو واپس حاصل کرنا چاہیے۔ انھیں جسمانی طور پر فنا نہیں کرنا چاہیے۔ (جیسا کہ سپین میں عیسائیوں نے مسلمانوں کو کیا) کیوں کہ اس سے ماہر کاری گروں کی ہماری برادری تباہ ہو جائے گی اور اس سے وہ اقتصادی بحران مزید سنگین ہو جائے گا جس کا بھارت کو سامنا ہے۔''[1] فنا کرنا شاید وہ انتہائی قدم تھا جس پر ہندو مہاسبھا جیسی تنظیموں کے رنگ میں رنگے ہوئے لوگ ہی غور کر سکتے تھے۔ لیکن شیڈولڈ کاسٹس ـــــ جو بہرحال ماہر کاری گروں کی برادری کا حصہ تھے ـــــ کی محتاط توازن پسندی، جو اپنی ذاتیت کو مسترد کرتے لیکن اپنی محنت پر اصرار کرتے تھے، وہی شے تھی جو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کر رہی تھیں۔

☆☆☆

جب میں نے یہ کہانیاں سنیں تو مجھے منٹو کی مشہور کہانی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' یاد آئی جس کے ہیرو سے جو دماغی مریض تھا۔ کہا گیا کہ وہ اپنے مذہب کی بُنیاد پر اپنے وطن کا انتخاب کرے۔ وہ دونوں ممالک کے درمیانی علاقے ''نومینز لینڈ'' میں موت کا انتخاب کرتا ہے۔ بالکل ایسے لگتا تھا کہ تقسیم کی تواریخ میں، مدھم شناختوں کی دھندلی دُنیا میں، کچھ فرقہ وارانہ سرحدوں کی سرایت پذیری کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ آپ کی شناخت طے ہو چکی تھی۔ یہ یا تو ایسی چھڑی تھی جس سے آپ کو مارا جا سکتا تھا یا پھر ایسی چھڑی جس کو آپ بعض رعایات و مراعات کی جنگ میں استعمال کر سکتے تھے۔

1 : ہندو مہاسبھا پیپرز، ایف نمبر سی-168 / 1947ء۔

لیکن شناختیں اتنی آسانی سے ایسی سرحدوں میں نہیں آ جاتیں۔ وہ مائع، تغیر پذیر اور اکثر حسب موقع ہوتی ہیں۔ ہریجنوں نے خود کو ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ سمجھا لیکن ایسے وقت بھی آئے جب انھوں نے خود کو ثقافتی اعتبار سے دونوں میں سے ایک گروپ کے ساتھ زیادہ قریب محسوس کیا۔ ہندو، جو بھارت میں اکثریت میں تھے، پنجاب میں اقلیت تھے، لیکن اضافی اصطلاح میں یہ سکھ ہی تھے جو ہندوؤں سے بھی زیادہ اقلیت تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ کے ہندو نے خود کو بہت زیادہ اقلیت میں اور غیر دوست گروپوں میں محصور دیکھ کر کانگریس کو چھوڑ دیا۔ ہریجنوں نے خود کو مذہبی گروپ نہیں سمجھا، چنانچہ وہ ہندو دائرے میں آنے یا فی الواقع مسلمانوں سے اتحاد کرنے کا سوچ سکتے تھے۔ اور یہ اتحاد مذہبی بُنیادوں پر نہیں بلکہ ثقافتی بُنیادوں پر یا جبر کا مشترکہ شکار ہونے کی بُنیاد پر تھے۔

ان کہانیوں میں جو میں نے تقسیم کے بارے میں اور تقسیم میں بچ نکلنے والوں سے سنیں، ایک چیز جس نے مجھے متوجہ کرنا شروع کیا، یہ تھی کہ یہ راستہ ان لوگوں کے لیے کیا معنی رکھتا تھا جن کے معاشرے اس نے غیر اہم بنا دیے۔ مثال کے طور پر ایسے تشدد نے، جیسا کہ تقسیم کے موقع پر ہوا، ایسے لوگوں کے ساتھ کیا کیا؟ تشدد اور اذیت ناک واقعات پر عقل یہی کہتی ہے کہ یہ سب سے برابر سلوک کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تشدد جب اتنی بڑے پیمانے پر ہو تو یہ ذات پات اور طبقات کے فرق کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ لوگوں کی بے وطنی کا عمل مختلف طبقات بھر میں اتنا عام تھا کہ لگتا تھا کہ بڑی مساوات برتی گئی ہے۔ بعض حوالوں سے یہ غلط بھی نہیں۔ مثال کے طور پر، عورتوں کی جبری عصمت دری کے واقعات میں طبقوں کے اختلاف کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ تاہم بالائی طبقات کی عورتوں کے سفر نسبتاً زیادہ محفوظ تھے۔ (مثال کے طور پر انھوں نے بذریعہ طیارہ، بذریعہ کار، زیر حفاظت سفر کیا اور غریب عورتوں کی طرح پیدل سفر شاذ ہی کیا) اضافی اصطلاح میں کہا جا سکتا ہے کہ جبری عصمت دری کا شکار ہونے والیوں میں سے اکثریت غریب طبقات کی عورتوں کی تھی، یا جہاں تک بے گھری کا تعلق ہے، اس کا تجربہ پھر تمام طبقات پر محیط تھا۔ لیکن پیچھے چھوڑے گئے یا ضائع ہونے والے مکانات اور زمینوں کا معاوضہ دیتے وقت کلیم کرنے والے کے اصل

طبقے کا خیال رکھا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے ہریجنوں کے معاملے میں دیکھا کہ وہ زرعی زمینوں کی تقسیم کی اہلیت پر پورا نہیں اُترے تھے۔

عورتوں اور بچوں کے برعکس دلتوں کو اپنے بارے میں ایک گروہ ہونے کا احساس تھا۔ مطلب یہ نہیں ہے کہ گروہ بندی سادہ یا یکساں تھی۔۔۔۔ دلت گروپوں کے اندر اختلافات موجود تھے جو خود کو مسلمانوں کے قریب سمجھتے تھے یا وہ جو خود کو ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ سمجھتے تھے اور وہ جو خود کو ہندوؤں کے قریب سمجھتے تھے۔ تقسیم کے وقت یہ اختلافات ابھر کر سامنے آئے۔ لیکن اگر عیسائیوں اور ہریجنوں کی برادریاں یا تنظیمیں تھیں تا کہ وہ ان کی نمائندگی کر سکیں اور اس بات کی کوشش کر سکیں کہ ان کی آواز سنی جائے، بہت سے دوسروں کے لیے یہ بات ناممکن تھی۔ ان قیدیوں کی نمائندگی کون کرتا جو مذہب کی بُنیاد پر تقسیم کر دیے گئے تھے، یا پھر ان دماغی مریضوں کی جن کو ''انتخاب'' کرنا پڑتا تھا یا پھر وہ لوگ جو سچ مچ معاشرے کی سرحدوں پر زندہ ہیں، ہیجڑے اور کوڑھی۔ ان سب کو اس وقت اپنی مذہبی وابستگیوں، اپنی شناختوں کا اعلان کرنا تھا۔ اور اگر وہ اعلان کرنے کے قابل نہیں تھے تو ان کے لیے ''انتخاب'' کر لیا جاتا تھا۔

بہت سارے حوالوں سے شیڈولڈ کاسٹس کے تجربات عورتوں کے تجربات جیسے ہیں۔ دونوں گروپ معاشرے نے غیر اہم بنا رکھے تھے اور پھر بھی اپنے کام کے حوالے سے لازمی تھے۔ ان کی اہمیت مادی میدان میں برابر مگر مختلف تھی۔ شیڈولڈ کاسٹس پیداوار (مثلاً زراعت) اور نکاسی آب کے نظام دونوں اور فی الواقع رسوم و رواج کے میدان میں اپنی مادی جائے وقوع کی وجہ سے لازمی تھے۔ اسی طرح عورتیں معاشرے کی تخلیق کار اور از سرِ نو تخلیق کار ہونے کی وجہ سے یکساں مادی اہمیت رکھتی تھیں۔ لیکن عورتوں کے پاس ایک اور باوقار لیکن برابر اہم شعبہ بھی تھا۔ ماں کا وقار، شان اور تحفظ اور اس طرح مادر وطن اور پھر اس کے نتیجے میں ان کے آدمیوں کی مردانگی کی قوتیں۔ ہاں بطور گروہ کے عورتوں کی نمائندگی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اس قابل تھیں کہ اجتماعی طور پر متحرک ہو کر اپنی نمائندگی کریں۔ تشدد اور بے گھری کا تجربہ اگرچہ عمومی تھا لیکن یہ انفرادی بھی رہا۔ مزید برآں اس کی نوعیت نے ہی اس بات کو یقینی بنایا کہ عورتیں اس کے بارے میں نہ تو بات کر سکیں نہ کریں۔ اس کے برعکس دلت منظم تھے۔

خواہ ان کی تنظیموں میں اختلافات ہی تھے—— وہ کم از کم اپنے مفادات کو کوئی نام تو دے سکتے تھے۔ ایسا کوئی راستہ عورتوں کے لیے نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی عورتیں جو بھی مزاحمت منظّم کر سکیں وہ انفرادی سطح پر رہی۔ انفرادی آواز۔ اور عورتوں کے معاملے میں جب وہ منتشر ہوں، کم ہی سنی جا سکتی تھی اور چنانچہ خود کو سرکاری بحث یا تاریخ میں شامل نہیں کرا سکتی تھی۔ اس طرح یہ بھی ایک وجہ ہے کہ تقسیم میں دلتوں کے تجربات پر مواد تلاش کرنا عورتوں پر مواد کے مقابلے میں نسبتاً آسان کیوں ہے۔ کیوں کہ تاریخ دانوں کو دستاویزات، تقاریر، یادداشتوں وغیرہ کے اُس شان دار ذخیرے تک رسائی حاصل ہوتی ہے جو اب تک نسبتاً اَن چھوا ہوتا ہے—— یہی وجہ ہے کہ دلت تجربے پر بیش تر مواد خود دلتوں کی آواز میں ہے، خواہ انفرادی ہو یا ان کی تنظیموں کی۔ عورتوں کی آواز، اس کے برعکس اس ذخیرے میں بہ مشکل ہی سنی جاتی ہے جو ہمارے پاس ہے۔ اس کے بجائے یہ ان کی آوازیں ہیں جو خود کو خواتین کا نمائندہ باور کراتے ہیں۔ اور اس وسیع گروہ میں دلت عورتیں بھی ہیں جن کی آوازیں دلت آوازوں کے ذخیرے سے یکساں طور پر غائب ہیں۔ چنانچہ بہ طور گروہ کے سب عورتوں کے لیے بس خاموشی ہے۔

تاہم تضادات اور پیچیدگیاں بہت تھیں۔ نئی قوم نے جو جمہوری ایجنڈا اور سماجی وژن دیا تھا اور برسرِ زمین بحالی کی پالیسیاں جس طریقے سے رو بہ عمل لائی جا رہی تھیں، ان میں توافق تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ ہریجن اپنی آبادکاری کے بعد بھی دوسرے درجے کے شہری رہے۔ اور جہاں نئی قوم کے ایجنڈے میں ان کی گنجائش بہت کم تھی، عورتوں کے لیے کافی زیادہ گنجائش تھی کیوں کہ ان کے مفادات مختلف تھے۔ چنانچہ بیوہ عورتیں شفیق ریاست کی مستقل ذمہ داری قرار پائیں، مسکین اور زبردستی بے آبرو کی جانے والی عورتوں کے لیے گھر اور آشرم بنائے گئے۔ میرج بیورو قائم کیے گئے اور ریاست نے عورتوں کی اخلاقی بہبود کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔ اس کے باوجود، اس وقت، شہریت کے بدلتے ہوئے جغرافیے، نئے بھارتی شہری کے لیے اصول مجموعی طور پر مرد شہری کا اُصول ہی رہا۔ اور اسی وجہ سے یہ ہوا کہ ریاست نے نہ صرف شفیق باپ کا کردار اپنایا بلکہ جہاں تک عورتوں کا تعلق تھا، ایک جابر باپ کے طرزِ عمل کا مظاہرہ بھی کیا۔ چنانچہ اگر انھیں ملک کا شہری ہونے کے حقوق اور مراعات

دی جا رہی تھیں، یہی حقوق، جبری بازیابی کے عمل کے طور پر پامال بھی کیے جا رہے تھے، بالخصوص ان عورتوں کے جو بازیاب نہیں ہونا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

میں نے اس باب میں شیڈولڈ کاسٹس کے تجربات پر زیادہ تر ہندوؤں اور بھارت اور پاکستان کے تعلقات کے حوالے سے بات کی ہے۔ بھارت سے باہر جو کچھ ہوا، مجھے اس کے بارے میں کوئی زیادہ علم نہیں لیکن میں اس باب کو ان دو کہانیوں پر ختم کرنا چاہتی ہوں جن کا تعلق غریبوں، پس ماندہ عوام سے ہے اور جو زندگی کے دو اہم ترین لمحات، پیدائش اور موت سے تعلق رکھتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ کہانیاں ان بہت سے خفیہ راستوں کی یاد دلاتی ہیں جن کے ذریعے تقسیم نے ہمارے لوگوں کی زندگیوں کو چھوا۔

دائیاں بچوں کو دُنیا میں لانے، ان کی پیدائش میں مدد دینے کا کام کرتی ہیں۔ عام طور پر ان کا تعلق نچلے طبقے سے ہوتا ہے۔ زچہ گیری کا کام ذرا غلیظ قسم کا ہے، دائی ہی اس غلاظت سے نمٹتی ہے۔ خون صاف کرنا، نال کو کاٹنا وغیرہ وغیرہ۔ اتنے ہی اہم لوگ وہ ہیں جو مردوں کو دفناتے یا ان کی چِتا جلاتے ہیں۔ بہت سی رسومات انجام دی جاتی ہیں۔ دونوں مواقع پر جسم کو نہلایا جاتا ہے اور کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ یہ کام یا تو بہت قریبی رشتے دار کرتے ہیں یا جن کا یہ پیشہ ہوتا ہے—— انیس قدوائی نے، جس کی متحرک یادداشت سے میں نے بار بار اور زیادہ باقاعدگی کے ساتھ اور روایتی تاریخ کی کسی بھی کتاب سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ رجوع کیا ہے—— ایک بوڑھے آدمی کی کہانی سنائی جس کی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔

> ایک دن جب میں کیمپ گئی، ہسپتال کی طرف، میں نے ہسپتال کے شامیانے میں ایک مریض کے ساتھ چارپائی پر ایک لاش دیکھی۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ زندوں کو دیکھنے کے لیے وقت تھا، مردوں کے لیے نہیں۔ قدرتی طور پر میت کو غسل دینے اور اسے تدفین کے لیے تیار کرنے اور کفن میں ملبوس کرنے کا کام اہل خانہ کرتے تھے۔ اس وقت جمعیت کرتی تھی۔ چنانچہ میں نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا۔
>
> کچھ وقت بعد جب انیس قدوائی واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ میت کو ابھی

تک وہاں سے ہٹایا نہیں گیا۔ اس نے پوچھا، اس بوڑھے کو دفن کرنے والا کوئی نہیں ہے؟ اس کے رشتے دار کہاں ہیں؟ لیکن وہاں ایک لڑکی، جو غالباً اس کی بیٹی تھی، اور اس کے کم عمر بیٹے کے سوا کوئی نہیں تھا۔ لڑکی سارا وقت روتی رہی لیکن اپنے باپ کی میت کو تدفین کے لیے تیار کرنے کا کام کرنے کی خواہش مند نہیں تھی۔ قدوائی اور اس کی سہیلی، جمیلہ نے کسی کی تلاش شروع کی۔ سب سے پہلے وہ امدادی کمیٹی کے دفتر میں گئیں۔ جہاں مولوی نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا تمام گورکن اور کفن دفن کرنے والے آخری ٹرین کے ذریعے پاکستان چلے گئے ہیں۔ اور اب یہاں یہ کام کرنے والا کوئی نہیں۔ ان کی درخواستوں کے باوجود اس نے کوئی مدد کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ اس کا کام نہیں ہے۔ میرے پاس پہلے ہی بہت کام ہے۔

مایوس قدوائی اور جمیلہ نے جامعہ کے طلبہ سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بھی جا چکے تھے۔ انھوں نے اس کی بیٹی کو آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ وہ بالکل ہی مایوس ہو چلی تھیں کہ دو بوڑھی عورتیں آئیں اور یہ کام کرنے کی پیش کش کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے یہ کام پہلے کبھی نہیں کیا لیکن ایک انسانی جسم دوسرے جسم سے مختلف نہیں ہو سکتا اور آخر کار اللہ کے نزدیک ہم سب ایک ہیں۔ اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے کام شروع کر دیا، جب کہ قدوائی، جمیلہ اور کچھ دوسروں نے قبر کھودنا شروع کر دی۔ بالآخر بوڑھے کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس کی بیٹی نے سوائے دیکھتے رہنے اور رونے کے کچھ نہیں کیا اور پھر یہ خاندانی ذمہ داری پوری ہونے کے بعد وہ پاکستان چلی گئی۔

جس طرح گورکنوں کے پاکستان چلے جانے سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ نعشوں کا کیا کیا جائے، اسی طرح سے دائیوں کے جانے سے بھی مسئلہ پیدا ہوا، اس فرق کے ساتھ کہ زندوں کا کیا کیا جائے۔ سترہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں انیس قدوائی کی بیٹی کشور قدوائی نے خود کو ایک بچے کی پیدائش میں غیر ارادی طور پر مدد دیتے ہوئے پایا۔ دُنیا میں داخل ہونے کے لیے بے تاب بچہ خود کو باہر دھکیل رہا تھا اور کشور جو اس وقت ہسپتال میں اکیلی تھی، نرس یا مڈوائف کو بری طرح ڈھونڈ رہی تھی، جو سب پاکستان جا چکی تھیں۔ جو ڈاکٹر آیا وہ ہندو اور مرد تھا۔ اس نے زچہ کی طرف پشت کر لی اور کشور کو

ہدایات دینے لگا جن پر وہ عمل کرتی گئی اور اپنے ذمہ لگائے گئے کام کو انجام دے ڈالا۔ انیس قدوائی نے کہا کہ بے شک تقسیم نے لوگوں کو بے خانماں کر ڈالا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیدائش اور موت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ نہ ہی وہ دوسرے معاملات ختم ہوئے جو زندگی کا معمول اور رسوم و رواج کا حصہ ہیں اور یہی وہ صورت حال ہے جس میں ان لوگوں کی اہمیت واضح ہو گئی جو بہ صورت دیگر غیر اہم سمجھے جاتے تھے۔

مایا رانی

''گھٹنوں گھٹنوں خون...''

میں رانی سے 86-1985ء میں چیپل اور ستی کھنہ کے ساتھ ان کی فلم 'اے ڈویژن آف ہارٹس'' کی تشکیل کے دوران میں ملی۔ جو انٹرویو آپ یہاں دیکھیں گے وہ ہم سب کی ایک مشترکہ کوشش تھی اگر چہ زیادہ تر سوالات ستی نے کیے۔ اس کو نقل اور اس کا ترجمہ میں نے کیا۔ جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکی ہوں کہ ہماری بحث کا اتنا زیادہ حصہ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں پر مرکوز رہا ہے کہ دوسروں کے تجربات، جن کی زندگیاں تقسیم سے متاثر ہوئیں۔ شاید ہی کسی داستان میں آئے ہوں گے۔ اس نقطہ نظر سے مایا کا انٹرویو خاص طور پر اہم ہے۔ اس کی گفتگو واحد کہانی ہے جو ذات پات کے مسئلے کو براہِ راست اور دوٹوک انداز میں واضح کرتی ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت مجھ پر بتدریج واضح ہوئی۔ اگر چہ یہ مایا ہی کا انٹرویو تھا جس نے مجھے ذات پات اور اس طرح طبقے کو بھی تقسیم کا اہم عامل سمجھنے کے راستے پر اٹھا کر ڈال دیا۔ وہ جس طرف اشارہ کر رہی تھی اگر میں اسے پہلے سے سمجھ لیتی تو شاید ایسے مزید لوگوں سے مل لیتی جو اس مسئلے پر بات کر سکتے تھے لیکن یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی انٹرویو ہے۔ چنانچہ اس بیانیے میں اس کا مقام بھی واحد اور اس طرح لازمی ہے۔

مایا کی عمر 55 کے لگ بھگ تھی جب ہم اس سے ملے۔ وہ ایک مضبوط پُر اعتماد پنجابی عورت تھی جو گزر بسر کرنے کے لیے دن بھر سخت محنت کرتی تھی۔ سکول میں اس کی مستقل ملازمت اسے ایک طرح کا تحفظ دیتی تھی جو اس کی خود اعتمادی کے لیے، جس کا مظاہرہ اس نے کیا، بہت اہم تھی۔ اس نے اپنے گھر میں ہم سے بات چیت کی اور اس

دوران میں ہر قسم کی ان اشیا کی طرف اشارے کرتی گئی جو تقسیم کی یاد دلاتی تھی۔ یہ وہ اشیا تھیں جو اس نے اور اس کی سہیلیوں نے اس وقت کی افراتفری اور اس احساسِ تحفظ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لوٹی تھیں جو انھیں کسی بھی متحارب فریق کا حصہ نہ ہونے کی وجہ سے حاصل تھا۔ میں اس کے اس بیگانہ اور تقریباً مزاحیہ اور کسی حد تک الگ تھلگ انداز داستان سرائی سے حیران رہ گئی۔ نہ کوئی آنسو، نہ یادوں کا کرب، نہ رونا دھونا۔ گویا جو بھی مار دھاڑ ہوئی، کسی اور کے ساتھ ہوئی ہو اور یہ سچ بھی تھا۔ جیسے کہ مایا نے کہا، انھیں کوئی ڈر نہیں تھا کیوں کہ وہ اور اس کی سہیلیاں، بچیاں تھیں اور سارا معاملہ کسی کھیل کی طرح سے تھا۔ ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب وہ فسادات اور جبری آبروریزی کے ایک واقعے کا ذکر کرتی ہے۔ وہ کچھ نوجوان لڑکوں کا ذکر کرتی ہے جو کسی عورت کو لے جا رہے تھے۔ صرف اتنا کہہ کے وہ بتاتی ہے کہ ''اور اس طرح دو گھنٹے گزر گئے۔'' چونکہ مایا کا انٹرویو ان پہلے انٹرویوز میں شامل تھا جن میں مَیں شریک تھی، یہ میرے لیے ان سوالات کے حوالہ سے بھی اہم ہے جو ہم نے نہیں کیے۔ ہم نے اس کی ہریجن شناخت کے سوال کو مزید کیوں نہیں کریدا؟ یا یہ معلوم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی کہ کیا دوسرے بھی اسی طرح سوچتے تھے جس طرح کہ اس نے محسوس کیا؟ گیارہ بارہ سال بعد ان سوالات کو پوچھنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ مایا اب کہاں ہے۔ مجھے اس بات کا سخت افسوس ہے کہ اس وقت میں اس کی بات کو سمجھ نہیں سکی اور اس طرح اس کی مزید کھوج نہیں کر سکی۔

مایا رانی

اس دن ... راستہ میں ہم نے بہت کچھ دیکھا—— چوری چکاری، لوگ ایک دوسرے کو مار رہے تھے۔ چنانچہ ہم چھت پر چڑھ گئے۔ بچے—— وہ سب اس وقت بچے تھے—— سب اس علاقے کی لڑکیاں تھیں۔ ہم سب چھت پر چڑھ گئے، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ وقت کے بعد فوج آ گئی۔ انھوں نے اونچی آواز میں ہم سے کہا کہ ہم نیچے آ جائیں۔ ورنہ وہ ہمیں گولی مار دیں گے۔ ہم اس پر بھی نہیں ڈرے۔ ہم اس وقت نوعمر تھے۔ آپ کو پتہ ہے اور زیادہ ڈرتے نہیں تھے۔ ہم دیکھتے رہے کہ کیا

ہو رہا ہے۔ لوگ لوٹ مار کر رہے تھے اور چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر ادھر اُدھر پھینک رہے تھے۔ کسی کے کانوں یا گردن میں کوئی زیور ہوتا تو وہ اسے کھینچ لیتے۔ کچھ لوگ دوسروں کو کاٹ رہے تھے، ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ دو روز تک لاشیں سڑکوں پر پڑی رہیں۔ کتے بھی ان کو کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ بہت خوف ناک تھا، پاکستان ہندوستان بنتے وقت موت اور تباہی تھی۔ ایک بہت مال دار مسلمان وکیل تھا۔ اس کے چھ گھر تھے۔ اس نے کہا، جو بھی ہو، ہم تو نہیں جائیں گے۔ ہم تو دینا نگر ہی میں رہیں گے۔ ہم گھروں کے اندر ہی رہیں گے اور اس وقت ہی باہر نکلیں گے جب کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ گھر میں کچھ بوڑھی عورتیں بھی تھیں۔ وہ کبھی باہر نہیں آتے تھے۔ لوگوں نے کہا، ٹھیک ہے انھیں رہنے دو۔ چنانچہ وہ ایک مہینہ پورا اپنے گھر کے اندر ہی رہے۔ پھر کچھ لڑکے آئے۔ انھوں نے کہا آؤ ہم تمھیں لے جاتے ہیں۔ چنانچہ گھر والوں نے اپنا سارا ساز و سامان ٹرکوں پر لادنا شروع کیا۔ لڑکوں نے کہا یہ یہیں رہنے دو، اسے ہم بعد میں تم تک پہنچا دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے سامان رہنے دیا۔ لیکن جب وہ گھر سے کچھ فاصلے پر گئے تو انھوں نے ٹرک پر پٹرول چھڑک کر اسے آگ لگا دی۔ ٹرک کے اندر ہر شخص زندہ جل گیا۔ یہ وہ کچھ واقعات ہیں جو ہم نے دیکھے۔ ہم ڈر گئے تھے؟ نہیں، ہم نہیں ڈرے۔ ہر شخص نے ہمیں ڈرانے کی کوشش کی، حتیٰ کہ ہمارے والدین نے بھی۔ لیکن علاقے کا کوئی بچہ، ہم میں سے کوئی بھی نہیں ڈرا۔ اکثر اوقات ہم اپنی چھت سے پڑوسی کی چھت پر کود جاتے، محض دیکھنے کے لیے۔ پھر ہم اکٹھے ہو کر لوگوں کے گھروں میں گھسنے لگے۔ بعض مکانوں میں ہمیں چاول ملے، کسی میں بادام، سویّاں... ہم نے ان سب چیزوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا اور اپنے گھر میں ڈھیر لگا دیا۔ بڑے بڑے برتن، پتیلے، پراتیں... ہم نے وہ سب چیزیں اکٹھی کر لیں۔

ہاں یہ بچوں نے کیا۔ پھر شہر کے بڑے، ہندو، آئے۔ انھوں نے سوچا، یہ اچھی بات نہیں۔ اس قسم کی لوٹ مار ـــــ اسے روکا جانا چاہیے۔ ممکن ہو تو کسی کو رنج پہنچائے بغیر۔ چھ سات اہم آدمی اکٹھے ہوئے اور ہمیں بلایا۔ ہم سب اکٹھے تھے، ہمارے لوگ، انھوں نے کہا، ایسا مت کرو۔ تمھاری بھی بعد میں تلاشی ہوگی اور تم سے ساری چیزیں چھین لی جائیں گی۔ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ہم باز نہیں آئے اور

کرتے گئے۔

ہمارے باپ نے بھی ہمیں روکنے کی کوشش کی۔ اور جب بھی اس نے ہمیں یہ بات کہی، ہم نے کہا، ٹھیک ہے، ہم نہیں کریں گے۔ لیکن جیسے ہی لوگ چلے جاتے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگتے، ہم پھر سے شروع ہو جاتے... چاول، خوارک، ہر قسم کی اچھی اچھی چیزیں، ایک دُکان سے ہم خالص گھی اور بادام چوری کرتے اور دوسرے مقامات سے کپڑا اُٹھا لیتے۔ ہم نے اتنے برتن اکٹھے کر لیے کہ ہم نے ایک اتنا بڑا کمرہ ان سے بھر لیا جتنا بڑا یہ ہے۔ جب ہم نے یہ کام کر لیا تو شہر کے بڑوں نے اعلان کیا کہ پیتل کے تمام برتن جو کسی گھر سے برآمد ہوں گے، ضبط کر لیے جائیں گے۔ وہ انھیں ہتھیانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ہم نے انھیں بیچ ڈالا۔ بعد میں لوگوں کو پتہ چلا کہ یہ تو سارا مال سستے داموں ہتھیانے کی ترکیب تھی—— دکان داروں نے بہت مال کمایا۔

ہم نے اپنے والد کو بتایا کہ اب ہم اندر ہی رہیں گے۔ آپ اس گھر کو دیکھ رہی ہیں؟ ہمارے پڑوس میں مسلمانوں کے گھر ہوا کرتے تھے۔ ہم بس اپنی چھت سے ان کے گھر میں کود جاتے۔

میں نے بہت سے نئے برتن، حمام وغیرہ اپنی شادی کے لیے رکھ لیے۔ جب میری شادی ہوئی تو میں بہت سے برتن اپنے ساتھ لائی۔ میں نے بہت سی رضائیاں اور کمبل بھی لوٹے تھے۔ جن میں سے کچھ بنے بنائے تھے اور کچھ میں نے اس سامان کی مدد سے تیار کیے جو ہم نے لوٹا تھا۔ ہم گیارہ لڑکیاں تھیں۔ ہم سب نے اپنا جہیز اسی لوٹے گئے سامان سے بنایا... ان میں سے دو لڑکیوں کی شادی بٹالہ میں ہوئی۔

میری اپنی کوئی مسلمان سہیلی نہیں تھی لیکن میری ماں کی ایک سہیلی تھی جس کی حال اتنی خراب تھی کہ میں بہت غم زدہ ہو گئی۔ میری ماں کی کوئی بہن نہیں تھی چنانچہ یہ سہیلی اس کی بہن کی طرح تھی۔ وہ اس کے لیے رو پڑی۔ ہم بھی روئے۔ میری ماں نے کہا تمھاری ماسی کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کی بیٹیاں تھیں اور اس نے میری ماں سے التجا کی کہ وہ انھیں رکھ لے۔ لیکن، میری ماں نے کہا کہ ہم انھیں کیسے رکھ سکتے ہیں۔ پولیس ایسا نہیں کرنے دے گی، ہندو ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ میں تمھاری بیٹیوں کو کس طرح چھپا سکتی ہوں؟ میرے ہاتھ بندھے ہیں۔ تمھیں پتہ ہے، ہندوؤں کی ہر ایک پر کڑی نظر ہے۔ اگر کوئی کسی کو چھپائے تو وہ فوراً آ جائیں گے۔ وہ اسے باہر

نکالنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جب معاملات کچھ بہتر ہو گئے تو ہمیں پتہ چلا کہ میری ماں کی مسلمان سہیلی پر بہت برا وقت گزرا۔ جس جگہ وہ رہتی تھی، اسے تباہ کر دیا گیا۔ تقسیم کے کچھ عرصے بعد میری ماں پاکستان گئی، کیوں کہ سڑکیں کچھ دِنوں کے لیے کھول دی گئی تھیں، 8 دِنوں کے لیے۔ میری ماں نے کہا کہ اسے ضرور جانا چاہیے کیوں کہ وہ اس سہیلی اور اس کے اہل خانہ کو جو لاہور میں رہتے تھے، ملنا چاہتی تھی۔ پاکستان میں وہ اپنی کئی مسلمان سہیلیوں سے ملی اور ان سے اپنی اس سہیلی، فاطمہ کے بارے میں پوچھا۔ اسے پتہ چلا کہ اس کا سارا گھر تباہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن میری ماں اپنی تمام مسلمان سہیلیوں سے مل کر بہت خوش تھی۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش تھیں۔

اب بھی جب ہم پاکستان جاتی ہیں تو اپنی سب سہیلیوں سے ملتی ہیں اور سب ہم سے نہایت محبت سے ملتے ہیں۔ لڑائی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تھی، ہم مسلمانوں سے نہیں لڑے تھے۔ اس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں وہاں کبھی نہیں رہی، میری ماں جاتی تھی۔ اور آپ کو پتہ ہے، میری سہیلی، جو لیڈر تھی، وہ گئی اور میرے چچا سے ملی اور انھوں نے میرے بچوں کے لیے بہت سی چیزیں مجھے بھجوائیں۔ جلد ہی وہ پھر جانے والی ہے۔ اس نے اپنے لیے پرمٹ بنوا لیا ہے۔ وہ ہر مرتبہ دہلی سے ویزا لیتی ہے اور پھر دونوں چلی جاتی ہیں۔ میں ایک دن پہلے اسے ملی تھی اور اس نے مجھے پوچھا تھا کہ کیا میں کوئی شے اپنے چچا کے لیے بھجوانا چاہتی ہوں؟

☆☆☆

یہ خاص قسم کا وقت تھا اور ہم سب بچے تھے۔ چنانچہ سارا معاملہ ہمارے لیے کسی کھیل کی طرح تھا۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا—— یہ بات تو بڑے اور سمجھ دار ہونے پر ہی سمجھ میں آتی ہے۔ بچے یہ بات کس طرح سمجھ سکتے ہیں؟ جلد ہی میری شادی ہو گئی اور میں پاکستان کے بارے میں سب کچھ بھول گئی—— یہ تقسیم کے تقریباً ایک سال بعد کی بات ہے اور میں نے سارا سامان اپنے جہیز کے لیے استعمال کر لیا۔ میری ایک سہیلی، جس کی شادی بٹالہ میں ہوئی تھی اور میں اکٹھی ہی گئی تھیں۔ میرے پاس سونا بہت کم تھا۔ لیکن اسے کسی گھر سے کافی سونا مل گیا تھا جسے اس نے شادی کے لیے استعمال کر لیا۔ اس کی شادی بہت شان دار تھی لیکن شادی کے بعد ہم اس پرانے

وقت کے بارے میں سب کچھ بھول گئے۔

اور اب ہمیں کوئی کچھ بتانے والا نہیں ہے۔ اگر اس وقت کوئی سمجھ دار آدمی ہماری رہنمائی کرنے والا ہوتا تو وہ ہمیں بتا دیتا کہ کیا ہوا تھا۔ آخر، ایک آدمی کیا کر سکتا ہے۔ آپ ہر چیز تو نہیں سوچ اور سمجھ سکتے۔

مسلمان اور ہندو اس لیے آپس میں لڑ پڑے کہ انگریزوں نے انھیں تقسیم کر دیا تھا۔ انھیں بتایا کہ وہ الگ الگ لوگ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اگر تمھیں آزادی چاہیے، تاکہ اپنے پر خود حکومت کر سکو تو تمھیں الگ الگ ہونا پڑے گا۔ ورنہ، ہم کیوں الگ الگ ہوتے؟ پہلے یہ افواہ تھی کہ پاکستان بن چکا ہے اور ہندو اور مسلمان اس میں مل کر رہیں گے۔ اور ہندوستان بھی بن چکا ہے اور اس میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ بہت اچھی اور قابل قبول بات تھی۔ لیکن پھر کچھ لوگوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مخفی طاقت دے کر اُکسایا۔ اور انھوں نے کہا کہ اس علاقے کو آزاد بنانے کے لیے جیسا کہ ہم پنجابی میں کہتے ہیں گھٹنوں گھٹنوں تک خون ہونا چاہیے۔ اور پھر یہی کچھ ہوا۔ اتنا خون بہایا گیا کہ ہمارے گھٹنوں تک آ گیا۔ یہ گڑ بڑ پیدا کرنے والوں کے مشورے پر ہوا۔ الگ الگ ہو جاؤ، الگ الگ رہو اور اس زمین پر امن نہ ہونے دو۔ اگر یہاں جھگڑا رہے گا تو انگریز لوگ کسی اور ملک کی طرف نظر کر سکیں گے۔ یہاں کے بارے میں انھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یہ بعض شیطان قسم کے لوگوں کا منصوبہ تھا۔

میں کسی انگریز کو نہیں جانتی تھی—— میں صرف سنی سنائی باتیں بتا رہی ہوں۔ ایک بوڑھا بابا ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیں بتایا کرتا تھا کہ اس ساری گڑ بڑ کے پیچھے وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ برطانوی دوبارہ آ جائیں۔ ہر مرتبہ ہم یہی سنا کرتے کہ ہم اپنے ملک کو چلانے کے قابل نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ بہت اچھا منصوبہ تھا کہ ہمیں لڑا دیا جائے۔ دو ایک روز قتل کیے جائیں، تین اگلے روز تاکہ آخر میں ہم دست بردار ہو کر کہیں کہ یہ کام ہمارے بس کا نہیں، تم ہی کرو، تم ہی اس ملک پر حکمرانی کرو، یہ تمھارا ہی کام ہے۔

امن؟ دوسرے دور میں بھی وہی چیزیں ہوئیں۔ صرف یہ کہ اس مرتبہ یہ معاملہ ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان تھا۔ اسی طرح اختلافات اور تقسیم پیدا کی گئی جس طرح کہ پاکستان کے وقت ہوا تھا۔ یہاں بھی سب لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ہم الگ

ہو جائیں۔ سکھوں میں ایسے لوگ تھے جو یہ زور دیتے تھے کہ وہ الگ ہونا چاہتے ہیں۔ وہی وقت آ رہا ہے، اسی قسم کا وقت جیسا کہ تب تھا۔ کچھ لوگ یہاں مر رہے ہیں، کچھ وہاں۔ پاکستان اور ہندوستان کے وقت میں جو باتیں ہوئی تھیں، وہی جذبات جو اس وقت تھے ـــــ لیکن جب لوگوں کو احساس ہوا کہ کیا ہونے والا ہے تو حکومت کے لوگوں نے صورت حال کو سنبھال لیا، ورنہ معاملات بہت خراب ہو جاتے۔

اس وقت میں 16 برس کی تھی۔ ہم کام کرتے تھے۔ میں ان کے گھر پر کام کر رہی تھی۔ ان کی گائے کو چارہ کھلاتی، اس کی صفائی ستھرائی وغیرہ کرتی تھی۔ اور ان کے گھر کی صفائی کرتی۔ جیسے ہی میں نے کام ختم کیا، میرا باپ آ گیا۔ اس کے کندھے پر اتنا بڑا چھرا تھا۔ وہ آیا اور بولا، بسنت کور، اور اس نے جواب دیا، ہاں، بھائی، کیسے ہو؟ اس نے کہا کہ میں اپنی بیٹی کو لینے آیا ہوں۔ وہ بولی کیوں؟ کیا گڑ بڑ ہے؟ میرے باپ نے کہا کہ کچھ نہیں، لیکن بسنت کور نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ کچھ نہیں کا کیا مطلب ہے؟ تم کو عام دِنوں میں کبھی نہیں دیکھا اور آج تم یہاں ہو، کچھ نہ کچھ ضرور گڑ بڑ ہے۔ شام کا وقت تھا۔ میرے باپ نے کہا، بہن، ایک بات بتا دوں، اپنا سامان باندھو اور جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس نے پوچھا کیوں؟ اس نے کہا پاکستان بن چکا ہے اور وہ چلّائی، رام، رام، رام۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیا ہے؟ جلد ہی علاقے میں موجود سب لوگ اکٹھے ہو گئے اور ہر طرف پریشانی تھی، لوگ پوچھ رہے تھے، یہ کیا ہو گیا۔ یہ کیا ہے؟ قریب ہی ایک مسلمان کا گھر تھا اور اس گھر کی عورت یہ کہہ رہی تھی، گھبراؤ مت، گھبراؤ مت۔ ہم اسی طرح رہتے رہیں گے جس طرح اب رہ رہے ہیں۔ قدرتی بات ہے۔ کیوں کہ وہ سب دوست تھے اور یہاں برسوں سے رہتے آئے تھے۔ لیکن ہم نکل پڑے اور چلتے گئے... لوگوں نے کہا گھبراؤ مت، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ کچھ آگے جا کر دو لاشیں پڑی تھیں اور کچھ اور آگے لڑکوں کا ایک گروپ ملا۔ وہ مسلمان تھے اور ایک عورت کو لے کر جا رہے تھے۔ اڑھائی گھنٹے اسی طرح گزر گئے۔ پھر ہم نے کچھ لوگوں کو چیخ چیخ کر ہندوستان ہندوستان کہتے سنا۔ اور ہندوؤں کی اُمید پھر سے بندھ گئی۔ اور اب انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا، گھبراؤ مت، اس ہندو مسلمان جھگڑے میں کچھ نہیں ہے۔ ہم اکٹھے ہی رہیں گے، جس طرح کہ ہمیشہ رہتے رہے ہیں۔ لیکن

فسادیوں کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ گڑ بڑ اور لڑائی کرانے پر تُلے ہوئے تھے۔ ایک گھر میں وہ اپنا کھانا تیار کر رہے تھے لیکن انھیں چھوڑ کر جانا پڑا اور گندھا ہوا آٹا پرات میں اسی طرح پڑا رہ گیا۔ ہم وہاں گئے اور دیکھا کہ چولھے میں آگ ابھی تک گرم تھی۔ ہم ان گھروں میں دم سادھے اور ڈرتے ڈرتے گئے۔ کہیں ان کے مالکان کہیں چھپے نہ بیٹھے ہوں۔ ہم چاہتے تھے کہ ان کی سب چیزیں چوری کر لیں۔ ہم کچھ ڈرے ہوئے بھی تھے۔ فرض کرو، وہ وہیں ہوئے؟ اور ہم یہ کرتے گئے۔ ایک گلی سے دوسری گلی میں۔ ہمارے بڑے پریشان تھے، وہ ہمیں روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہم مار دیے جائیں گے۔ لوگ ہمیں مسلمان سمجھ لیں گے لیکن ہم نے سوچا کہ کون ہمیں پکڑے گا، کون ہمیں مارے گا۔ ہم خود کو ہریجن، ہندو اور عیسائی کہتے ہیں۔ کوئی ہمیں نہیں پکڑے گا۔ اور اس طرح ہم چھتیں پھلانگتے گئے، اس بات کی زیادہ پروا کیے بغیر کہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر ایک دن آیا کہ حالات بہت ابتر ہو گئے۔ لوگوں نے چیزیں لوٹنا شروع کر دیں۔ مسلمانوں کا سارا محلّہ جلا دیا گیا۔ ہر طرف آگ تھی اور حالات سچ مچ بہت ہی خراب ہو گئے۔ اور لوگوں نے سوچا کہ اگر مال دار لوگوں کے مکانات کو بھی اسی طرح آگ لگائی جا سکتی ہے تو غریب لوگوں کے مکانات کو آگ لگانے میں کیا ڈر ہے۔ چنانچہ ان کو بھی آگ لگا دی گئی۔ کچھ گھروں میں، ایک گھر میں ایک بہت چھوٹا بچہ رو رہا تھا، ''تم نے میری ماں کو دیکھا ہے، تم نے میری ماں کو دیکھا ہے؟''

ہم حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، لیکن ہمیں اس کی سمجھ نہیں تھی۔ صرف بڑے لوگوں کو پتہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم زیادہ وقت دیکھا ہی کرتے، اگر یہ علاقہ پاکستان میں چلا جائے تو بھی ہمارے گھر کوئی خطرہ نہیں تھا کیوں کہ ہم ہریجن تھے۔ پاکستان ہو یا بھارت، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں تھا۔ ہم نے اسی جگہ رہنا تھا، جہاں ہم پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے بڑے یہ سوچتے تھے کہ جو بھی ہے، ہم اس جگہ کو نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ہمارا گھر تھا۔ اکثر کوئی ہمیں چھوڑنے پر مجبور کرنے کوشش کرتا تو ہم اپنی طاقت دکھا دیتے۔ آخر کار ہریجن کوئی اَیرے غیرے تو نہیں ہیں، ہم بھی ایک طاقت وَر گروہ ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم اپنے لیے ایک الگ ملک مانگ لیتے اور وہ انھیں ہم کو دینا پڑتا۔ یہ جان کر ہم نے خود کو طاقت وَر محسوس کیا۔ بالکل جیسے اب سکھ اپنا الگ ملک مانگ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین ملک بن جائیں، ہندوستان، پاکستان اور سکھستان۔ پھر تیسرا ملک

مانگنے میں کیا خرابی ہے؟ آج بھی ہم اسی طرح سوچتے ہیں ـــــ ایک وقت تھا کہ صرف ہمارے بزرگ ایسا سوچتے تھے لیکن آج ہمیں بھی پتہ ہے۔ ہر ایک نے حکومت حاصل کی۔ ہندوؤں نے حکومت لی، سکھوں نے لی اور اس وقت انگریزوں نے لی، لیکن ہمارے جیسے لوگ اس حساب میں کہاں ہیں؟ ہمیں کیوں بھلا دیا گیا؟ کسی نے بھی غریب لوگوں کی پروا نہیں کی۔ ہریجن اور عیسائی، ہم تصویر میں نہیں آئے۔ ہم نے اندرا گاندھی اور اس کے باپ سے بھی بات کی، دونوں نے ایک ہی بات کی کہ یہ تمھارا اپنا ملک ہے، تم ہی اس کے حکمران ہو۔ میرا باپ ہمیں بتایا کرتا تھا کہ نہرو نے بھی یہی بات کی تھی کہ یہ تمھارا اپنا ملک ہے، تم ہی اس کے حکمران ہو۔

تم پوچھتی ہو، میرے باپ دادا نے کیا کام کیا۔ میرا دادا ایک جمعدار تھا، غلہ منڈی میں، بعد میں میرے باپ نے بھی وہیں کام کیا۔ اس کے پاس سرکاری نوکری بھی تھی۔ اور پھر میرے بھائی نے بھی وہیں سرکاری نوکری کے ساتھ کام کیا۔ غلہ منڈی کا کام طویل عرصے سے ہمارے خاندان میں رہا ہے ـــــ میں کالج میں کام کرتی ہوں اور میں نجی طور پر بھی بعض گھروں میں کام کرتی ہوں۔ میں صبح آٹھ بجے کام شروع کرتی ہوں اور گیارہ بجے تک کرتی رہتی ہوں۔ پھر کالج چلی جاتی ہوں۔ اس کے بعد ایک گھر میں۔ پھر دوبارہ کالج میں دو بجے تک کام کرتی ہوں۔ لیکن کبھی کبھی میں وہاں لیٹ جاتی ہوں اور وہ مجھے کبھی نہیں پوچھتے کہ میں لیٹ کیوں آئی ہوں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ میں کام چوری نہیں کرتی۔ دوسرے گھروں میں مَیں کپڑے دھوتی ہوں، گرد و غبار جھاڑتی ہوں، صفائی وغیرہ کرتی ہوں۔

زندگی کے بارے میں میرا علم ایک بات بتاتا ہے، کہ اس سارے لڑائی جھگڑے کا کوئی انجام نہیں۔ اور اگر یہ رک بھی جائے، معاشرے کے بُرے لوگ اسے رُکنے نہیں دیں گے۔ 16 سال کی عمر سے لے کر آج تک میں نے لڑائی جھگڑے کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ اسے ختم کرنے کا کوئی راستہ ہے۔ ہم میں سے کسی کے پاس اس کا علاج نہیں۔ یقیناً اگر وہ رُک جائیں تو شان دار بات ہوگی۔ ہمارے ملکوں میں امن ہو جائے گا۔ ہمارے پاکستان یا ہندوستان یا ہمارے پنجاب یا ساری دُنیا میں۔ لیکن فساد پیدا کرنے والے ایسا ہونے نہیں دیں گے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ پنجاب میں بھی دوبارہ امن نہیں ہونے دیں گے۔

ہم نے ایک قتل کی ہوئی لڑکی دیکھی۔ اس کے ٹکڑے کر کے پھینک دیے گئے تھے۔ انھوں نے اس کی بالیاں نوچ لی تھیں اور اسے پھینک دیا تھا۔ کچھ اور آگے وہ ایک نوجوان لڑکی کو گھسیٹ رہے تھے اور وہ بے چاری اپنی جان بچانے کے لیے نزدیکی نہر میں کود گئی۔ یہ تھا جو ہم نے دیکھا۔ ایک لڑکی تھی، شیخوں کی—— ان کے دو بچے تھے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکا باہر گیا ہوا تھا اس لیے لڑکی ہی ان دونوں کے لیے بیٹے کی طرح تھی۔ وہ خود کو لڑکا کہا کرتی تھی۔ وہ شخص اسے کاکا کہتا تھا۔ کچھ غنڈے چیختے ہوئے اسے پکڑنے کے لیے پہنچے، وہ کہہ رہے تھے، ہم اس کاکے کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ کاکا چاہیے۔ ہم دیکھیں تو سہی یہ کاکا ہے کون۔ وہ اپنی عزت بچانے کے لیے چھت سے کود گئی۔ وہ بے عزت نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اس وقت پولیس کو کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کسی کے لیے کچھ نہیں کرتی تھی۔ فوج نے کچھ مدد کی۔ انھوں نے لوگوں کو محفوظ راستہ دیا، نکلنے میں مدد دی۔ پولیس دوسروں کی طرح ہی لوٹ مار کر رہی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت لوگ عزت اور اخلاق کا احساس بھی کھو بیٹھے تھے۔

ان اڑھائی گھنٹوں کے دوران میں جب ہم نے پہلی بار یہ سنا کہ دینا نگر پاکستان کا حصہ بن گیا ہے، مسلمانوں نے ہندوؤں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور پھر اڑھائی گھنٹوں کے بعد ایک ٹیلی فون آیا کہ نہیں دینا نگر پاکستان میں شامل نہیں ہوا، یہ ہندوستان کا ہی حصہ ہے، اس بار رُخ پلٹ گیا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا... نعرے لگاتے ہوئے انھوں نے لوگوں کو گھروں سے نکالا اور مار ڈالا۔ انھوں نے انھیں گھروں سے باہر نکال ڈالا۔ عورتوں کی جبری عصمت دری کی۔ نوجوان عورتوں کی... ہندوؤں نے پہلے یہ کہا کہ ہم بھائی بہن ہیں۔ ہم سب اکٹھے ہیں۔ یہی بات تھی جو انھوں نے سب سے پہلے کہی۔ اگر پاکستان بن جاتا تب بھی ہم اکٹھے رہیں گے۔ آخرکار، وہ کس طرح اپنی جانیں، اپنے گھر چھوڑ کر چلے جاتے۔ نہیں، وہ اکٹھے رہتے، یہ تو شیطان نے گڑبڑ پیدا کی۔ وہ ہمیں لڑانا چاہتے تھے۔ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہم حکمرانی کے قابل نہیں، تاکہ انگریز کو واپسی کا موقع مل سکے۔



MashalBooks.com

8
یادیں

MashalBooks.com

MashalBooks.com

اِس قسم کی مشق، جیسی کہ یہ ہے، شاید سب سے مشکل مرحلہ اسے ختم کرنا ہوتا ہے۔ تقسیم کے بارے میں ایسی کیا بات میں کہہ سکی ہوں جسے مناسب اختتام کہا جا سکے، یا کیا یہ کہ یہ بہت اہمیت کا حامل واقعہ تھا، یہ کہ اس نے لوگوں کی زندگیوں کو عدیم النظیر اور بہت گہرے انداز میں متاثر کیا؟ یہ کہ اس کا برصغیر کی تاریخ پر اثر بہت گہرا اور دور رَس تھا؟ یہ سب باتیں درست ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی کافی نہیں۔ تقسیم کے بارے میں جاننے کی باتیں اتنی زیادہ باقی ہیں کہ ایسی مشق، جیسی کہ میں نے کرنے کی کوشش کی ہے، اس تاریخ کے علم میں پہلا قدم ہی ہو سکتی ہے۔

جب میں نے تقسیم پر کام شروع کیا، مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں کیا کچھ معلوم کروں گی۔ کئی لحاظ سے میں نے کسی موہوم کے طور پر یہ کام شروع کیا: کوئی ایسا شخص جو اس واقعے کی تاریخ سے واقف ہو—— جیسا کہ بہت سے بھارتی ہیں جنھوں نے سکول میں جدید تاریخ پڑھی ہے—— اور کوئی ایسا شخص جو اس کی کہانیاں سنتے بڑا ہوا ہو، کہانیاں جو اس سے توافق نہیں رکھتیں جو سکول میں ہم نے پڑھیں، کہانیاں جو شاید اسی وجہ سے ہم معتبر نہیں سمجھتے۔ 1984ء کے بعد جب میں نے یہ کہانیاں سننا اور ان پر توجہ دینا شروع کی تو میرا احساس غصے کا تھا۔ تقسیم کی تاریخ اس بیان سے کیوں محروم ہے کہ تقسیم نے عام لوگوں کی زندگیوں پر کس طرح اثر ڈالا؟ لوگ اس سے واقعتاً کیا مراد لیتے تھے؟ تاریخ دانوں نے کیوں نہیں اس چیز کا جائزہ لینے کی کوشش کی جو میں نے تاریخ کے اندر پائی۔ احساسات، جذبات، تکلیف اور غصہ، اذیت، نقصان کا احساس، وہ خاموشی جس میں یہ سب لپٹا ہوا تھا—— یہ محض تاریخ نگاری کی غفلت تھی یا اس سے زیادہ کوئی شے—— ایک انکار، تاریخ دانوں کی طرف سے اس دہشت ناک مصیبت کا سامنا کرنے سے انکار، جو دُکھوں اور صدموں سے اتنی

بھری ہوئی ہے کہ اس کا سامنا کچھ فاصلے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے ذرائع کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کو ماضی کا معروضی جائزہ لینے کی طرف لے جائیں: آپ ایسی صورت حال میں معروضیت کہاں سے لائیں گے جس میں خود آپ کا خاندان شامل ہو۔ موت، بے گھری، بے وطنی، گھر اور خاندان کا نقصان —— یہ سب مؤرخین، بالخصوص جو شمالی بھارت کے تھے، کے اتنے نزدیک تھے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ تقسیم کی تاریخ اب تک صرف ملک کی تاریخ سے ہی متعلق رہی ہے۔ 1984ء کا سال بہت سے تاریخ دانوں کے لیے اہم موڑ رہا ہے لیکن 1984ء کے بعد بہت سے مساوی بحرانی واقعات پیش آئے۔ پنجاب کے فسادات، شمال مشرق میں کشیدگی میں اضافہ، ہندو دائیں بازو کا بڑھتا ہوا اثر، 1992ء میں بابری مسجد کا ہندو فرقہ پرستوں کے ہاتھوں انہدام اور اس کے نتیجے میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات جس کے بعد —— لوگوں نے خوف اور بے بسی سے دیکھا کہ —— بھارتی معاشرے کا تانا بانا نسلی اور مذہبی شناختوں سے بنا جانے لگا۔

تقسیم ان بہت سے لوگوں سے ملنے دوبارہ آ گئی تھی جو محض تماشائی تھے اور ان دوسروں سے بھی جو اس کا شکار اور شریک رہے تھے۔ ''اُس وقت'' کی کہانیاں پھر سامنے آنے لگیں۔ 1984ء ''پھر تعلیم'' کی طرح تھا۔ ''ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ یہ ہمارے ہی ملک میں ہمارے ساتھ ہو گا۔'' یہ وہ خیال تھا جس کا اظہار سکھوں اور مسلمانوں نے 1984ء اور 1992ء میں کیا۔ مذہبی معاشرے پر بھارتی معاشرے کی یہ بڑھتی ہوئی قطبیت تھی، جو میرے خیال میں، تقسیم کی تاریخ کے از سرِ نو تجزیے کا باعث بنی۔ ایسا از سرِ نو تجزیہ جس کی ہمارے حال کی پریشانیوں میں گہری جڑیں ہیں۔ اسی کی وجہ سے میں ذاتی طور پر سمجھ سکی کہ کیسے اور کیوں بعض تاریخی تحقیقات بعض مواقع پر اہم ہو جاتی ہیں۔ ماضی کی ان خاص قسم کی تحقیقات کی جڑیں حال کے بعض مخصوص تجربات میں ہوتی ہیں۔ یہ حال، اس میں ہمارا ملوث ہونا، اس کی ایسی تشکیل کی خواہش جو ہمیں اپنی مرضی سے مستقبل کی طرف لے جائے، ہی ایسی باتیں ہیں جو ماضی کا سفر کرنے اور اس کی از سرِ نو کھوج کا باعث بنتی ہیں۔ یہ بات ان لوگوں کے لیے نئی نہیں ہو گی جو تاریخ کے تجربے میں مصروف ہیں، لیکن میرے لیے یہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے مجھے یہ

احساس کرایا کہ وہ سوالات جنھوں نے مجھے پریشان رکھا، صرف میرے نہیں تھے۔ دوسرے بھی ان ہی خطوط پر سوچ رہے تھے اور اسی طرح کی کھوج کر رہے تھے۔

ایک نصف صدی ـــــ ایک الل ٹپ عدد، لیکن شاید بہرحال اس کے کچھ معنی ہوں ـــــ کچھ دوسرے آغاز کرتی ہوئی بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت سے لوگ جو تقسیم کا شکار ہوئے اور اس سے بچ نکلے، اب 70 اور 80 کے پیٹے میں تھے۔ اس تاریخ کا پھر سے سفر کرنے والے مؤرخین کے لیے ان بچ نکلنے والوں سے بات کرنا، ان کی شہادتیں اکٹھی کرنا، بہت اہم ہو گیا تھا، جب کہ ابھی یہ ممکن تھا۔ خود بچ نکلنے والوں کے لیے، نصف صدی کے فاصلے اور ان واقعات نے جو اس عرصہ میں انھوں نے سامنے لانے کے لیے محرک کا کام دیا۔ اگرچہ بہت سے لوگ اپنی زندگی کے ''اس وقت'' کے بارے میں بات کرنے میں بہت تکلیف محسوس کرتے تھے، پھر بھی بہت سے دوسرے ایسے بھی تھے جو چاہتے تھے کہ ان کی کہانیاں ریکارڈ کی جائیں۔ انھوں نے سوچا کہ ان کے لیے ایسا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ تقسیم کی نئی کھوج کے لیے حالات بہت سازگار معلوم ہوتے تھے۔

جب آپ ایسی مشق شروع کریں جو آپ کو غیر معمولی، شاید منفرد لگے تو آپ خود کو کوئی نئی شے، نئی سوچ، نیا مواد، اشیا کو دیکھنے کا نیا انداز دریافت کرنے پر مبارک باد دے کر آغاز کرتے ہیں۔ اور اس غلط فہمی پر کہ آپ کا تناظر بہت منفرد ہے، آپ یہ زور دینا شروع کر دیتے ہیں کہ اس سے پہلے کسی نے چیزوں کو اس انداز سے نہیں دیکھا۔ لیکن تحقیقات، جیسا کہ مجھے معلوم ہوا، عاجز کر دینے والی شے ہے، آپ کی تشریح کے سوا کوئی شے نہیں ہوتی۔ (اور بعض اوقات تو تشریح بھی نئی نہیں ہوتی) آپ محض ماضی پر ایک مختلف نظر دوڑا رہے ہوتے ہیں۔ تب بہت جلد مجھے معلوم ہوا کہ میں پہلی ہونے کے خیال میں نہ رہوں، بہت، بہت سے دوسرے مجھ سے پہلے آ چکے ہیں۔ چونکہ میں اسے دیکھ رہی تھی جو میرے خیال میں تقسیم کی تاریخ کے اندر کا حصہ تھا۔ میں نے روایتی تاریخ کے ذرائع کے بارے میں مشکوک ہونے سے کام شروع کیا۔ دستاویزات، حکومتی رپورٹیں، تقریریں اس بارے میں مجھے کیا بتا سکتی تھیں جس کو میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ احساسات، جذبات، وہ ناقابل تعین چیزیں جو کسی واقعے کا احساس بنتی ہیں؟ پھر

بھی میں نے اپنے کام کے دوران میں یہ معلوم کیا کہ جن چیزوں کو ہم روایتی ذرائع سمجھتے ہیں وہ بھی کافی فائدہ دے سکتے ہیں کیوں کہ بہت سارا انحصار اس تناظر پر ہے جن کے لیے آپ ان کا استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر عورتوں کی رودادیں سن کر اس تشدد کا علم ہونے کے باعث، جن سے وہ گزریں، میں اس قابل ہوسکتی تھی کہ دستاویزات اور رپورٹوں وغیرہ کے ذرائع سے اس کی مزید جہتوں کا سراغ لگا سکوں۔ بچوں اور شیڈولڈ کاسٹس پر جو بیتی، اس کے بارے میں پُرتجسّس ہونے کی وجہ سے میں تقریروں، اخبارات، رودادوں اور پارلیمانی بحثوں سے ان کے بارے میں، خواہ کم ہی سہی، مواد تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ چنانچہ میں ان ذرائع کی بہت مرہونِ منت ہوں جن کی میں بہت شاکی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں ان بہت سی چیزوں کے بارے میں باخبر نہیں ہوسکتی تھی جن کے بارے میں مَیں نے اس کتاب میں لکھا ہے:

یہ احساس میرے لیے حقوق نسواں کی حامی ہونے کے ناتے بھی بہت اہم تھا اور ایسا شخص ہونے کے ناتے بھی جو تاریخ میں، بالخصوص ان لوگوں کی تاریخ میں جن کو معاشرے نے غیر اہم کر دیا تھا، ایسی تاریخ جو تاریخ نویسی کی وسیع دُنیا میں بذات خود غیر اہم ہوگئی تھی، دلچسپی لیتا ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کو لکھتے ہوئے جس سوال کا مجھے مسلسل سامنا رہا، وہ یہ تھا: انسان کا اپنی تاریخ سے کیا تعلق ہوتا ہے؟ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جہاں تک تقسیم کی تاریخ کا تعلق ہے، جس تاریخ کو ہم جانتے ہیں، جسے ہم نے پرکھا ہے اس میں اور اس تاریخ میں جو لوگوں کو یاد ہے، ایک تضاد ہے۔ بہت سارے مورخ بتا چکے ہیں کہ انسان اور اس کی تاریخ کے باہمی تعلقات کی جڑوں میں نسیان اور حافظہ کس قدر مددگار ہوتا ہے۔ تاریخ نگاری ایک فن کے طور پر نسیان کو ختم کرتی اور حافظے کی افزائش کرتی ہے،[1] لیکن ایسا کرتے ہوئے اس طرح کی تاریخ نگاری ماضی کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں بذاتِ خود مطلب شعار ہوتی ہے۔ جب میں اس کام کے اختتام کو پہنچ رہی تھی تو مجھ پر واضح ہوگیا کہ ماضی کی کسی بھی ایسی کھوج میں اُجاگر کرنے کے لیے جن پہلوؤں کا ہم انتخاب کرتے ہیں، ان کا یقین نہ صرف وہ حال

---

1. : انا ریٹا ٹبافکو ''اَون مدرز'' اینڈ ''سسٹرز'' فریگمنٹس اَون ویمن/ فیمی نزم/ ہسٹرو گرافی، یفرووڈی ڈبلیو ایف (اطالوی)، نمبر 15، 1980۔

کرتا ہے جس میں ہم رہتے ہیں بلکہ وہ مستقبل جس میں ہمیں رہنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس کتاب میں میری دلچسپی اس چیز سے رہی ہے جسے عام لوگوں کی آواز کہا جا سکتا ہے جو معاشرے کے حاشیوں پر رہتے ہیں۔ میں نے ماضی پر ایک خاص قسم کی نظر دوڑانے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا کیوں کہ عمومی تاریخ کا رُجحان ''ایسے گروہوں'' کے تجربات کو نظرانداز کرنے کا رہا ہے (اگر ان کے لیے گروہ کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے تو) اور مستقبل کے بارے میں میرا نظریہ وہ ہوتا جس میں ایسے تمام گروہوں خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے ہوں، کی آواز اور کردار شامل ہو۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ تقسیم کے تاریخ نویسوں نے چونکہ ماضی پر اپنا زاویہ نظر مخصوص انداز سے ڈالا ہے اس لیے ماضی کے صرف بعض پہلو ہی نظر آ سکے ہیں اور نئے اور مختلف حقائق تبھی نمودار ہوں گے جب ہم معلوم تاریخ کی کھوج کے لیے مختلف ذرائع کو استعمال کر کے ماضی کا از سرنو مطالعہ کرنا شروع کریں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میں ایسے معاشرے کی خواہش مند ہوں جس میں عورتوں، بچوں اور نجلی ذاتوں کا ایک مربوط کردار ہو اور ماضی میں ان کی تواریخ جاننے کی خواہش مند ہوں اور اس چیز کی بازیابی کی کوشش کر رہی ہوں جس کو میں نے ان کی آواز سے تعبیر کیا ہے۔

ایسا کرتے ہوئے میں نے تاریخ نویسی کے نسواں پسند ذرائع کو مفید پایا کیوں کہ ان سے آپ سب سے زیادہ اَن سنی بات، یعنی خاموشی کو سننے، اسے سمجھنے اور اس کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اکثر اوقات پوشیدہ آوازوں کو بازیاب کرنے کی کوشش کرنے والی تواریخ تقریر اور خاموشی میں سادہ مخالفت پیدا کر دیتی ہیں—— بعض حوالوں سے میں نے اس کتاب میں یہی دکھانے کی کوشش کی ہے—— اگر کوئی شے خاموشی میں لپٹی ہوئی ہے تو تقریر لازماً اچھی اور آزاد کرانے والی ہونی چاہیے۔ اس بات میں شبہہ نہیں کہ تقسیم کی تاریخ میں، عورتوں، بچوں، شیڈولڈ کاسٹس اور بہت سے دوسروں کی کہانیوں کو مملکت اور تاریخ نویسی، دونوں کی سطح پر خاموش رکھا گیا ہے۔ پھر بھی ایسا کوئی سادہ راستہ نہیں ہے جس پر چل کر اس خاموشی کو غیر ذمہ داری سے اور کوئی مسئلہ پیدا کیے بغیر توڑا جا سکے۔ میں نے اس ساری کتاب میں اس مسلسل مخمصے کا ذکر کیا ہے جو دورانِ تحریر مجھے درپیش رہا۔ جو کچھ لوگوں نے بتایا یا جو

کچھ انھوں نے نہیں بتایا، اس کا کتنا حصہ میں چھاپ سکتی تھی؟ میں لوگوں کو بولنے پر آمادہ کرنے کے لیے کس حد تک جا سکتی تھی؟ اغوا اور عصمت دری کا شکار ہونے والی عورتوں کے لیے بولنے کا اب کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔ میرے لیے یہ سوالات صرف نسواں پسند تاریخ نویسی کی مشق کرنے کے باعث ممکن ہو سکے۔ اپنے کام کے دوران میں مَیں نے عورتوں کی آوازوں پر جتنی زیادہ توجہ دی اور انھیں خود مشورے میں شامل کرنے پر زور دیتے پایا، اتنا ہی مجھے احساس ہوا کہ خاموشی صرف عورتوں کے گرد ہی نہیں، دوسروں کے گرد بھی تھی۔ وہ لوگ جن کی خاموشی بھی معاشرے کے نزدیک زیادہ غیر اہم تھی۔ چنانچہ عورتوں کی تاریخ کی تلاش بھی مجھے دوسروں کی تاریخ کی تلاش کی طرف لے گئی ـــــ عورتوں، بچوں، اچھوتوں کی آوازوں نے مجھے نہ صرف تقسیم کی تاریخ کا مختلف تناظر فراہم کیا بلکہ اس نے اس تاریخ کو ایک عمل کے طور پر، ایک مسلسل تاریخ کے طور پر مستحکم بھی کیا جو آج ہماری زندگیوں میں گوناگوں طریقوں سے موجود ہے۔ اس سارے کام کے دوران میں مَیں نے لوگوں کی داستانوں اور شہادتوں کے ساتھ ساتھ خطوط اور دستاویزات میں بھی ''آوازوں'' پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم آواز کی بازیابی کوئی مسئلہ پیدا کیے بغیر نہیں ہوتی۔ میں جانتی ہوں کہ یہ مختلف قسم کی آوازیں ہیں۔ اُن میں سے کچھ جو زیادہ فوری نوعیت کی ہیں اور جو موجودہ جگہ اور وقت کے مسائل کی عکاسی کرتی ہیں اور دوسری وہ ہیں جو زیادہ عکاس، بعض کیسوں میں زیادہ مشاق ہیں کیوں کہ وہ کئی برسوں کے وقفے اور شاید بہت سی کہانیاں سامنے آنے کے بعد آئی ہیں۔ تاہم جب ان آوازوں کی تاریخ لکھی جائے گی تو ہمیشہ دوسروں کے ذریعے لکھی جائے گی: لوگ اپنی خودشناختی کی تعریف کس طرح متعین کرتے ہیں اور ان شناختوں کی نمائندگی کیسے کی جاتی ہے، یہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ تقسیم کے موقع پر عورتوں، بچوں، شیڈولڈ کاسٹس کے تجربات کی جو نمائندگی میں نے کی ہے، وہ میری نمائندگی ہے جو میری دلچسپی کے امور اور ترجیحات کے مطابق اُجاگر کی گئی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک اور قسم کی آواز بنتی ہے: ایسی آواز جو دوسری آوازوں کو پڑھتی اور ان کی تشریح کرتی ہے۔ اگر یہ میری نمائندگی ہے تو زبانی کہانیوں کا متن، مجھے اُمید ہے کہ اس انداز کی نمائندگی کرتا ہے جس میں متعلقہ لوگوں

نے ازخود واقعات کو یاد کیا اور ان کی تشکیل نو کی۔ میں نے انھیں اس سے زیادہ بتانے کی کوشش نہیں کی جتنے وہ ہیں۔ یاد کرنے کا ایک ہی طریقہ، ایک وقت میں، ایک ہی آدمی کے ساتھ۔ میں ان آوازوں کو وقت کی روایتی اور واقعاتی تواریخ کے خلاف رکھنے کی کوشش نہیں کر رہی۔ اس کے بجائے میں انھیں موجودہ تاریخ کے ساتھ ساتھ رکھنا پسند کروں گی۔ یہ حقیقی لوگوں کی داستانیں ہیں، تقسیم کی تاریخ کی یادداشتیں ہیں، اور صرف اسی وجہ سے وہ اہم ہیں۔ ان ہی کے ذریعے تقسیم کی تاریخ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور قسم کی آواز بھی ہے جس کا میرے کام نے کھوج لگایا: یہ ریاست کی آواز ہے، سرکاری بحثوں کی آواز، اور بعض اوقات ایک مخالفانہ (مثلاً آر ایس ایس کی) لیکن اس کے باوجود خاصی طاقت وَر آواز۔ یہ سب مختلف آوازیں مل کر وہ چیز بنتی ہیں جسے تخلیق کرنے کی میں نے کوشش کی ہے۔

اگر آواز کی بازیابی بغیر مسئلہ کے نہ ہو تو یہ بات اس حقیقت سے مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے کہ آوازیں بذاتِ خود متمیّز ہوتی ہیں۔ ان کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ طویل عرصہ تک لوگوں سے انٹرویو کرنے کے عمل میں بار بار مجھے احساس ہوا کہ عورتوں کی آوازوں کی بازیابی کتنا مشکل کام ہے۔ مشترکہ انٹرویوز کے دوران میں—— اور اس وجہ سے بھی کہ تقسیم خاندانی تواریخ کا ایک بڑا جزو ہے اور اس لیے بھی کہ خاندان اکثر اوقات نہیں چاہتے کہ ان کے ارکان تقسیم کے بارے میں بڑوں، بالعموم، مردوں کی غیر موجودگی میں بات کریں—— ہمیشہ مردوں نے ہی بات کی۔ اگر خواتین سے براہِ راست سوال کیا جاتا تو وہ اسے مردوں کی طرف منتقل کر دیتیں۔ جداگانہ انٹرویوز میں، جب بھی وہ ممکن ہوئے، عورتیں اکثر اوقات اس بات سے شروع کرتیں کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے، کوئی بھی اہم بات نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ بولنا شروع کر دیتیں لیکن اکثر اوقات صرف وہی باتیں کرتیں جو اُن کے خیال کے مطابق آپ اُن سے سننا چاہتے تھے۔ مردوں اور عورتوں سے کئی سال کی بات چیت کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ وہی چیز ہے، زبانی مورخین نے اکثر جس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اپنے اداراتی مضمون میں کیتھرین اینڈرسن اور ڈانا سی جیک نے لکھا ہے کہ کوئی عورت اپنی زندگی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اکثر اوقات دو الگ، بعض اوقات متضاد

تناظر پیش کر جاتی ہے۔ ایک وہ جو ان تصورات اور اقدار کے تحت قائم کیا ہوتا ہے جو معاشرے میں مرد کی بالادستی کی عکاسی کرتے ہیں اور دوسرا وہ جو عورتوں کے ذاتی تجربے کے زیادہ فوری حقائق پر مبنی ہوتا ہے۔ جہاں تجربہ بالادست معنوں میں موزوں نہ ہو سکے، متبادل تصورات وہاں آسانی سے نہیں مل سکتے۔ چنانچہ جب خواتین اپنی زندگیوں کو رائج تصورات اور روایات کی مانوس اور عوامی طور پر قابل قبول اصطلاحات میں بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو اکثر اوقات نادانستہ طور پر وہ اپنے خیالات اور جذبات کو دبا لیتی ہیں۔ خواتین کا درست تناظر جاننے کے لیے ہمیں ''سٹیریو'' سماعت اختیار کرنا ہوگی یعنی غالب اور خاموش، دونوں چینل واضح طور پر سننے ہوں گے اور ان کو اس انداز سے ٹیون کرنا ہوگا کہ دونوں کے درمیانی تعلقات پوری طرح سمجھ میں آ سکیں۔[1]

خواتین میں بھی دو مختلف قسم کی آوازیں تھیں۔ میرے لیے متوسط طبقے کی خواتین کو تلاش کر کے ان سے بات کرنا نسبتاً آسان تھا، لیکن دلت عورتوں کو تلاش کرنا زیادہ مشکل تھا۔۔۔ پوری کوشش کے بعد میں صرف ایک عورت کو تلاش کر سکی اور ایسا کوئی طریقہ تقریباً تھا ہی نہیں کہ جس کے تحت میں ایسی عورت سے بات کر سکتی جسے اغوا کیا گیا ہو اور/ یا عصمت دری کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ نہ صرف یہ کہ وہ موثر طور پر غائب تھیں بلکہ ان میں سے کئی بدستور غائب رہنا چاہتی تھی۔ ان کی کہانیاں صرف ان ہی کے پاس تھیں۔ گویا عصمت دری، اغوا کے تجربے کی یاد ان کے لیے باعث شرم تھی، اس لیے اسے طاق نسیاں پر ہی رکھنا چاہیے تھا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے، میں خود کو حقوق نسواں کی حامی کہتی رہی ہوں۔ نسواں حمایت کا سیاسی عمل اور اس کے گہرے، ذاتی معنی، میرے وجود کا حصہ رہے ہیں۔ اس وقت میں اس کی اور بھی شکرگزار تھی جب میں اس کتاب پر کام کر رہی تھی کیوں کہ میرے خیال میں اسی نے مجھے تاریخ اور عورتوں کے تجربات میں فرق کے بارے میں

1 : کیتھرین اینڈرسن اور ڈانا سی جیک، ''لرننگ ٹو لسن''، ''انٹرویو ٹیکنیکس اینڈ انالسز''، شِما برجر گلک اینڈ ڈافنے پٹائی، ''ویمینز ورلڈ''، دی فیمنسٹ پریکٹس آف اورل ہسٹری''، نیویارک، روٹ لیج، 1991 (صفحہ 11)

خبردار کیا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ نسواں حمایت کا تجربہ عورتوں کی مخفی تواریخ کو سمجھنے کے لیے لازمی ہی ہے، لیکن یہ کہ میرے لیے یہ ضروری بھی تھا اور مفید بھی۔ نسواں حمایت کی تاریخ نویسی کے عمل نے بھی کئی دروازے کھولے۔ ایک متناقص انداز میں اگر عمومی تاریخ نویسی (جو زیادہ تر مردانہ تھی) نہ رہی ہوتی اور اس میں جنسی تناظر اس نمایاں حد تک غائب نہ ہوتا تو شاید حقوق نسواں کے حامی تاریخ نویس یہ نہ جان پاتے کہ وہ کس چیز کی جستجو کریں۔ تاریخ کے نسواں حمایت کام کے ساتھ بہت سی باتیں منسلک ہیں: کئی حوالوں سے اسے کم سنجیدہ، شاید کم اہم اور یقیناً ایسی چیز سمجھا جاتا ہے جو مجموعی طور پر صرف عورتوں ہی کی دلچسپی کی ہے ـــــ اور یہ بات ایک بار پھر ـــــ عمومی تاریخ کی دُنیا میں اس کی غیر سنجیدگی کو واضح کرتی ہے۔ پھر بھی ہم میں سے وہ لوگ جو تاریخ نویسی کے عمل کو وہ اہمیت دیتے ہیں جس کا وہ مستحق ہے، حقوق نسواں کی تاریخ ان کے لیے بہت زیادہ مفید مطلب ہے ـــــ ان سے بحث کے نئے میدان کھلتے ہیں جو بہ صورتِ دیگر ضروری نہیں کہ نظر آئیں۔ مثال کے طور پر میں بچوں کی تواریخ دیکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی اگر نسواں حمایت نے یہ دُنیا میرے لیے نہ کھولی ہوتی، نہ ہی میں شیڈ ولڈ کاسٹس اور عورتوں کی تواریخ کا تقابلی جائزہ لے سکتی اگر میں جنس کو تجزیے کی درجہ بندی میں شامل نہ کرتی۔ اگرچہ میری کتاب ''صرف عورتوں کے لیے'' نہیں ہے، میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ عورتیں، ان کی تواریخ اور جہاں یہ تواریخ ہمیں لے جا سکتی ہیں، یہ سب اس کے قلب میں ہیں۔

☆☆☆

خاموشی اور گفتگو، حافظہ اور نسیان، درد اور شفا، یہ سب میری کتاب کے دل میں ہیں۔ کئی برسوں کے کام کے اختتام پر میں کئی کہانیاں سن چکی تھی۔ ہر کہانی منفرد تھی۔ ہر کہانی میں مجھے ایک مختلف ''تقسیم'' ملی۔ ہر کہانی میں ایک مختلف تجربہ تھا۔ ہر روداد نے نئے سوالات اُٹھائے۔ شاید جس سوال سے میرا سب سے زیادہ سامنا رہا، وہ اس کام کی نوعیت کے بارے میں ہی تھا۔ ایسا سوال جس کا تعلق یاد کرنے کے عمل سے تھا۔ اس سب کو آخر کیوں نئے سرے سے کریدا جائے؟ اگر لوگ اپنے تجربات کے ساتھ زندہ تھے اور کسی نہ کسی طریقے سے پُرسکون ہو گئے تھے تو انھیں ان کی یاد دِلانے

سے کیا فائدہ جن کو وہ فراموش رکھنا ہی پسند کرتے ہیں؟ اس سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں۔ مخمصہ بدستور باقی رہتا ہے، خاموشی بہتر ہے یا بولنا؟ یا تحقیقات کرنے والوں کے لیے انھیں خاموش رہنے دینا صحیح ہے یا بولنے پر مجبور کرنا؟

بہت سی دوسری چیزوں کی طرح اپنے ماموں رانا ماما سے میری ملاقات نے میری توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ جب میں نے پہلی بار ان سے بات چیت شروع کی تو جوش وخروش کا زبردست احساس تھا۔ میں خوش تھی کہ وہ اپنی کہانی سنانے کے خواہش مند تھے۔ انہیں اپنی خاموشیوں کے ساتھ زندہ رہتے بہت عرصہ گزر گیا تھا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ اگر میں ان کی کہانی مزید آگے پہنچا دوں تو وہ کیا محسوس کریں گے؟ انہوں نے جواب دیا جو چاہے لکھو، میری زندگی اس سے بدتر نہیں ہوسکتی۔ اس پر مجھے یہ زیادہ سنجیدہ احساس ہوا کہ نہ صرف ''سچ'' نامی زمرے کے حوالے سے، بلکہ رانا کی زندگی کے حقائق کے بارے میں بھی مجھ پر ایک اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے—— کیا میں اتنی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرسکتی ہوں کہ وہ جو بھی کہیں، اسے منظرِ عام پر لے آؤں۔ ہرگز نہیں—— ان کی زندگی پر اِس کے نتائج ناقابل تصور ہوں گے۔ تو کیا صرف جزوی تصویر پیش کرنا غلط نہیں ہوتا؟ یعنی کچھ سچائی روک لینا اور کچھ پیش کر دینا؟ اس مخمصے نے مجھے پریشان کر دیا اور یہ سارا عرصہ باقی رہا۔ جب راولپنڈی کے سکھ خاندانوں نے ان حملوں اور تشدد کی تفصیل بتائی جو انھوں نے دیکھا تھا تو میں صحیح اقدام کے بارے میں سوچتی رہ گئی۔ جب تک مجھے کہانی کا دوسرا رُخ معلوم نہ ہو، کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ میں صرف وہ مواد پیش کر رہی ہوں جس کا ہندو دایاں بازو خطرناک استعمال کرسکتا ہے؟ جب عورتوں کے اغوا اور ان کی جبری عصمت دری کا سوال آیا تو میں نے خود سے پوچھا کہ کیا ان کی خاموشی کو کھولنا درست ہے؟ کیا تاریخی سچائی کے لیے میری جستجو کا مطلب ایک اور فساد پیدا کرنا تو نہیں ہے؟

میں بہت برسوں بعد بھی اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں پا سکی۔ ہمارے لیے تقسیم کی یادوں کی جستجو کرنا کتنا اہم ہے؟ ایک مصنف اور تقسیم کے مہاجر کرشنا سوبتی نے ایک بار کہا تھا کہ تقسیم کو بھولنا مشکل ہے لیکن اسے یاد کرنا خطرناک ہے لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے یاد کرنا ہی نہیں چاہیے؟ ان برسوں میں بہت سی بے

یقینیوں کے باوجود میں اس بات کی بہت زیادہ قائل ہوگئی کہ اگرچہ یاد کرنا خطرناک ہے لیکن ایسا کرنا لازمی بھی ہے—— نہ صرف اس لیے کہ اس سے سمجھوتا کرلیں بلکہ اس لیے بھی کہ یادداشت اور یادوں کا دریچہ کھولنا حل کرنے کے عمل کی شروعات ہے یا شاید بھولنے کے عمل کی بھی۔ اس کتاب میں اس سے پہلے میں نے ایک ستر سالہ پروفیسر، جو آر ایس ایس کا ممبر بھی رہ چکا تھا، سے بات چیت کا ذکر کیا ہے، جو یہ بات کرتے ہوئے رو پڑا کہ کس طرح ایک مسلمان عورت کو قریبی مارکیٹ میں بے آبرو کرنے کے بعد قتل کر دیا گیا لیکن وہ اپنا خوف اور غم ظاہر کرنے کے قابل نہیں تھا۔ پچاس برس بعد جا کر وہ کہیں اس قابل ہوا کہ اس واقعے کو یاد کرے اور اس کا سوگ منائے اور شاید بھولنا شروع کر دے۔ ایسا کرنے سے قبل اسے اپنی یادداشت کو تسلیم کرنا پڑا۔ میرے خیال میں کسی کو یہ فیصلہ کرنے کی مشق کرنی چاہیے، جیسا کہ لوگ ناگزیر طور پر کرتے ہیں، کہ وہ کوئی خاص تاریخ کس حد تک کھوجنے کا خواہش مند ہے۔ مجھے سختی سے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ ہمارے لیے تقسیم کا سامنا کرنا، اس کے بہت سارے معانی پر غور کرنا، لازمی ہے اگر ہم برصغیر میں اپنی زندگیوں پر اس کے مرتب کردہ اثرات کے ساتھ سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کو دیکھنے سے انکار، یہ سمجھنا کہ وہ ہے ہی نہیں، بے فائدہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس قسم کی کھوج کے بارے میں ہمیں احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جہاں خاموشی بولنے سے زیادہ اہم تھی، ایسے مواقع جب بولنے پر مجبور کرنا جارحیت ہوتی اور سمجھتی ہوں کہ ہمیں اس قابل ہونا چاہیے کہ جب ہم ان کا سامنا کریں تو انھیں پہچان لیں۔

انٹرویو کرنے کے دوران میں مَیں ان لوگوں سے مانوس ہوگئی تھی جو بولنے سے ہچکچاتے تھے۔ وہ پوچھتے تھے ان کہانیوں کو اکٹھا کرنے کا مقصد؟ کیا اس سے کسی کو فائدہ ہوگا؟ بعض اوقات ان کی ہچکچاہٹ، ان کے نزدیک اس کام کی بے سمتی کا نتیجہ ہوتی تھی۔ دوسروں کے لیے اس کی وجہ خوف اور اس بات کا خطرہ ہوتی تھی کہ اس وقت کے تشدد کے واقعات ان کے خلاف جا سکتے ہیں۔ بتدریج مجھے یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ تقسیم کی خاموشیاں کئی قسم کی ہیں۔ اگر ایک سطح پر ہمیں تاریخی خاموشی کا سامنا ہے تو دوسری جگہ پر خاندان سے متعلق خاموشیوں کا مجموعہ ہے جس میں خاندان نے اپنی

تواریخ چھپانے کے لیے گٹھ جوڑ کر رکھا ہوتا ہے۔ بعض اوقات فعال طور پر جیسے کہ ان دو بھائیوں نے کہا جن سے میں جنگ پورہ میں ملی۔ اس ملاقات کا انتظام آشرم کی انتظامیہ نے کیا تھا۔ یا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تواریخ کا علم خاندان کے بڑوں کو ہوتا ہے، چھوٹوں کو نہیں۔ ان کے بارے میں بات کرنے اور انھیں منظر عام پر لانے کا مطلب محض پُرانے زخموں کو پھر سے ہرا کرنا نہیں بلکہ نتائج کے ساتھ زندہ رہنے کی تیاری کرنا بھی ہے—— شاید ایک اور استرداد، ایک اور دہشت۔ بہت سی عورتوں کے لیے تقسیم ان کی زندگی کے تانے بانے کو بُری طرح اُدھیڑنے کے مترادف تھی۔ خاندان بہرحال عورت کی زندگی کے لیے مرکز ہوتا ہے، چنانچہ اس کے نقصان کا احساس بُری طرح ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اپنے گھروں سے جبری عصمت دری اور اغوا کے ذریعے دور کر دیے گئے، یہ نقصان اور بھی شدید تھا۔ کیا وہ کبھی اس قابل ہو سکیں گے کہ اپنے احساسات کو زبان دینے کے لیے الفاظ ڈھونڈ لیں؟

اور بہرحال یہ الفاظ ہی تو ہیں جو ہمارے پاس ہیں۔ ایک چیز جس کا مجھے انٹرویوز اور تحقیق کے دوران میں پتہ چلا یہ تھی کہ تقسیم کے دوران میں جو گزری، لوگ اسے بیان کرنے کی جدوجہد کرتے تھے اور آخر میں یہ کہتے تھے کہ جو کچھ انھوں نے دیکھا وہ ناقابل بیان ہے۔ ستم ظریفی یا المیہ یہ ہے کہ بعد میں پیش آنے والے تنازعات اور کشیدگی کے دوران تقسیم ہی نے حوالے کا نقطہ فراہم کیا۔ کسی فرقہ وارانہ صورت حال پر یہ تبصرہ کرنا کہ تقسیم جیسے حالات پھر پیدا ہو گئے ہیں، اسے سنجیدگی سے منسوب کرنا ہے۔ دہشت اور تشدد کی جو گہرائی ہو سکتی ہے، اب اسے فوراً ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر بھی ان لوگوں کے لیے جو تشدد اور بے گھری کے عمل سے گزرے، ان کو دستیاب زبان اس ماجرے کو بیان کرنے کے لیے بالخصوص ناکافی ہے جس سے وہ گزرے۔ تقسیم: یہ لفظ بذات خود خاصا ناکافی ہے۔ تقسیم ایک سادہ علیحدگی، جدائی کا نام ہے، لیکن یقیناً 1947ء میں جو کچھ ہوا وہ اس سے بہت زیادہ تھا۔ تقسیم کے لیے ایک اور نام ''بٹوارہ'' ہے لیکن یہ بھی اسی طرح ناکافی ہے۔ یہ الفاظ کیسے اس واقعے کے بے انداز معنوں میں لیے جا سکتے ہیں؟ لوگ راتوں رات جدا ہو گئے، دوست دُشمن بن گئے، گھر اجنبی ہو گئے اور اجنبی مقامات گھر کہلائے جانے لگے۔ سرحد کی نشان دہی

کرنے والی ایک لکیر کھنچ گئی اور سرحدوں نے لوگوں کی زندگیوں اور ذہنوں میں اپنا عکس جمانا شروع کر دیا۔ شناختوں کی تعریف اچانک ازسرنو کرنا پڑی۔ اگر آپ پہلے پنجابی تھے، جس کا دوسرے پنجابیوں سے ثقافتی اشتراک تھا تو اب آپ کو شناخت کے یہ سارے نشان مسترد کرنے ہوں گے ــــ ثقافتی، لسانی، جغرافیائی، اقتصادی ــــ اور صرف ایک سند ماننا ہوگی، اپنے مذہب کی۔ آپ کو اپنا دماغ تقسیم کرنا ہوگا اور وہ تمام حصے بند کرنا ہوں گے جو آپ کے اردگرد کی سیاسی تقسیم سے توافق نہیں رکھتے۔ دوسری چیزیں جو تجربات کو ناقابل بیان بناتی ہیں: بہت سے لوگوں کے لیے تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے یقینیوں میں، تشدد چند یقینی باتوں میں سے ایک ہو گیا۔ عام پُرامن لوگ اپنے اندر تشدد سے نبرد آزما ہونے پر مجبور کر دیے گئے۔ مظلوم جارح بن گئے، جارح مظلوم بن گئے اور لوگوں نے اپنے ذہنوں کا بٹوارہ شروع کر دیا۔ کسی شخص کو قتل کرنا عین جائز ہے اگر قتل ہونے والا ''دوسرا'' ہے۔ لیکن خود اپنے اندر کے جارح کو بے نشان بنانے کے لیے آپ کو خود کو مظلوم دکھانا ہوگا اور اس طرح آپ کو اکثر ایک جھوٹ نبھانا پڑا اور ظاہر کرنا پڑا کہ آپ نے قتل نہیں کیا۔ آخر ایک سادہ لفظ، جو جغرافی، سیاسی تقسیم کے معنی سے منسوب ہے کس طرح ان تجربات کے ہم معنی ہو سکتا ہے جن سے لوگ گزرے؟ آپ ان الفاظ کو کہاں ڈھونڈتے جو یہ تلاش کریں کہ تشدد صرف باہر ہی نہیں ہوا، بلکہ آپ کے اندر بھی ہوا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ بعض اطوار سے بہت سے لوگ جو خود کو مظلوم سمجھتے ہیں تقسیم کے تشدد میں ملوث تھے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اسے یاد کرنے میں اتنی ہچکچاہٹ ہے۔

بھارت میں تقسیم کی کوئی ادارہ جاتی یادداشت نہیں ہے۔ مملکت ایسی کوئی یادگار ختم کرنا مناسب نہیں سمجھتی جو کسی مخصوص مقام کی نشان دہی کرے جس طرح کہ ہولوکاسٹ یا ویت نام کی جنگ کی یادگاروں کا معاملہ ہے۔ سرحد پر ایسی کوئی نشانی نہیں ہے جو بتا سکے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے دسیوں لاکھ لوگوں نے سرحد عبور کی۔ کیمپوں کے مقامات پر بھی کوئی یادگاری تختی ہے نہ کوئی عمارت۔ کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو کسی خاص مقام کی نشان دہی کر سکے، جہاں تقسیم کی یادیں اکٹھی کی جا سکیں۔ تقسیم آزادی کا تاریک رُخ تھا۔ تو اس طرح سوال یہ ہے کہ ریاست اپنی ساز باز کو تسلیم کیے بغیر اس کو

کس طرح یادگار بنا سکتی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ تقسیم کے نتیجے میں لاکھوں افراد ہلاک ہو گئے۔ نصف صدی بعد آپ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ انھیں نئی قوم بنانے کے کاز کا شہید قرار دے سکیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ناقابل فرار دوسری حقیقت بھی ہے کہ دسیوں لاکھ افراد قتل کیے گئے اور بہت سے ایسے گھر تھے جن کے لوگ مارے گئے تو جن میں قاتل بھی تھے۔ آپ ایسی تاریخ کو کس طرح یادگاری حیثیت دیں گے؟ آپ کس کی یاد تازہ کریں گے؟ لوگوں کے لیے، مملکت کے لیے، یاد کرنے میں کیا شے زیرغور ہے؟ یاد کرنے کے لیے آپ کو کس سے سچائی برتنا ہوگی؟ صرف یہی نہیں کہ لوگوں نے دوسرے مذہب کے لوگوں کو قتل کیا بلکہ سینکڑوں مثالیں ایسی ہیں کہ انھوں نے اپنے اہل خانہ کو بھی مار ڈالا۔ صرف یہی نہیں کہ ایک مذہب کے مردوں نے دوسرے مذہب کی عورتوں کی آبرو لوٹی، بلکہ سینکڑوں ایسی مثالیں ہیں کہ ایک مذہب کے مردوں نے اسی مذہب کی عورت کو بے آبرو کیا۔ آپ ایسی تاریخ کی یاد منانے کے لیے کیا کر سکتے ہیں جو شرم کی تاریخ کے سوا کچھ نہیں؟ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ بھارتی سیاست دانوں اور کانگریس پارٹی کے ارکان نے خود کو اس کھیل کے متامل کھلاڑی کے طور پر دیکھنے کی کتنی زیادہ کوشش کی ہے۔ وہ اس حقیقت سے نہیں بچ سکتے کہ انھوں نے تقسیم کو آزادی کی قیمت سمجھ کر قبول کیا۔ ایسی تواریخ کو آسانی سے یادگار نہیں بنایا جا سکتا۔

آج کی دُنیا کے بہت سے ممالک میں تنازعہ یا شورش کے لمحوں کی یادگاری عمارتیں ہیں۔ ریاستی مدد کے ساتھ یا اس کے بغیر سکالروں نے کڑی محنت کر کے عوامی گواہیوں، تصاویر، خطوط، دستاویزات، یادداشتوں اور کتابوں کے ایسی تفصیلی ذخیرے تیار کیے ہیں جو ان تاریخی لمحوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تقسیم کے لیے ایسا کچھ نہیں ہے۔ لوگوں کی رودادیں اکٹھا کرنے کے لیے بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ تقسیم کی تصویری نمائندگی بھی—— تصاویر کے اس بھرپور ذخیرے کے باوجود جو بہت سے اخبارات اور رسائل میں موجود ہے—— بہت محدود ہے، اور اگرچہ بھارتی آزادی کی نصف صدی ہر قسم کے جشنیہ واقعات سے بھرپور ہے، بھارت میں تاریخ کے اس اہم واقعے کو یاد کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔

لیکن اگر تقسیم کی کوئی سرکاری یاد نہیں ہے، گھروں اور خاندانوں کے اندر خاص

واقعات کی یاد منانے سے متعلق رسومات اور کہانیوں کی وساطت سے یہ یاد زندہ رکھی جاتی ہے۔ جب منگل سنگھ اور اس کے دو بھائی اپنے سترہ اہل خانہ کی موت کے بوجھ کے ساتھ گاؤں سے آئے تو انھوں نے ایک یادگاری لوح بنائی جس میں ان سب سترہ افراد کے نام لکھے ہوئے تھے اور اسے انھوں نے امرت سر کے گولڈن ٹیمپل میں لگا دیا۔ ان کی شہادت کی یاد منانے کے لیے ان کی موت کی برسی پر گرنتھ صاحب کا 48 گھنٹے تک پاٹھ کیا گیا۔ جب تک زندہ رہے، منگل سنگھ کے بھائی اس کے ساتھ ہر سال اس رسم میں شریک ہوتے رہے۔ ان کی موت کے بعد وہ عام طور پر اکیلا اور کبھی ترلوک سنگھ کے ساتھ وہاں جاتا رہا، جو خاندان کی اموات سے بچ نکلنے والا اکیلا شخص تھا۔ جب کئی سال بعد میں نے منگل سنگھ سے پوچھا کہ وہ ان یادوں کے ساتھ کیسے زندہ ہے تو اس نے پنجاب کے زرخیز کھیتوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ جب ہم سب تقسیم کے مہاجر، وہاں سے آئے تھے تو ہم نے اپنی تمام بھولی باتیں اس زمین میں ڈال دیں تاکہ یہ خوش حال بن سکے۔

راولپنڈی کے قتل عام سے بچ نکلنے والوں کی ایک چھوٹی سی برادری نئی دہلی میں جنگ پورہ میں رہتی ہے۔ ہر سال 13 مارچ کو وہ مارچ 1947ء کے مظلوموں کی یاد میں ایک رسم مناتے ہیں۔ شہیدی دیوس، یا یوم شہدا، ان بہت سے افراد، جن میں اکثریت عورتوں کی تھی، کی شہادت کی یاد میں منایا جاتا ہے جنھوں نے اپنی ''سکھی'' کو داغ دار ہونے سے بچانے کے لیے رضا کارانہ طور پر جانیں قربان کر دیں۔ ہر سال مارچ 1947ء کے یہ بچ نکلنے والے، جن کی تعداد ہر سال کم ہوتی جاتی ہے، اکٹھے ہو کر ان افراد کی بہادری کی کہانیاں دُہراتے ہیں جو اس قتل عام میں مارے گئے۔ رسم مرنے والوں کے لیے دعاؤں سے شروع ہوتی ہے۔ انھیں خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ پھر ان کی کہانیاں دُہرائی جاتی ہیں۔ مرنے والے ہر شخص کی ایک طاقت وَر اور جذباتی کہانی۔ جب آپ یہ کہانیاں سنتے ہیں تو ماتا لاجونتی کی تصویر آپ کی آنکھوں کے سامنے ابھرتی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے بہادرانہ انداز میں قیادت کرتے ہوئے 19 عورتوں کے ہمراہ پانی سے بھرے ہوئے کنوئیں میں کود کر جان دے دی تھی اور کودنے والی وہ سب سے پہلی تھی۔ آپ اس عورت کو دیکھتے ہیں، ان کی

''جو بولے سونہال'' کی وہ چیخیں سنتے ہیں جو انھوں نے خود کو کنوئیں کے حوالے کرتے ہوئے بلند کی تھیں، اور جب کہانی ختم ہوتی ہے، نزدیک بیٹھے ہوئے گلوکاروں کا ایک گروہ بھجن کی صدا بلند کرتا ہے۔ ہر سال، سال بہ سال، وہی الفاظ:

سورما تو پہچانیے
جو لڑے دین کے ہت
پُرزہ پُرزہ کٹ مرے
کبھی نہ چھوڑے کھِت

اسے بہادر جانو جو دُشمن سے جنگ کرتا ہے، اپنے جسم کے سینکڑوں ٹکڑے کرا لیتا ہے لیکن اپنا عقیدہ نہیں چھوڑتا۔

تقریب جاری رہتی ہے اور موت کی دوسری کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ تشدد سے کٹی پھٹی موت، جس کو شہادت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گزشتہ برسوں میں راولپنڈی کے ان بچ نکلنے والوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ کہانی سنانے والوں اور سننے والوں میں فاصلہ بڑھتا گیا۔ کم عمر لوگ اور چھوٹے بچے اب سامعین میں بیٹھ کر مہارت اور جذبے سے سنائی جانے والی کہانیاں مسحور ہو کر سنتے ہیں۔ عورتوں کی شہادت مردوں کی ساز باز پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس رسم میں شرکت اور بچ نکلنے والوں کی کہانیوں کے ذریعے سے ہی مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے دیہات میں حملہ آوروں کے ساتھ طویل مذاکرات ہوتے رہے۔ رقم دوسرے ہاتھوں میں منتقل ہوئی، ہتھیار حوالے کر دیے گئے اور اس سارے عمل میں عورتیں، کبھی اکیلی، کبھی مردوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنی موت، اپنی شہادت کے منصوبے بناتی رہیں۔

بچ نکلنے والوں کی برادری کے لیے یہ یادگاری رسم بہت ساری سطحوں پر کام کرتی ہے۔ یہ یاد کو تازہ رکھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے بھلانے میں بھی مدد دیتی ہے۔ وہ خاص خاص چیزیں یاد رکھتے ہیں تاکہ بھول جائیں۔ کیوں کہ جو کچھ یاد رکھا جاتا ہے، وہ وہی ہوتا ہے جسے عورتوں کی بہادری کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ ان بہت سی عورتوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا جنھوں نے انکار کیا ہوگا۔ جو اپنی جان دینا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کا بھی کوئی ذکر نہیں ہوتا جو اغوا کر لی گئیں۔ تھمالی سے لاپتہ ہونے

والی ان دو بہنوں کا یہاں کوئی ذکر نہیں جن کے بارے میں غالب امکان یہی تھا کہ انھیں اغوا کر لیا گیا تھا۔ ان بہت سی عورتوں کا بھی کوئی ذکر نہیں جن کا اندراج ان دیہات کے گم شدہ افراد کی فہرست میں تھا۔ ہر گزرنے والے سال کے ساتھ سینکڑوں اموات پر، بھاری جانی نقصان پر، مزید حوصلہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ یاد بہ یک وقت محفوظ بھی رکھی جاتی ہے اور محدود بھی۔ راولپنڈی کے قتل عام سے بچ نکلنے والوں کی برادری اس رسم کے ذریعے مارچ 1947ء کی تاریخ کا اپنا متن پیش کرتی ہے۔ دوسروں کی طرح انھوں نے بھی عصمت دری اور اغوا کی تاریخ کو اپنی بہادری اور سورمائی کی تاریخ میں بدل ڈالا ہے۔

جب ہم یادوں کی مشکل اور مسائل سے پُرسوز زمین میں داخل ہو جاتے ہیں تو تقسیم کی تاریخ مختلف قسم کی یادیں ہمارے سامنے لے آتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس ریاستی، پیشہ وارانہ یا تاریخی یادیں ہیں، بچ نکلنے والوں کی یادیں ہیں خواہ وہ مظلوم ہوں یا جارح، یا دونوں ہوں اور وہ یادیں ہیں جو تقسیم کے بعد پیدا ہونے والی نسل کے طور پر ہمیں ورثے میں ملی ہیں۔ انھیں کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ باہم مل کر کام کرتی یا کر سکتی ہیں یا ان کے الگ الگ آہنگ ہوتے ہیں؟ اور کس طرح ہم ان گہری یادوں تک پہنچ سکتے ہیں جو خاموشی کی ابتدائی تہوں سے بہت نیچے پڑی ہوئی ہیں؟ میرے لیے یہ تلاش ابھی شروع ہی ہوئی لیکن ان کہانیوں کی جستجو میں مجھے علم ہوا کہ تحقیق کرنے والے شخص اور تحقیق کے موضوع، دونوں حوالوں سے یادوں کی کھوج کے عمل کو اس کھوج کی اخلاقیات سے ہرگز الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تقسیم کے بارے میں اپنے کام کے دوران میں مَیں اس بات سے مسلسل آگاہ رہی، اور اگرچہ تحقیق، مطالعے اور سوال جواب پر محیط دس سال سے بھی زیادہ عرصے کے اختتام پر میں اس بات کی پہلے سے بھی زیادہ قائل ہوں کہ تقسیم کی یادداشتوں کی کھوج ضروری اور اہم ہے اور میں اس بات کی بھی قائل ہوں کہ یہ ایسی تحقیق نہیں جو تحقیق کرنے والا اس کے اخلاقی جواز کے سوالات کا مسلسل سامنا کیے بغیر کر سکے۔ یہ ایسی تحقیق ہے جس پر تحقیق کرنے والا خود اپنی سرحدیں اور اپنی خاموشیاں نافذ کرتا ہے لیکن آخر میں یہی تحقیق ہمیں آگہی اور مختلف قسم کے علوم تک رسائی فراہم کرتی ہے۔ اور موجود تواریخ کے ذریعے سے پہلے

سے حاصل ہونے والے علم کے ساتھ مل کر، میں سمجھتی ہوں، یہ ہمیں سمجھنے کے ہمارے عمل کے مزید قریب لے جاتی ہے۔

☆☆☆

میں اس کام کا اختتام اس کے آغاز کی طرح دو کہانیوں پر کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی کھوج کے سارے عمل کے دوران میں مَیں نے مجموعی طور پر، نقصان، تشدد اور علیحدگی کی کہانیوں کو دیکھا۔ تاہم ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ ایسی اَن گنت کہانیاں تھیں کہ کس طرح لوگوں نے ایک دوسرے کی مدد کی، دوستی اور اشتراک کی کہانیاں، ایسی کہانیاں جن میں ان سرحدوں کو بار بار عبور کیا گیا جو برطانویوں نے دونوں ملکوں کو الگ الگ کرنے کے لیے قائم کی تھیں، اور وہ کہانیاں جن میں تقسیم کی دہشت اور ہلچل کے نتیجے میں لوگوں کے لیے ایسے مواقع بھی پیدا ہوئے کہ وہ اپنی جانیں دے کر کچھ کر سکیں۔ ایسی دو کہانیاں میں بیان کرنا چاہتی ہوں۔

1989ء میں مجھے معلوم ہوا کہ سرکاری اصطلاحات میں عورتوں کا ایک زمرہ ایسا بھی ہے جسے تقسیم کی بیواؤں کا نام دیا گیا ہے۔ اس وقت دہلی میں قائم شہری حقوق کی ایک تنظیم، ''پیپلز یونین فار ڈیموکریٹک رائٹس'' (پی یو ڈی آر) نے دہلی میں ہونے والی ایک ہڑتال کی تحقیقات کے لیے کچھ لوگوں پر مشتمل، جن میں ایک مَیں بھی تھی، ایک کمیشن قائم کیا تھا۔ ہڑتال غیر معمولی قسم کی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس میں حصہ لینے والی تمام تر عورتیں تھیں بلکہ ہر عورت کی عمر 60، 65 سال سے زیادہ تھی۔ اسی طرح وہ مسئلہ بھی غیر معمولی تھا جس پر ہڑتال کی جا رہی تھی۔ تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ نہیں تھا کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی اصطلاح کے حقیقی مفہوم کے مطابق ملازم نہیں تھی بلکہ اس کی بجائے پنشنوں میں اضافے کا مطالبہ تھا۔ تقسیم کی بیواؤں کے طور پر ان عورتوں کو ریاست نے اپنی مستقل ذمہ داری بنا لیا تھا اور انھیں مختلف قسم کی فنی تربیت اور کام فراہم کرتی تھی تا کہ وہ اپنا گزارہ کر سکیں۔ مقصد یہ تھا کہ تقسیم کے نتیجے میں تنہا رہ جانے والی عورتوں کو کام کرنے کے قابل بنایا جائے تا کہ وہ اقتصادی طور پر خود کفیل ہو سکیں۔ اور انھیں وقار اور اپنی اہمیت کا احساس مل سکے۔ جب تقسیم کی بیواؤں کا یہ گروپ اتنا بوڑھا ہو گیا کہ کام کرنے کے قابل نہ رہا تو انھیں ایک معمولی سی پنشن دے کر ریٹائر کر دیا گیا

اور وہ اسی میں اضافہ کا مطالبہ کر رہی تھیں۔

اضافہ بہت معمولی تھا اور چند روز کے احتجاج کے خاتمہ پر حکومت نے مطلوبہ رقم کی منظوری دے دی۔ اس کی مالیت محض اڑھائی لاکھ روپے سالانہ تھی اور وہ بھی صرف ان برسوں کے لیے جو ان کی زندگی کے باقی رہ گئے تھے۔ لیکن اہم بات ان عورتوں کا اپنے مطالبات حکومت کے سامنے رکھنے کا عزم اور یہ مضبوط عقیدہ تھا کہ یہ ان کا حق ہے۔ ''میں پاکستان سے سارا راستہ چل کر آئی ہوں اور یہاں بھی اپنے مطالبات پورے ہونے تک ہر روز چلنے کے لیے تیار ہوں،'' ایک عورت نے کہا۔ جب کہ دوسری نے وزیر داخلہ کے گھر کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ''یہ ہمارا مائی باپ ہے، ہمارا ماتا پتا ہے اور ہم اپنے مطالبات اس کے سامنے رکھیں گے۔''

ان خواتین کی زندگی میں حکومت کی اس بزرگانہ لیکن بہبودی مداخلت کے بارے میں متعدد سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں، لیکن یہاں میرا یہ ارادہ نہیں۔ میں نے یہ کہانی محض تقسیم کی دہشت اور ہلچل کی ایک کم معلوم حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے بیان کی ہے کہ اس المیے سے، کئی انداز سے بہت سارے لوگوں اور بالخصوص عورتوں کے لیے آزادی کا احساس اور مواقع بھی پیدا ہوئے۔ اگر بیواؤں نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ لیا تھا تو دوسری عورتیں بھی تعلیم، نرسنگ کے پیشوں اور تجارت کے مختلف شعبوں اور بالخصوص سماجی کاموں میں آ گئیں۔ درمیانی درجے کی بہت سی عورتوں کے لیے بالخصوص سماجی کام کیریر کا حقیقی انتخاب اور نئی قوم کی تعمیر کے کام میں خود کو شامل کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ اور جیسا کہ انیس قدوائی کا کیس ہے، اپنے صدمے اور نقصان کے احساس کو ختم کرنے کا وسیلہ بھی۔ مردولا سارا بھائی، کملا بہن پٹیل، پریم وتی تھاپڑ، انیس قدوائی، دمینتی سہگل، ان تمام عورتوں نے جن سے ہم اس کتاب میں ملے ہیں، اپنی زندگیاں نئی قوم، اس کی عورتوں کے لیے اور ان کے ساتھ کام کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ یہ کام مخمصوں سے پاک نہیں تھا: بعض اوقات ریاستی ایجنڈا عورتوں کے مفادات سے متصادم ہوتا۔ لیکن ان سب نے موقع کا بھرپور استعمال کیا۔ تقسیم نے انھیں اپنی زندگیوں سے جن کے ساتھ انھوں نے کام کیا، کچھ بنانے کا موقع فراہم کیا۔

دوسری کہانی جو میں سنانا چاہتی ہوں، (اور جو پاکستان کے اخبار ''نیوز'' میں

شائع ہوئی) ایک مختلف قسم کی حقیقت سے متعلق ہے۔ 1947ء میں چوبیس سالہ اقبال بیگم تقسیم کے دوران میں اپنے بہت سے اہل خانہ سے محروم ہوگئی۔ بہت سے دوسروں کی طرح اسے بھی امرت سر کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں خیر دِکی میں اپنا گھر چھوڑنے اور پاکستان آنے پر مجبور کر دیا گیا۔ تقسیم کے بھیانک سائے ساری عمر اس کے ساتھ رہے۔ بہت برسوں بعد، جب اس کے نواسے نے ایک امن مشن کے ساتھ امرت سر جانے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے اسے نہ جانے کا مشورہ دیا۔ ''امرت سر مت جاؤ،'' اس نے کہا، وہ تمھیں قتل کر دیں گے۔'' لیکن اگر اقبال بانو کے لیے تقسیم تشدد اور نقصان کی کہانیوں سے عبارت تھی تو اس کی بیٹی، کلثوم کا تجربہ اس سے مختلف تھا۔ اس کی شادی بھی امرت سر کے ایک خاندان میں ہوئی تھی۔ اس کا سُسر چوہدری لطیف تقسیم کا مہاجر تھا جو لاہور میں اسلام پورہ (سابقہ کرشن نگر) کے ایک مکان میں آ کر مقیم ہوا تھا۔ جب لطیف 1947ء میں اس وسیع اور شان دار مکان میں آیا تو اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس کا اصل مالک کون ہے۔ ایک دن اسے جالندھر سے ایک خط ملا جس میں محض ''قابض'' سے خطاب کیا گیا تھا۔ لطیف نے اسے کھولا اور پڑھا، یہ اردو میں تھا:

> میں آپ کو بطور انسان یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ محض اس لیے اسے نہیں پھینک دیں گے کہ یہ ایک ہندو نے آپ کو لکھا ہے۔ ہم پہلے انسان ہیں اور بعد میں ہندو اور مسلمان۔ مجھے پورا یقین ہے کہ آپ انسانی رشتوں کے نام پر مجھے اس کا جواب دے کر ممنون کریں گے۔

خط میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ کس طرح اسے لکھنے والے، ہری کرشن داس بیدی کو جو پہلے اس مکان میں رہتا تھا جہاں اب چوہدری لطیف مقیم تھا، تقسیم کے حقیقت بننے پر اچانک اسے خالی کرنا پڑا تھا۔ لاہور کے سناتن دھرم سکول کے استاد بیدی کو اپنی کتابوں اور کاغذات سے زیادہ کسی شے سے محبت نہیں تھی۔ اچانک چلے جانے پر مجبور ہونے کی وجہ سے بیدی اپنی سب چیزیں یہیں چھوڑ گیا تھا، جن میں جیومیٹری پر اس کی زیر تصنیف کتاب کا نامکمل مسودہ بھی تھا جو اس کی میز پر پڑا تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد ستمبر 1947ء میں بیدی پولیس کے ہمراہ مکان میں آیا لیکن اسے وہاں سے کوئی شے اُٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ بعد میں جب چوہدری لطیف وہاں آ گیا تو بیدی نے اسے خط

لکھ کر ساری تفصیل بتائی کہ کہاں کون سی کتاب رکھی ہے اور کہاں کون سے کاغذات۔ سرحد پار سے اس نے اپنی الماریوں، اپنے ٹین کے ٹرنکوں کے نئے مالک کو اپنے قیمتی کاغذات اور کتابوں کو احتیاط سے رکھنے کے لیے کہا تھا۔ ''ان چیزوں کی آپ کو ضرورت نہیں، انھیں کسی تھیلے میں رکھ دیں۔'' ... اپنے بارے میں بہت کم بتاتے ہوئے اس نے لکھا: ''میرے طلبہ میں ہندو، مسلمان اور سکھ شامل تھے اور میری نظر میں وہ سب برابر تھے۔ آپ میرے مسلمان پڑوسی چوہدری سراج سے پوچھ سکتے ہیں کہ فسادات کے دوران میں دینا ناتھ اور میں نے اس کے گھر کی حفاظت کی تھی۔ وہ اس وقت کرشن نگر میں نہیں تھا لیکن ہم نے کسی کو اس کے گھر کو نقصان نہیں پہنچانے دیا۔''

چوہدری لطیف نے بھی احتیاط کے ساتھ بیدی کی ہدایات پر عمل کیا۔ اس نے اس کے تمام کاغذات، کتابیں اور دستاویزات اکٹھی کیں اور ساتھ ہی ان کے چھوٹے چھوٹے پارسل بنا کر جالندھر روانہ کر دیے۔ چوہدری لطیف کے بیٹے نے بتایا کہ کس طرح اس کے باپ نے بیدی کے تمام خطوں کا جواب دیا اور اس سامان کے پارسل بھی جالندھر بھجوا دیے۔ ''اُن کے درمیان خاص قسم کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔'' کئی برسوں تک دونوں سرحد پار سے خط، کتابت کرتے رہے۔ اس کے بہت عرصے بعد جب چوہدری لطیف کا انتقال ہو چکا تھا، اس کی بہو کلثوم کو بیدی کے تمام خطوط اکٹھے بندھے ہوئے ملے اور اس نے انھیں اپنی الماری کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ہری کرشن داس بیدی زندہ ہے یا مر گیا۔ لیکن چوہدری لطیف کے نام اس کے خطوط تقسیم کی تاریخ کے ایک اور پہلو کی جذباتی شہادت فراہم کرتے ہیں۔ لطیف کے نام اپنے دوسرے خط میں بیدی نے لکھا:

> میں نے آپ کا خط بار بار پڑھا اور محسوس کیا کہ اسے کسی سچے دوست نے لکھا ہے۔ میں نے اسے اپنے کئی دوستوں کو بھی پڑھایا ہے۔ ان سب کا کہنا تھا کہ اگر تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات یہی ہوتے جن کا اظہار آپ نے اپنے خط میں کیا ہے، تو یہ خون ریزی کبھی نہ ہوتی اور ہم بھارت اور پاکستان میں رہتے ہوئے اپنے ممالک کو بام عروج پر لے جاتے۔ لیکن خدا کی کچھ دوسری مرضی تھی۔ میں یہ سوچ کر لرز جاتا ہوں کہ

ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے ساتھی ہم وطنوں کے ساتھ کیا کیا... اور اس کا بدترین پہلو یہ ہے کہ یہ سب مذہب کے نام پر کیا گیا۔ کوئی مذہب ایسی خون ریزی کی اجازت نہیں دیتا۔

بیدی کی اُمیدیں پوری ہوئی ہوں یا نہیں، اس کے اور چوہدری لطیف کے درمیان ہونے والی خط، کتابت اس حقیقت کی گواہی کے طور پر برقرار رہے گی کہ سرحدیں عبور کی جا سکتی ہیں اور دوستی بنائی جا سکتی ہے۔ جب کبھی ـــــ اور اگر ـــــ میں تقسیم کے موضوع کی طرف واپس آ گئی تو میں اسی پہلو کا جائزہ لوں گی۔



MashalBooks.com